ڈاکٹر محمد یونس بٹ

بٹ صورتیاں



بٹ صورتیاں

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

۲۰۰۲ء

- حضرت بابا خند بخش

سید ضمیر جعفری اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں۔ اتنے بڑے کہ انہیں پورا دیکھنے میں اتنی ہی دیر لگتی ہے جتنی پورا اردو مزاح پڑھنے میں۔ اتنا بھولا سا چہرہ کہ ایک بار دیکھ لو تو بھولا نہ جا سکے۔ چہرہ چاند سا نہیں، پر چہرے کے اوپر چاند سا ہے۔ کہتے ہیں اس کے چہرے پر بچپن کھیلتا ہے۔ میں بھی مانتا ہوں اتنے بڑے چہرے پر بچپن کیا پورا بچہ کھیل سکتا ہے۔ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ داڑھی کے سر سے موچھوں کا سایہ اٹھ گیا۔ کچھ کہتے ہیں پہلے موچھوں کے پاؤں تلے سے داڑھی نکلی تھی۔ بہرحال اتنے بڑے چہرے پر روزانہ شیو کرنے کے لئے بندے کا جذبہ جہاد سے سرشار ہونا ضروری ہے۔

ان کی پیدائش سے قبل ضلع جہلم میں ان کے خاندان کا ادب میں بڑا مقام تھا، یعنی سارا علاقہ ادب کرتا۔ سید ضمیر جعفری نے وہ کام کیا جو آج تک کوئی اور ادیب، شاعر نہ کر سکا اور وہ کام اس گھرانے میں پیدا ہونا تھا۔ گھر کا ماحول اتنا اچھا کہ بچے کا بڑے ہو کر شاعر ادیب بننے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا، بچپن ہی سے اس قدر تیز تھے کہ اپنے بھائی سے دو سال بعد پیدا ہوئے مگر اس سے پہلے کہ بڑا بھائی پانچ سال کا ہوتا یہ سات سال کے ہو گئے۔ اور سکول سے اس کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا۔ نصابی کتب کی قیمتوں کی وجہ سے انہیں ادیب بننے میں بڑی مدد ملی کیونکہ جو نصابی کتابیں گھر والے خرید کر دیتے یہ انہیں بیچ کر ادبی رسالے خرید لیتے۔

کہتے ہیں مہدی حسن کے گلے میں بھگوان بولتا ہے، وہ گاتے وقت جو منہ بناتا ہے اس

سے واقعی لگتا ہے کہ اس کے گلے میں کوئی ہے مگر ضمیر جعفری کے گلے میں پورا پاکستان بولتا ہے۔ اتنی بھاری آواز کہ کوئی کمزور شاعرتو اٹھا ہی نہیں سکتا۔ ڈیل ڈول ایسا کہ لوگ ان سے گفتگو کرتے ہوئے بھی ان کے بارے میں جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ جا رہے ہوں تو لگتا ہے "میٹرنٹی لیو" پر جا رہے ہیں۔ خود ایک قدم اٹھاتے ہیں تو پیٹ دو قدم۔ اس لئے تھوڑا سا بھی چلیں تو پیٹ تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ چلتے ہوئے لگتا ہے پیٹ کا تعاقب کر رہے ہیں۔ سانس لینے کے لئے روزانہ پیٹ کو اتنا ہی آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے' جتنا ایک شادی شدہ کو سانس لینے کے لئے بیوی کے آگے پیچھے ہونا پڑتا ہے۔ وہ جہاں قدم رکھیں سب احتراماً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں انسان تو انسان وہ تو تانگے پر قدم رکھیں تو آگے سے گھوڑا اٹھ جاتا ہے۔ شخصیت ایسی کہ لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ وہ تو سانس ہی کھینچ لیں تو دو تین شاعر کھنچے چلے آئیں گے۔ کرسی پر بیٹھ جائیں تو ساتھ کرسی بھی بیٹھ جاتی ہے۔ یہی نہیں وہ تو کرسی سے اٹھیں تو کرسی ساتھ اٹھتی ہے۔ وہ خود بھی آدھی سیڑھیوں میں ہوتے ہیں' سانس پورا چڑھ چکا ہوتا ہے۔

اس عمر میں ہیں جس میں بندہ اظہار محبت بھی کرے تو لگتا ہے عیادت کر رہا ہے۔ شاید اسی لئے انہوں نے ستر سال کا ہونے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ کبھی ستر سال کے نہ ہوں گے۔

ہمارے بیشتر مزاح نگار ایسے ہیں کہ ان کی تحریروں سے مزا لینے کے لئے ضروری ہے کہ بندہ پڑھا لکھا نہ ہو' مگر ضمیر جعفری کی تحریروں سے مزا لینے کے لئے صرف یہ ضروری ہے کہ بندہ ہو۔ ان کے فقروں سے تین سال کا لڑکا بھی اتنا ہی محظوظ ہو سکتا ہے' بشرطیکہ وہ شادی شدہ ہو۔ جس طرح ان کے قلم نے پنجابی اور اردو کو گلے ملایا ہے اس طرح تو کسی فلم نے ہیرو' ہیروئن کو نہیں ملایا۔

ان کی طبیعت میں بڑا انکسار ہے۔ ظاہر ہے جتنی بڑی طبیعت ہو گی اتنا بڑا انکسار ہو گا۔ کسی دشمن میں اتنا حوصلہ نہیں کہ ان کا بال بیکا کر سکے' ویسے بھی اس کے لئے کسی

دشمن کے حوصلے سے کہیں زیادہ ضروری بالوں کا ہونا ہے' اسی لئے میرا دوست "ف" کہتا ہے "پیرو مرشد سید ضمیر جعفری کے معجزات میں سے ایک یہ بھی کہ بھری برسات سے گزر جائیں اور سر کے بال گیلے نہ ہوں۔"

جو کچھ ملے' کھا لیتے ہیں' جو کچھ نہ ملے تو اور کچھ کھا لیتے ہیں۔ غصہ نہیں کھاتے کہ بندہ اتنا غصہ نہیں کھاتا جتنا غصہ بندے کو کھاتا ہے۔ کوئی بات پیٹ میں نہیں رکھتے حالانکہ وہ چاہیں تو بات سمیت بات کرنے والے کو پیٹ میں رکھ سکتے ہیں۔

فوجی آدمی ہیں اس لئے کوئی مشکل مقام آئے تو آنکھیں بند کر کے ڈٹ جائیں گے' البتہ آسان مقام ہو تو بڑا سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں گے۔

وہ فوج میں اس لئے گئے کہ شروع ہی سے جنگ کے خلاف تھے۔

محفلوں میں اپنی گفتگو کی وجہ سے پسند کئے جاتے ہیں۔ مجھے بھی محفلوں میں گفتگو کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے'جی ہاں! محفلوں میں ' میں بڑے اچھے طریقے سے گفتگو سنتا ہوں۔

دس آدمی بھی نصیحت کے لئے کہیں تو حضرت بابا خند بخش نصیحت نہیں کریں گے کہ انہیں پتہ ہے جب آدمی نصیحت کے لئے کہہ رہے ہوں تو ان میں سے نو تو آپ سے مذاق کر رہے ہوتے ہیں اور دسواں سن ہی نہیں رہا ہوتا۔ یوں بھی نصیحت کرنے سے بندہ بوڑھا ہو جاتا ہے اور انہوں نے بوڑھا ہونے سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی ہے۔

کسی لفظ کاغلط تلفظ نہیں کیا۔ اگر کسی لفظ کا یہ تلفظ ادا کیا تو وہ لفظ ہے غلط! انہیں زبان پر گرفت ہے اور زبان پر گرفت اس شاعر کی ہوتی ہے جسے کوئی ایک شعر سنانے کے لئے کہے تو وہ ایک شعر ہی سنائے۔

ساری زندگی شہر میں اس لئے گزاری کہ گاؤں سے شدید محبت ہے۔ تنہائی اچھی لگتی ہے' اس لئے ہر وقت ہنگامہ و ہجوم میں رہتے ہیں تاکہ تنہائی اچھی لگتی رہے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ سید ضمیر جعفری کو ملنے کے بعد آپ کی زندگی میں سالوں کا اضافہ ہو گا' لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان سالوں میں زندگی کا اضافہ ضروری ہو گا۔ یہاں سالوں سے مراد وہ نہیں جو شادی شدہ سوچ رہے ہیں۔ ویسے بندہ انہیں ایک

بار مل لے تو اس میں ایک سہ ماہی کے لئے شوہر رہنے کا حوصلہ آ جاتا ہے۔ صدیق سالک نے کہا تھا "جہاں ضمیر جعفری آ جائیں وہاں اداسی نہیں آ سکتی" یہاں نہ آنے کی وجہ اداسی کا مونث ہونا نہیں، اس لئے ہے کہ جب وہ آ جائیں تو اداسی ہی کیا، کنیوں کے لئے جگہ نہیں بچتی۔ مجھے تو لگتا ہے ایک وقت آئے گا جب سائیکاٹرسٹ اداسی اور مایوسی کے مریضوں کے لئے یہ نسخہ لکھا کریں گے "سید ضمیر جعفری ------- صبح، دوپہر، شام!"

○ ◯ ○

• ڈاکٹر قریب العزت

نام تو اس کا خادم حسین تھا مگر جب بھی ملتا یہی کہتا کہ آپ کا بھائی عنقریب عزت حاصل کرنے والا ہے۔ یوں پورے ہوسٹل میں وہ ڈاکٹر قریب العزت کے نام سے جانا جانے لگا۔ اس کے سر پر رومال ایسے ہی تھا جیسے آپ کے سر پر بال' اگر ہیں تو! رومال اس کے لباس کا نہیں' جسم کا حصہ تھا۔ اسی لئے جب پریشان ہوتا' رومال کا رنگ اڑا ہوتا۔ کوئی احتراماً ایک بار "سر" کہتا تو جواب دینے سے پہلے رومال درست کرتا۔ اگر کوئی دوسری بار کہتا تو کہنے والے کو درست کرتا۔ بقول "ف" اس کے شناختی کارڈ پر بھی شناختی نشان کے طور پر رومال درج تھا۔ کسی جنازے پر جاتا تو سیاہ رومال اوڑھتا' البتہ کسی لڑکی کو ملنے جاتا تو گلابی رومال سے سرپوشی کرتا۔ امتحان کے دنوں میں سیاہ رومال ہی سے کام چلاتا۔ ایک بار گلابی رومال تانے جا رہا تھا کہ کسی نے شرارتاً رومال اتار دیا۔ یوں لگا جیسے کسی نے بھرے بازار میں کسی لڑکی کے سر سے دوپٹہ اتار دیا ہو۔ اتنی مار کٹائی ہوئی کہ اتارنے والوں کے سروں پر گلابی رومال سے تن گئے۔ بات بڑھی تو پرنسپل نے سب کے والدین کو بلایا' جب اندر گیا تو پرنسپل نے اسے اس کا والد سمجھ کر شکایتیں کیں۔ میں نے کہا "تم نے اپنی صفائی کیوں پیش نہ کی" کہنے لگا۔ "اگر اس وقت میں اپنا والد نہ ہوتا تو پرنسپل کو کھری کھری سناتا" کہتا "میرا والد ہو بہو میرے جیسا لگتا' سو آخری دنوں میں والدہ کی نظر کمزور ہوئی تو میں نے عینک لگوائی۔"

کہتا "ہمارے گھرانے میں اس قدر پردہ ہے کہ کوئی لڑکی اور بزرگ ننگے سر باہر نہیں نکل سکتا۔ میری والدہ تک میرے والد سے پردہ کرتیں۔ والد ہر اس گھر کو جس میں داخل ہوتے ہی خاتون خانہ پردہ کر لیتی اپنا ہی گھر سمجھتا۔ اس لئے دوسروں کے گھر اس وقت تک داخل نہ ہوتا جب تک کسی خاتون کو بے پردہ نہ دیکھ لیتا۔

ڈاکٹر قریب العزت ہوسٹل سے گھر تب جاتا جب کسی قریبی کا انتقال ہوتا یا کسی کا انتقال قریب ہوتا۔ اسی لئے وہ جب بھی بیگ لے کر کمرے سے نکلتا' پورا ہوسٹل تعزیت کے لئے اکٹھا ہو جاتا۔ ایک بار گھر گیا تو کسی نے اس کے انتقال پر ملال کا نوٹس لگا دیا۔ آج تک قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا ہے کہ یہ کسی کی شرارت تھی' اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

کمرے میں صرف سونے کے لئے جاتا' اس لئے امتحان کے دنوں میں سارا سارا دن کمرے ہی میں رہتا۔ کہتا "میں بڑی کوشش سے تھرڈ کلاس (جب سے وہ تھرڈ ایئر میں آیا لڑکے بھی اس کلاس کو یہی کہنے لگے) میں آیا۔ ٹھیک ہی کہتا ہے وہ استادوں کی بڑی کوشش سے تھرڈ ایئر میں آیا۔ اس کے خیال میں میڈیکل عجیب پروفیشن ہے کہ آپ دن رات اس وجہ کو ختم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں' جس کی وجہ سے یہ پروفیشن ہے۔ اکثر کہتا "میں نے جوں جوں جدید طریقہ علاج کا مطالعہ کیا ہے' میرا یہ یقین پختہ ہو گیا ہے کہ شفا خدا کے ہاتھ میں ہے۔" اس کے نزدیک ڈاکٹر کو مسیحا اس لئے کہتے ہیں کہ آج کل لوگ ڈاکٹر کے پاس مریض کو اس وقت لاتے ہیں' جس وقت اور حالت میں آج سے انیس سو سال پہلے حضرت مسیح کے پاس لے کر جاتے۔

بیمار کے مرض کی تشخیص تو ہر ڈاکٹر کر سکتا ہے' مگر وہ تندرست کے مرض کی تشخیص ایک نظر میں کر لیتا۔ میرے ساتھ کسی خوبصورت لڑکی کو ایک بار دیکھ لیتا تو فوراً اس کی آنکھوں کے لئے دوائی تجویز کرتا۔ دوسری بار دیکھتا تو دماغ کی اور اگر میرے ساتھ تیسری بار اسے وہ خوبصورت نظر آتی تو اپنی آنکھوں کے لئے دوا تجویز کرتا۔ اس کے نزدیک فلو کی دوائی کھاؤ تو بندہ ایک ہفتے میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اگر نہ کھاؤ تو ٹھیک ہوتے ہوتے سات دن لگ جاتے ہیں۔ کہتا ہے "شراب دنیا کا واحد محلل ہے جس میں شرافت بھی حل ہو جاتی ہے۔" ایک دن میرا لکھا ہوا نسخہ دیکھ کر کہنے لگا "بھئی! بچگانہ نسخہ ہے یعنی اتنا صاف کہ بچہ بھی پڑھ سکتا ہے' حالانکہ اصل ڈاکٹر وہ ہوتا

ہے جس کی تحریر صرف میڈیکل سٹور والا پڑھ سکے۔" کہتا "بہترین دوائی ڈاکٹر ہوتا ہے" شاید اسی لئے اسے دیکھ کر بچوں کے چہرے پر وہی تاثرات ہوتے ہیں جو دوائی دیکھ کر

ہوتے ہیں۔

جب سے اس نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے مرمریں گنبد دیکھے پھر اس نے کبھی اسے کنگ ایڈورڈ نہ کہا' ہمیشہ کوئین ایڈورڈ کہتا۔ دیکھنے میں یہ کالج گورستان یعنی گوروں کا دیس لگتا ہے۔ اناٹومی ڈیپارٹمنٹ ایسا ہے کہ اندر مردے نہ ہوں پھر بھی لگتا ہے کہ ہیں۔ کالج میں مخلوط تعلیم ہی نہیں مخلوط طالب علم بھی ہیں۔ کہتا ہے سارے ملک سے یہاں ذہین طالب علم اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہ صرف وہ اپنے آپ کو ذہین ثابت کرنے کے لئے کہتا ہے ورنہ اسے پتا تھا کہ ذہین آدمی مشکل ہی سے اکٹھے ہوتے ہیں اور جو اکٹھے ہوتے وہ مشکل سے ہی ذہین ہوتے ہیں۔

لڑکی گزرتی دیکھ کر تو گزر ہی جاتا' مگر کہتا میں نے وہ کام بچپن میں ہی کر لیے ہیں جو آپ آج کل کر رہے ہیں' یعنی بچپن میں لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتا۔ ڈاکٹر قریب العزت دنیا کے ہر موضوع پر بلا تھکان بول سکتا ہے' مگر سن کسی موضوع پر نہیں سکتا۔ "ہالی وڈ کی اداکارائیں کچھ پہن لیں تو ننگی لگنے لگتی ہیں' لیکن ہماری ہیروئنیں اس قدر موٹی ہیں کہ کچھ بھی نہ پہنیں تو پھر بھی ننگی نہیں لگتیں۔"

پہلے لڑکی کو دیکھتے ہی انگریزی پر آ جاتا اور اسی پر رہ جاتا۔ کہتا "میں نے جب بھی کسی کلاس فیلو لڑکی سے اظہار محبت کیا' اس نے حوصلہ افزائی کی" حالانکہ یہ بات تھی کہ جب یہ مدعا بیان کرتا تو اس کی محدود انگریزی اور لامحدود انگریزی کی وجہ سے لڑکی یہ سمجھتی کہ لیکچر میں کوئی پوائنٹ سمجھ میں نہیں آیا' وہ پوچھ رہا ہے۔ جب وہ پوائنٹ واضح کرتی تو ڈاکٹر قریب العزت سمجھتا کہ وہ سلجھے ہوئے انداز میں اظہار محبت کر رہی ہے۔ لیکن پھر اس نے انگریزی میں لکھنا اور بولنا بند کر دیا۔ البتہ دستخط انگریزی ہی میں کرتا کہ کہیں دوسرے یہ نہیں سمجھیں کہ اسے انگریزی نہیں آتی۔ کہتا "میں

کسی سے غیروں کی زبان میں بات کیوں کروں" اس لئے جہاں دوسرے انگریزی میں ہائے! کہتے یہ اردو میں ہائے! کہتا۔ اس قدر شرمیلا کہ کسی اور کے سامنے عورت کا ایکس رے نہ دیکھتا' تنہائی میں دیکھا کرتا۔ وہ ایکس رے دیکھ کر بتا دیتا کہ لڑکی کنواری ہے یا شادی شدہ۔ اس کے نزدیک شادی شدہ کے جبڑوں کی ہڈیاں زیادہ گھسی ہوتی ہیں۔

وہ روز کپڑے بدلتا اور میلے کچیلے کپڑے اتار کر ایک ڈرم میں ڈال دیتا۔ جب یہ ڈرم بھر جاتا تو اسے الٹا کر پھر سے وہی کپڑے دوبارہ پہننے لگتا۔ کپڑے ہی نہیں روز جوتے بھی بدلتا جس کے لئے اسے مسجد جانا پڑتا۔ نظر کی عینک اس وقت لگاتا جب صبح نہانے کے لئے صابن دانی سے صابن تلاش کرنا ہوتا۔

ڈاکٹروں کی بے روز گاری کی وجہ سے کہتا کہ میرے حالات اجازت نہیں دیتے کہ میں بے روزگار رہوں ۔ سو آج تک بے روزگار نہ بنا' یعنی ڈاکٹر نہ بنا۔ گھر صرف مہینے میں ایک بار تنخواہ لینے جاتا۔ اس کے والد نے بھی کبھی ملازمت نہ کی۔ وہ ملازم کو ملزم کی جمع سمجھتے۔ والدہ غیر شرعی عورت ہونے کی وجہ سے والد کی شعر انگیزیوں کو برداشت کر لیتی۔ ڈاکٹر قریب العزت والدہ سے اس قدر محبت کرتا کہ اگر کوئی مرد اسے بیٹا کہہ دیتا تو مرنے پر اتر آتا۔ ماں جب کام کہتی تو جوتا اتار کر دو زانو ہو کر اس کی بات سنتا اور اس وقت تک یونہی بیٹھا رہتا جب تک وہ خود وہ کچھ نہ اتار لیتی جو اتار کر یہ بیٹھا ہوتا۔

ایک دن کہنے لگا۔ "مجھے کہا جائے کہ تمہیں پاکستان کی بادشاہی چاہیے یا برطانیہ کی' تو میں جھٹ سے کہوں گا بچپن کی" یہ بچہ ہوسٹل میں آ کر بچا نہ رہا۔ ویسے بھی بندہ ہوسٹل میں ایک ماہ رہے تو اسے ہر عورت خوبصورت لگنے لگتی ہے اور ایک سال رہے تو ہر خوبصورت چیز عورت لگنے لگتی ہے۔ ایک روز ہوسٹل گیٹ کے پاس ایک کار سے جا ٹکرایا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اور کار والا ایک ہی جگہ دیکھ رہے تھے۔ یعنی فٹ پاتھ پر بلیو کپڑوں میں ملبوس ایک دوشیزہ جو یوں چل رہی تھی جیسے اس کے کپڑے

کے رنگ کی فلم چل رہی ہو۔ دھماکا ہوا' ڈاکٹر قریب العزت اپنی عزت یعنی رومال سے دور جا گرا۔ لڑکے بھاگے کہ ڈاکٹر موصوف کو اٹھائیں۔ لڑکوں کو دیکھ کر اس کا رنگ پیلا پڑنے لگا۔ نیم بے ہوشی میں جیسے تیسے "کرکے اٹھا" رومال سر پر یوں فکس تھا' لگتا کسی درزی نے نہیں نائی نے بنایا ہے۔

وہ جب ہوسٹل میں آیا تھا تو بات بات پر گالی دیتا۔ ہوسٹل میں رہ کر البتہ یہ تبدیلی آ گئی کہ اب بے بات گالی دینے لگا۔ گلوکاری بھی سیکھ لی کہ ہوسٹل میں جسے گانا نہ آئے وہ نہا نہیں سکتا' کیونکہ غسل خانوں کی کنڈیاں تو ہوتی نہیں اس لئے گاتے رہنا پڑتا ہے تاکہ دوسروں کو پتا چلتا رہے کہ اندر کوئی ہے۔ یہی نہیں ہوسٹل کے تو پنکھے بھی بجلی سے نہیں چلتے' ہوا سے چلتے ہیں۔ کہتا "ہمارے بزرگ نبی تھے" واقعی اس کا شجرہ نسب دو ڈیڑھ لاکھ سال قبل اللہ کے نبی حضرت آدم علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔

ہوسٹل میں ہمیشہ لڑکے اس کی چاروں طرف ہوتے۔ دور سے یوں لگتا جیسے کاندھا دے کر لا رہے ہوں۔ کسی لڑکی کو ڈبل کراس کرنا تو دور کی بات کبھی کراس تک نہ کیا۔ جہاں لڑکی دیکھی اس کے پیچھے نیت باندھ لی۔

پچھلے دنوں اس کی ممانی کو میر تقی میر پسند کرنے پر طلاق ہو گئی۔ وجہ پوچھی تو بولا "ہمارے ہاں تو غیر مرد کو پسند کرنے پر قتل ہو جاتے ہیں' طلاق تو کچھ بھی نہیں۔" میں نے کہا "تم تو کہتے تھے' تمہارے خاندان والوں کو علم و فضل سے بہت لگاؤ ہے۔" بولا "ہاں اتنا لگاؤ ہے کہ جس دن علم و فضل میں سے کوئی چھٹی پر ہو' میرے دادا تو کسی اور نوکر سے حقے کی چلم نہیں بھرواتے۔"

سات ماہ قبل اس کے والد کے پھر مرنے کی اطلاع ملی تو میں نے پوچھا "وہ تو ابھی پچھلے مہینے مرے تھے؟" کہنے لگا پچھلے مہینے مرے تو تھے مگر ہمسائی پر! وہ حریصہ اور ہریسہ پر جان چھڑکتے تھے مگر اس بار عورت کے بجائے اللہ کو پیارے ہوئے ہیں۔"
اس کے نزدیک صبح اٹھنا فضول خرچی میں شمار ہوتا۔ سو اس وقت اٹھتا جب دوپہر کا کھانا

کھانا ہوتا۔ کہتا "ناشتے کے پیسے بچتے ہیں۔" کنٹین پر روزانہ ایک سیٹ چائے کا آرڈر دے کر آتا مگر کبھی اس کے کمرے میں چائے نہ پہنچی' جس پر وہ ہر ماہ کینٹین والوں کا شکریہ ادا کرتا کہ ان کے تعاون نہ کرنے سے اسے تین سو روپیہ ماہوار بچت ہوتی ہے۔

مخلوط تعلیم کے بارے میں کہتا "اب تو گلی گلی میرج سنٹر کھل گئے ہیں' اس لئے اب مخلوط تعلیم کی ضرورت نہیں رہی" کہتا "ایف اے کرنے سے انسان اچھا آدمی بن جاتا ہے' بی اے کرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ اچھا آدمی بننے کا کوئی فائدہ نہیں اور ایم اے کرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ ایم اے کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ڈگریاں دراصل تعلیمی اخراجات کی رسیدیں ہیں۔"

عمارت کو گنبدوں سے دیکھنا شروع کرتا' عورت کو بھی ایسے ہی دیکھتا۔ پاکستان میں منصوبہ بندی والوں کی ناکامی کو اپنی کامیابی سمجھتا' کیونکہ والدین کی گیارھویں اولاد تھا۔ کہتا "منصوبہ بندی کامیاب ہو سکتی تھی مگر اس وقت شروع کی جاتی جب یہ منصوبہ بندی والے ابھی خود پیدا نہیں ہوئے تھے۔" کہتا "اب تو سب کچھ بدل گیا ہے اور تو اور ہوسٹل سے کالج کا فاصلہ وہ نہیں رہا جو دس سال پہلے تھا۔۔۔ بڑھ گیا ہے۔"

ہربرٹ ہارڈ کہتا ہے "میں تمہیں کامیاب ہونے کا کوئی فارمولا نہیں بتا سکتا' البتہ ناکامی کا بتا دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہر کسی کو خوش کرنے کی کوشش کرو۔" ڈاکٹر قریب العزت نے بھی یہی کام کیا۔ ٹیلی فون ہوسٹل کی مقبول اور مصروف ترین ان ڈور گیم ہے۔ اسی لئے وارڈن کا حکم تھا کہ کوئی طالب علم اپنی ذاتی کال پر پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہ لگائے۔ سو طلبہ جب تک رانگ نمبر نہ ہوتا' زیادہ دیر نہ لگاتے۔ لیکن ڈاکٹر قریب العزت کو کبھی کسی نے فون سنتے نہ دیکھا تھا۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا کہ پتا چلا' ڈاکٹر قریب العزت فون سن رہا ہے۔ خبر ملتے ہی لڑکوں کی ٹولی فوراً اسے مبارکباد دینے ٹیلی فون بوتھ پر پہنچی تو وہاں جو شخص ٹیلی فون سن رہا تھا اسے

کوئی پہچان نہ سکا' کیونکہ آج تک کسی نے اسے ننگے سر نہ دیکھا تھا۔ اس کا سر ہمیشہ کے لئے ننگا ہو گیا تھا' اس کی والدہ ہاسپٹل میں انتقال کر گئی تھی۔ اسی روز وہ بھی ہوسٹل سے انتقال کر گیا۔ جاتے ہوئے اس کے سر پر رومال نہ تھا' مگر کوئی اس کا ننگا سر نہ دیکھ سکا' کیونکہ ہر دیکھنے والی آنکھ پر آنسوؤں کا رومال سا تنا ہوا تھا۔

ooo

• پروفیسر عجیب و امیر

شاعروں سے ہمیں ایک شکایت تو یہ ہے کہ وہ بڑے عجیب ہوتے ہیں اور یہی نہیں اس سے بڑھ کر یہ کہ ساتھ غریب بھی ہوتے ہیں' یاد رہے یہاں غریب کا تصور وہ نہیں جو "تیلی" عرب ممالک میں ہیں' وہاں غریب وہ کہلاتا ہے جس کے پاس ایک ہی گھر ایک ہی گاڑی اور ایک ہی بیوی ہو۔ بہرحال پروفیسر ڈاکٹر زاہد امیر صاحب ہمارے پہلے عجیب و امیر شاعر ہیں۔ جیسے اجمل نیازی صاحب کے چہرے پر ایسا صوفی پن (Pun) ہے کہ وہ پلے بوائے بھی پڑھ رہے ہوں تو لگتاہے کہ گرو گرنتھ پڑھ رہے ہیں۔ طاہر اسلم گورا صاحب ہمارے بڑے خوبصورت افسانہ نگار ہیں جسے اعتبار نہ آئے وہ دوسرے افسانہ نگاروں کی تصویریں دیکھ لے۔ ایسے ہی ڈاکٹر زاہد امیر صاحب کے چہرے پر اتنی ڈاکٹری ہے کہ وہ شاعری بھی سنا رہے ہوں تو یہی لگتا ہے اردو میں کسی بیماری پر لیکچر دے رہے ہیں۔ شاعری ان کی پسندیدہ ان ڈور گیم ہے۔ ہمارے ایک شاعر دوست اشرف جاوید بڑے توانا شاعر ہیں یقین نہ آئے تو ان کی کشتی دیکھ لیں ویسے کشتی اور شاعری میں یہی فرق ہے کہ کشتی میں لڑنے والا اپنے کپڑے خود اتارتا ہے۔ شادی کے ایک سال بعد بیوی بیمار ہوئی تو کشتی کی بجائے بیڈ مینٹن کھیلنے لگے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ واحد کھیل ہے جس کے شروع میں بیڈ آتا ہے۔ شرع اورشاعری میں کیا شرم۔ ڈاکٹر زاہد امیر جس تیزی سے شاعری کررہے ہیں اس تیزی سے شاعری ہی کی جاسکتی ہے' کوئی اور کام نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہم شاعر نہیں مگر ان کی شاعری پررائے دے سکتے ہیں کیونکہ ایک نقاد کے بقول: ٹھیک ہے میں نے کبھی انڈا نہیں دیا مگر میرے سامنے آملیٹ ہو تو مرغی سے بہتر رائے دے سکتا ہوں۔ بچپن میں گھر کی دیواروں پر شعر لکھ دیا کرتے جسے سال بعد سفیدی کرنے والا مٹا دیا کرتا اس کے قبل

ہم اردو ادب میں سفیدی کرنے والے کے مقام و مرتبے سے آگاہ نہ تھے۔ رقص اعضاء کی شاعری ہے شاید رقص کو شاعری کے خانے میں اس لیے شامل کیا گیا ہو کہ رقص میں بھی سر سے زیادہ پاؤں کا استعمال ہوتا ہے۔ ان کا دماغ ہر وقت شاعری کے لیے چلتا رہتا ہے صرف اس وقت نہیں چلتا جب وہ شاعری کر رہے ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے ٹی وی پروڈیوسرز حضرات جب صبح اٹھتے ہیں تو ان کا دماغ چلنا شروع ہوتا ہے اور اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک وہ ٹی وی اسٹیشن کے اندر داخل نہیں ہو جاتے۔

ڈاکٹر صاحب بڑے پرفیکشنسٹ ہوتے ہیں ہمارے ایک استاد پروفیسر ڈاکٹر جو ابھی "حیات" ہیں خدا انہیں "منور" رکھے۔ انہوں نے اپنی لیڈی سیکرٹری کو نکال دیا تھا کہ اسے کچھ آتا نہیں سوائے "ٹائپنگ' ڈرافٹنگ اور شارٹ ہینڈ کے۔" اسی لیے شعبہ طب کے لوگ دوسرے شعبوں میں شعبدہ بازی دکھا رہے ہیں اس سے لگتا ہے کہ ایک دن محکمہ ڈاک کی فوری اور محفوظ ڈیلوری کے لیے گائناکالوجسٹ رکھ لے گا۔ ہم خود ڈاکٹر ہیں مگر ایسے کہ اگر کوئی جاننے والا کس بڑی بوڑھی کے لیے ہمارے پاس دوائی لینے آئے تو ہمیں یقین ہوجاتا ہے کہ یہ اس کی ساس ہے۔ لیکن ڈاکٹر زاہد امیر صاحب اپنے فیلڈ کے اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں کہ ای این ٹی کے ڈاکٹرز بھی ان کا نام سنتے ہی اپنے کانوں کو ان کا ہاتھ لگواتے ہیں۔ وہ ماہر امراض کان' ناک اور گلہ ہیں۔ کان گلہ تک بات ٹھیک تھی ناک والی بات خطرناک ہے۔ ہمارے ایک معروف آئی سرجن نے ایک مصور کا علاج کیا۔ مصور نے ایک تقریب میں خوش ہو کر آئی سرجن کو ایک تصویر دی۔ تصویر میں ایک بڑی سی آنکھ میں آئی سرجن کی تصویر بنائی ہوئی تھی۔ تقریب میں مہمان خصوصی پروفیسر خواجہ صادق حسین تھے۔ انہوں نے تصویر دیکھ کر آئی سرجن سے کہا اس پر خوش ہونے کی بجائے تمہیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ تم گائناکالوجسٹ نہیں تھے۔

جہاں تک گلے کی بات ہے ڈاکٹر صاحب کئی گلوں کے گلوں میں راگ رنگ بھر رہے ہیں ان کے پاس کوئی گلوکار آئے کہ میرے گلے کے لیے کچھ دیں تو یہ فوراً غزل لکھ دیتے ہیں کہ صبح نہار منہ غزل سے غرارے کرنا' افاقہ ہو گا۔ گلوکاری کا ہمیں تو

اتنا ہی پتہ ہے کہ جو بات دوسرے کو کہتے ہوئے شرم آئے اسے گا دو۔ اردو ادب میں گلے کے زور پر کئی شاعرات ہوئیں گوہر بائی بھی گلے کے زور پر شاعرہ کہلائی یہ تو بعد میں عورتوں میں بند گلے کا ڈیزائن رواج پایا۔ پھر بھی آج کل خوبصورت شاعری وہ شاعری ہے جسے کوئی خوبصورت کرے۔ ایک شاعرہ نے کہا' لگتا ہے کہ اب میں بڑی موٹی اور بھدی ہو گئی ہوں۔ پوچھا "آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟" کہا "اب نقاد میرے شعروں میں وزن کی غلطیاں نکالنے لگے ہیں۔" پروفیسر صاحب شاعری کو کام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس پر ہمیں عتراض نہیں مسئلہ یہ ہے کہ وہ جب کام شروع کرتے ہیں تو پھر کام تمام کرکے چھوڑتے ہیں۔

رنگ ایسا کہ موٹے ہوتے تو اپنی ذات میں "انجمن" ہوتے۔ گفتگو میں اکثر اٹک جاتے ہیں ہم تو ٹرین پر اٹک جاتے ہیں۔ کار اس قدر احتیاط سے چلاتے ہیں کہ ٹریفک کانسٹیبل کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہوگا۔ طبیعت میں اس قدر حلیمی کہ رستہ بھی مانگ رہے ہوں تو لگتا ہے رشتہ مانگ رہے ہیں۔ کسی پر احسان کریں تو بتاتے ہوئے شرماتے ہیں جیسے انھوں نے احسان نہیں کیا احسان نے کچھ کیا ہے؟ غصہ اور تھوک تھوکتے نہیں۔ کوئی دوست پریشانی میں فون کرے تو کہیں گے' مجھے آیا سمجھیں۔ سنا ہے ان کے بچے انہیں آیا سمجھتے بھی ہیں۔ ہر کام محنت سے کرتے ہیں آرام بھی کر رہے ہوں تو لگتا ہے محنت کر رہے ہیں۔ پوچھا طلب علمی میں کبھی کلاس میں لیٹ گئے؟" کہا "ہمارے زمانے میں کلاس میں طلبہ آپ کی طرح لیٹ نہ جاتے تھے' بیٹھے رہتے تھے۔" موصوف امتحان کے دنوں میں نہانا اور کمرے سے نکلنا بند کر دیتے یوں طلبہ انہیں سونگھ کر اندازہ لگا لیتے کہ امتحان میں کتنے دن رہ گئے ہیں۔ ان دنوں پروفیسر صاحب صفائی کا اس قدر خیال رکھتے کہ تولیے سے منہ تک نہ پونچھتے کہ کہیں تولیہ میلا نہ ہو جائے۔ چارپائی پر بیٹھے رہتے جب تک چارپائی نہ بیٹھ جاتی۔ فائنل کے امتحان کے بعد جب کمرے سے نکلے تو ان کا بیس پونڈ وزن کم ہو چکا تھا' بعد میں نہائے تو وزن مزید پانچ پونڈ کم ہو گیا۔

بحیثیت ڈاکٹر انہوں نے سگریٹ ختم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اب تو اتنے ماہر ہو گئے ہیں کہ بیس پچیس سگریٹ منٹوں میں ختم کرسکتے ہیں۔ شکر ہے ملک سے شراب

ختم کرنے کا ارادہ نہیں کرلیا۔ ویسے شراب پینا چھوڑنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ شراب کو فریز کرلیا جائے۔ اور پھر اسے پینے کی بجائے کھایا جائے۔ ایک پنجابی فلم "رقعہ" لکھی پنجابی فلموں میں اچھل کود اتنی ہوتی ہے کہ ہماری فلمی ہیروئینوں کا دیوار دیکھتے ہی کودنے کو دل چاہتے لگتا ہے۔ مگر فلم میں وہ کوانٹٹی کے بجائے کوالٹی کے قائل ہیں اگر کوانٹٹی کے قائل ہوتے تو ان کی فلم کی ہیروئین "انجمن" ہوتی۔

کہتے ہیں میری دو کتابیں آ گئی ہیں' ایک اور آ رہی ہیں۔ مگر اس انداز سے کہتے ہیں جیسے اطلاع نہیں دے رہے' دھمکی دے رہے ہیں۔ ڈاکٹری میں انہوں نے نام ہی کمایا۔ دام کے دام میں نہیں آئے۔ سو اب دوسرے پروفیسر ڈاکٹروں کے پاس شوگر فیکٹری' سوپ فیکٹری' وولن فیکٹری بلکہ پتہ نہیں کون کون سی فیکٹری ہے۔ ان کے پاس کوئی فیکٹری ہے تو وہ ہے ------- Satis-Factory

○○○

• جناب بے نیازی

بد صورت کی جو حرکت بد تمیزی کہلاتی ہے' وہی خوبصورت کرے تو ادا بن جاتی ہے اور بے نیازی اس کی ادا ہے۔ وہ ہر تیسرے آدمی کا پسندیدہ شاعر ہے۔ تیسرے آدمی کا اس لیے کہ ہمارے ہاں ہر پہلا اور دوسرا شخص خود شاعر ہے۔ اس کے ہاں اس قدر بے نیازی ہے کہ کسی نے پوچھا' فیض صاحب کی موت سے ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پر کرنے کے لیے آپ کس کا نام پیش کریں گے تو موصوف نے فرمایا۔

"یہ بات میرے سوچنے کی نہیں' آپ کے سوچنے کی ہے۔"

پٹھان ہے اپنی بات نہیں بدلتا یعنی جو کچھ وہ آپ کی حاضری میں کسی غائب کے بارے میں کہہ رہا ہو گا وہی کچھ آپ کے جانے کے بعد آپ کے بارے میں کہے گا۔

مذہب سے اتنا لگاؤ ہے کہ سچے دل سے اپنے آپ پر ایمان لے آیا ہے وہ تو داتا صاحب کے مزار پر جا کر بھی دعا مانگتا ہے یا اللہ میرے اور داتا صاحب کے گناہ معاف کر دے۔ وہ ڈکٹیٹر ہے اپنا حکم منواتا ہے' مگر کسی حاکم کی طرح نہیں' بچے کی طرح۔

اسے پرفیومز جمع کرنے کا شوق ہے۔ اکثر پرفیوم لگا کر مشاعروں میں جاتا ہے تا کہ شاعروں کے پاس آرام سے بیٹھ سکے۔ مجید امجد سے گہری رفاقت رہی جو اس رفاقت کی گہرائی جاننا چاہے اسے گھورتا ہے۔ غالب اور اس کا پیشہ آباء ہی نہیں ذریعہ عزت بھی ایک ہی ہے بس دونوں میں یہ فرق ہے کہ وہ جس چیز کے لیے قرض مانگتا یہ وہ ہی مانگ لیتا ہے۔ یوں اس کی ہر بیوی کو اس کا اتنا ہی خیال رکھنا پڑتا ہے جتنا اس بچے کا جس نے نیا نیا چلنا شروع کیا ہو۔

دیکھنے میں اپنی ہی غزل کا مصرع لگتا ہے۔ شاید اسی لیے ہمیشہ خود کو شعر بنا کر رکھتا ہے۔ مردوں میں بیٹھا پریشان پریشان اور عورتوں میں بیٹھا ہو تو وہ پریشان پریشان لگتی ہیں۔

حافظے کا انتظار حسین ہے یعنی اسے آج کی بات یاد نہیں ہوتی مگر برسوں پہلے کا سب

یاد ہے۔ اپنی پہلی بات کو آخری بات سمجھتا ہے جبکہ دوسروں کی آخری بات کو بھی پہلی بات ہی سمجھتا ہے۔

ہمارے ہاں اکثر شاعر گفتگو کر رہے ہوں تو لگتا ہے ان کی شاعری اچھی ہے' شاعری پڑھ لو تو لگتا ہے گفتگو اچھی کرتے ہیں لیکن اس کی شاعری پڑھو تو لگتا ہے شاعری اچھی ہے اور باتیں سنو تو وہ اچھی لگتی ہیں۔

کہتا ہے مجھے صرف خوبصورت لوگوں سے لگاؤ ہے حالانکہ اسے جن سے لگاؤ ہوتا ہے انہیں خوبصورت کہتا ہے۔

اس کی اپنی الگ سلطنت ہے جس کا وہ خود ہی فرمانروا ہے اور خود ہی رعایا۔ اس کا بس چلے تو وہ سرحدوں پر متعین فوجوں سے ٹینک اور توپیں لے کر انہیں غزلوں اور نظموں سے کام چلانے کو کہے۔

عام آدمی کو یوں دیکھتا ہے جیسے چھت سے گلی میں جھانک رہا ہو۔ کہتا ہے ہندوستان میں تو میری پوجا ہوتی ہے لیکن میرا دوست "ف" کہتا ہے کہ ہندوستان میں گائے کی بھی پوجا ہوتی ہے۔ ڈرا ہوا آدمی ہے اور ماہر نفسیات کہتے ہیں ڈرے ہوئے آدمی سے ڈرنا چاہیے۔

اس کا کوئی ہم عصر اس کا ہم اثر نہیں۔ وہ دنیا کو یوں دیکھتا ہے جیسے کوئی بچہ پہلی بار حیرانی سے یہ سب دیکھ رہا ہو' اسی لیے اس کی شاعری حیران کرنے والی ہے۔

دوسروں کے بارے میں جاننے کا اسے اس قدر شوق ہے کہ جس شاعر ادیب کا اس کے سامنے نام لو فوراً پوچھے گا یہ کون ہے۔ مشاعروں میں دوسرے شعراء کو یوں دیکھتا ہے جیسے غلام علی اپنے سازندوں کو۔ گھر کا حساب کتاب مشاعروں میں کرتا ہے' یعنی آٹا گھی ایک مشاعرہ' فرنیچر تین مشاعرے' وغیرہ وغیرہ۔ مشاعرے میں شعر سنانے سے پہلے نیند کی گولیاں کھانی پڑتی ہیں جبکہ دوسرے شاعروں کی باری پر یہ سب سامعین کو کرنا پڑتا ہے۔

دوسروں کو خوش کرنے کے لیے ان سے تحفے تحائف لے لیتا ہے اور بعض اوقات تو

دوسروں کا دل اتنا خوش کر دیتا ہے' کم از کم ایک سال تک انہیں ایسی خوشی کی حاجت نہیں رہتی۔ آٹو گراف یوں دیتا ہے جیسے تعویذ دے رہا ہو۔

صحافت میں ناکام رہا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ کسی بھی منظر کو مکمل طور پر نہیں دیکھتا بس اس کا بہتر حصہ دیکھتا ہے' اسی لیے اپنے ملنے والوں میں بھی اس کی نظر نصف بہتر پر ہی رہتی ہے۔

جس سے ملتا ہے اسے اپنی خوبیوں کے بارے میں بتاتا ہے کیونکہ خامیوں کا تو لوگوں کو خود پتہ چل جاتا ہے۔ کبھی کسی کی تعریف نہیں کرتا۔ اگر بہت دل چاہے تو منیر نیازی کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ جو دل میں آئے کہہ دیتا ہے' اسی لیے بعض اوقات اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ ان کا تعلق صرف دل سے ہے دماغ سے نہیں۔

بری بات نہیں سنتا یعنی جو بات بری لگے نہیں سنتا۔ اس کے جذبے خالص ہیں' خوشی بھی خالص یعنی بغیر کسی وجہ کے اور ناراضگی بھی خالص یعنی بلا وجہ۔ بحیثیت شاعر اسے قتیل شفائی اور احمد ندیم قاسمی بہت پسند ہیں' اس وقت جب وہ اس کی تعریف کر رہے ہوں۔

کہتے ہیں کلاسیکل موسیقی سننے کا ماحول تنہائی میں ہی بنتا ہے اور یہ واحد موسیقی ہے جو اپنا ماحول بنانے کا خود ہی انتظام کرتی ہے۔ اس کے پاس کلاسیکل موسیقی کی کئی کیسٹیں ہیں جو اسے زیادہ ملنے آنے لگے اسے پاس بٹھا کر سنواتا ہے۔ بہت دیر کے بعد بولتا ہے وہ بھی ایسا کہ دیر تک بولنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

وہ خود کو بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ یہ واقعی اس کی بڑائی ہے کیونکہ وہ اپنی خوبیوں اور خامیوں کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔ اگر وہ خود کو بڑا آدمی کہتا ہے تو پھر اس کے بڑا ہونے پر شک نہیں رشک کرنا چاہیے۔

○○○

• زبان کا دھوبی

عورتیں اس قدر بولتی ہیں کہ کسی اور کو بولنے کا موقع نہیں دیتیں۔ جبکہ انتظار حسین اس قدر خاموش رہتا ہے کہ کسی اور کو بولنے کا موقع نہیں دیتا۔ اس سے مکالمہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے راہ چلتی لڑکی سے گپ کرنا لیکن جب بولتا ہے تو اتنا اچھا لگتا ہے جتنا عورت سنتی اچھی لگتی ہے۔

کتابی چہرہ' پیشانی اتنی کشادہ کہ پتہ نہیں چلتا پیشانی کہاں ختم ہوئی اور پریشانی کہاں سے شروع ہوئی۔ نظر ایسی کہ پاس بیٹھی عورت دکھائی نہیں دیتی البتہ کچھ فاصلے سے نظر آ جاتی ہے۔ نظر کی عینک لگاتا ہے یعنی اس نے عینک لگائی ہو تو نظر نہیں لگتی۔ موصوفہ کو اکثر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے رکھتا ہے۔ چہرے پر اس لیے نہیں لگاتا کہ کہیں گم نہ ہو جائے۔ اگر ہاتھ میں نہ ہو تو تلاش کرنے لگتا ہے اور جب جاتا ہے تو اس کے دوست اپنی عینکیں تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔

وہ اگر کسی کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے تو وہ یہ کہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ ہر کسی کے پاس نہیں بیٹھ سکتا۔ ہر کوئی اس کے پاس بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسا شخص کہ کئی ملاقاتوں کے بعد بھی آپ اس سے نہیں مل پاتے کسی کو برا نہیں کہتاتو کسی کو اچھا بھی نہیں کہتا۔ لگتا ہے زمانہ طالب علمی میں جب بھی یہ سوال آتا ہو گا کہ فلاں فلاں کی تعریف کریں تو سوال ہی چھوڑ دیتا ہو گا۔

ایسا با پردہ کہ اس کی آواز تک نامحرموں سے پردہ کرتی ہے صرف محرموں کو ہی پتا ہوتا ہے کہ وہ باتیں کر رہا ہے باقی سمجھتے ہیں چیونگم چبا رہا ہے۔ بیٹھا ہوا لگتا ہے کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اکیلا نہیں بیٹھتا ساتھ اس کا گلا بھی بیٹھا ہوتا ہے۔

سلام لیتے وقت ہاتھ یوں آپ کو پکڑائے گا جیسے چونی دے رہا ہو۔ اتنی کمزور گرفت

کہ اس کا ہاتھ قانون کا ہاتھ لگتا ہے۔ پان یوں کھاتا ہے جیسے غصہ کھا رہا ہو۔ سگریٹ خرید کر بھی پیئے تو لگتا ہے مانگ کر پی رہا ہے۔ اپنے قریبی دوستوں کی طرح وہ بھی چائے کا آرڈر دے تو بیرا سمجھتا ہے' مذاق کر رہا ہے۔ چلتے وقت ایک ہاتھ میں بیگ پکڑے ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اسے ٹٹولتا رہتا ہے کہ کہیں گر تو نہیں پڑا۔ اس قدر کم سوتا ہے کہ آپ اس سے بات کر رہے ہوں تو آپ بات بعد میں پوری کرتے ہیں وہ اپنی نیند پہلے پوری کر چکا ہوتا ہے۔

برسوں تک "مشرق" اخبار کے دفتر رکشے میں آتا رہا جب سے اسے گھر کا راستہ یاد ہوا ہے اس نے گاڑی لے لی ہے۔ لیکن جس طرح وہ گاڑی چلاتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک سڑک بھی لے لے۔

راستہ بھول جائے تو پھر پاک ٹی ہاؤس میں آ بیٹھے گا وہاں بیٹھے لوگوں کو دیکھ کر بھی یہی لگتا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی یہاں آئے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں مہمان تو خوشی کا باعث ہوتے ہیں یعنی ان کے جانے سے خوشی ہوتی ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھا سامان کا حصہ لگتا ہے جتنے پیسوں میں اسے خوش کیا جا سکتا ہے اتنے تو آپ نظر ملا کر کسی بیرے کو ٹپ میں نہیں دے سکتے۔

گزرے دن اسے زیادہ خوبصورت لگتے ہیں جس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ دن اس کی جوانی کے تھے لیکن فی الحال تو اس کی جوانی کا بھی پکا پتہ نہیں۔ ایسا آدمی ہے کہ اس کا بس چلے تو ہر مہینے تنخواہ لینے کی بجائے کئی برس پہلے کی لی ہوئی تنخواہ یاد کرکے گھر کر خرچ چلائے۔ ایسے ہی جیسے وہ اپنی کہانیوں میں نئی عورت لانے کی بجائے "حسینہ" کا ہی نام بدل بدل کر گزارہ کر رہا ہے۔

پہلے بلند شہر میں رہتا تھا اب بلند شہر اس میں رہتا ہے۔ بحیثیت ادیب اس کی یادداشت ہاتھی کی' چال خرگوش کی اور چال چلن کچھوے کا ہے۔ زبان بڑی دھلی دھلائی بولتا ہے اسی لیے لوگ اسے زبان کا دھوبی کہتے ہیں۔

ترقی پسند اس کی ترقی پسند نہیں کرتے اور رجعت پسند اسے پسند نہیں کرتے۔ دیکھنے میں

انتظار حسین ہے لیکن مسئلہ اصولوں کا ہو تو حسین۔ اسے کیسا ہی زخم لگ جائے وہ چلائے گا نہ چیخے گا اس کے تو کردار بلند آواز میں نہیں روتے۔ وہ زخم کا علاج بھی نہیں ڈھونڈے گا اسی لیے اسے ایک بار زخم لگ جائے تو وہ ہمیشہ ہرا رہتا ہے۔

کہتا ہے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا گم شدہ سپاہی ہوں جو بعد میں افسانہ نگار بن گیا۔ اس کی یہ بات سمجھ میں آئے نہ آئے جنگ آزادی کی ناکامی کی وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔

بڑی عمارتیں کسی شہر کی شناخت ہوتی ہیں اور بڑے آدمی وہاں کے شہریوں کی۔ بڑی عمارتوں اور بڑے لوگوں میں یہ فرق ہے کہ بڑی عمارتیں دور سے چھوٹی اور قریب سے بڑی نظر آتی ہیں جبکہ آج کے بڑے آدمی دور سے بڑے اور قریب آؤ تو چھوٹے ہونے لگتے ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں' انتظار حسین بڑا آدمی نہیں کیونکہ جب تک اس کی قریب نہ جاؤ اس کے قد کا احساس نہیں ہوتا۔ ادب برائے زندگی کی بجائے اس نے زندگی برائے ادب کی' مگر وہ بڑا ادیب بھی نہیں کہ اس کا کوئی ادبی گروہ نہیں بلکہ وہ تو بڑا صحافی بھی نہ بن سکا کہ اس کا لہجہ دھمکی آمیز نہیں ہوتا۔

○○○

• مسلح افواج کے سربراہ

پیر پگاڑا تو فرماتے ہیں جماعت اسلامی دراصل مسلم لیگ ہی کا اردو ترجمہ ہے۔ بہرحال یہ فرق ہے کہ جماعت میں ایک امیر ہوتا ہے اور مسلم لیگ میں سبھی ہوتے ہیں۔ جماعت کے امیروں میں نمبر ایک مولانا مودودی ہیں۔ میاں طفیل محمد دو نمبر امیر تھے اور قاضی حسین احمد تیسرے درجے کے ہیں۔ قاضی حسین احمد اور میاں طفیل محمد صاحب کے مزاج میں وہی فرق ہے جو اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی میں ہے۔ مولانا مودودی تو چھڑی ہاتھ میں یوں پکڑتے تھے جیسے قلم پکڑا ہو۔ میاں صاحب کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ قلم پکڑا ہے یا چھڑی جبکہ قاضی حسین احمد تو قلم بھی یوں پکڑتے ہیں جیسے چھڑی پکڑی ہو۔ ہر امیر کے دور میں جماعت کی رفتار وہی رہی جو امیر کے اپنے چلنے کی تھی۔
میاں صاحب تو ایسے ہیں کہ جب تک بندہ رک نہ جائے' پتہ نہیں چلتا وہ چل رہے ہیں۔ قاضی صاحب رکے بھی ہوں تو ہم سے تیز ہوتے ہیں۔ لگتا ہے وہ زمین کے اوپر نہیں چلتے' زمین ان کے نیچے چلتی ہے۔
میاں طفیل محمد صاحب اس عمر میں ہیں جس میں کسی بندے کو یہ خوشخبری دی جا سکتی ہے کہ آپ کی زندگی میں کوئی جنگ نہ ہو گی۔ وہ امارت میں ہی دوسرے نمبر پر نہیں آئے' بچپن میں کسی لڑکے سے لڑائی ہو جاتی تو اس میں بھی دوسرے نمبر پر ہی آتے۔ پہلے پٹھان کوٹ اور پینٹ کوٹ بھاتا تھا' ٹائی لگاتے پھر ایسی داڑھی رکھی کہ ٹائی لگاتے تو ناٹ' ناٹ ویزایبل ہوتی۔ پتلون بھی پہنتے تھے' مگر بعد میں پہننا چھوڑ دی کہ پتلون سینے کے گرد ٹائٹ لگتی تھی۔ دوران گفتگو پنجابی کے لفظ یوں استعمال کرتے ہیں جیسے سیاست دان عوام کو استعمال کرتے ہیں۔ تقریر کر رہے ہوں تو وہ اردو بول رہے ہوتے ہیں اور لوگ پنجابی سن رہے ہوتے ہیں۔ ہر کام اصلاح کے لیے کرتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش کی کتاب "کشف المحجوب" کا ترجمہ کیا۔ کہتے ہیں' نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ اصلاح بھی کر دی۔
لاطینی کہاوت ہے' پینٹر اور وکیل بہت جلد سیاہ کو سفید کر دیتے ہیں۔ مگر یہ ایسے وکیل تھے کہ ان کے موکل کے مخالفوں کو وکیل کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ یاد رہے ان دنوں وکیل کیئے جاتے تھے' آج کل تو بعض اوقات جج ہی کر لیے جاتے ہیں۔ چارلس ڈکنز سے کسی نے پوچھا۔ "اچھا وکیل بننے کے لیے کیا چاہیے؟"
اس نے کہا۔ "برے لوگ"
سو میاں صاحب اچھا وکیل نہ بن سکے۔ یوسفی لکھتے ہیں۔ "وکیل وکالت چھوڑ دے اور سچ بولنے لگے پھر بھی لوگ اسے وکیل ہی کہتے ہیں۔" لیکن میاں صاحب جب وکالت کرتے تھے تب بھی لوگ انہیں میاں ہی کہتے تھے۔ پھر "بار" کو یوں چھوڑا جیسے ڈاکٹر کے کہنے پر Cirrohotic "بار" جانا چھوڑتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ بے اختیار سچ بول دیتے ہیں حالانکہ وہ بااختیار سچ بولتے ہیں۔ آپ کی بات اس قدر توجہ سے سنیں گے کہ آپ کا بات ختم کرنے کو دل نہ چاہے گا۔ طبیعت میں اس قدر عاجزی کہ بندہ عاجز آ جاتا ہے۔ وہ جتنے بھولے ہیں' اتنا بھولا ہونے کے لیے بڑا کچھ بھولنا پڑتا ہے۔ جماعت کی بہتری کے لیے انہوں نے جو کام کئے' ان میں سے ایک جماعت کی امارت سے معذرت کرنا ہے۔ گھر کا ماحول ایسا کہ ان کے بچوں سے پوچھو۔ "کس جماعت میں پڑھ رہے ہو؟" تو کہیں گے۔ "جماعت اسلامی میں" بڑی سے بڑی تکلیف پر بھی آپ ان سے ہمدردی کرنے جائیں تو آپ کو یوں تسلیاں دے رہے ہوں گے جیسے انہیں آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔
تھامس فلر کا کہنا ہے۔ "آج کل سچ سب سے بڑی خبر ہے۔" اور میاں صاحب بڑی خبرناک شخصیت ہیں۔ جمہوریت پر ہمیں یہ اعتراض ہے کہ جمہوریت آتی ہے۔ مارشل لاء میں یہ خوبی ہے کہ وہ آتا ہے' آتی نہیں اور میاں صاحب عورت کی حکمرانی کے قائل نہیں۔ بڑی سے بڑی کامیابی پر بھی خدا سے دعا مانگتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں۔

"اللہ میاں اس بار معاف کر دو' آئندہ ایسا نہ ہو گا۔" لہجہ ایسا نرم کہ اگر کسی رند سے غصے میں پوچھیں کہ تم شراب پیتے ہو؟ تو اسے سمجھ نہ آئے گی کہ سوال پوچھ رہے ہیں یا دعوت دے رہے ہیں۔ جس کی بے عزتی کریں' اسے ہی پتہ ہوتا ہے کہ میری بے عزتی کر رہے ہیں' دوسرے سمجھتے ہیں کہ عزت کر رہے ہیں۔ انہیں کسی بات پر کم ہی غصہ آتا ہے اور جب غصہ آتا ہے تو کم ہی پتہ چلتا ہے کہ کس بات پر آیا۔ ایسے ٹھنڈے کہ گرمیوں میں بھی ان کے پاس چادر لے کر بیٹھنا پڑتا ہے۔

وہ کام بھی اچھے طریقے سے کرتے ہیں جو کام صرف طریقے سے کئے جاتے ہیں۔ پہلے رس گلے چینی میں ڈبو کر کھاتے' اب چینی بھی دھو کر کھاتے ہیں۔ وہ غلط وقت پر صحیح بات کرتے ہیں لیکن صحیح وقت پر غلط بات نہیں کرتے۔ البتہ وہ کسی کو اسلامی ذہن کا بندہ کہیں تو اس سے مراد جماعت اسلامی ذہن کا بندہ ہو گا۔

مولانا مودودی جماعت کو سیاست میں لائے' قاضی حسین احمد سیاست کو جماعت میں لائے۔ سیاست میں ان کی سوچ الگ ہے۔ سوچ الگ نہ ہو تو خود الگ ہو جاتے ہیں۔ قاضی صاحب وہ وکیل ہیں جو عدالت میں کیس یوں لڑتے ہیں جیسے عدالت پر مقدمہ چلا رہے ہوں۔ شروع ہی سے اس قدر تیز تھے کہ سکول میں ان کی جو تاریخ پیدائش درج ہے' اس سے دو سال قبل پیدا بھی ہو چکے تھے۔ ان کے بزرگ کام کے قاضی تھے۔ "زیارت کاکا" گاؤں میں ان کا خاندان گاؤں کا استاد تھا۔ ان کے سامنے سب "کاکے" تھے۔

ان کے گھر کے ارد گرد دوسروں کے گھر یوں ہی تھے جیسے دیہاتی سکول کے بچے استاد کے ارد گرد بیٹھے ہوتے ہیں۔ تعلق اس خاندان سے جہاں نوجوانوں کے چہرے پر داڑھی نہ ہونا بے پردگی میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں جماعت کے نظم میں ضبط ہوئے۔ وہ اسلامی جمعیت طلبہ سے جماعت میں نہ آئے بلکہ اسلامی جمعیت طلبہ ان سے جماعت میں آئی۔

بچپن ہی سے جغرافیہ سے اس قدر لگاؤ تھا کہ کوئی پوچھتا' بتاؤ فلاں فلاں ملک کہاں ہے تو جھٹ بتا دیتے۔ "جغرافیہ کی کتاب کے فلاں صفحے پر" بچپن میں دنیا کا نقشہ یوں دیکھتے

جیسے اپنا ناک نقشہ دیکھ رہے ہوں۔ پھر جغرافیہ کے استاد ہوئے اور جغرافیہ کے استاد کے لیے جغرافیہ سے اہم کوئی مضمون نہیں ہوتا کیونکہ جغرافیہ نے کے ہونے سے ہمیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا' مگر وہ استاد نہیں رہ سکتا۔ نوجوانی میں مشتاق احمد یوسفی صاحب کو بھی جغرافیے کا اتنا شوق تھا کہ ایک صاحب انہیں اداکارہ مسرت نذیر کی ہسٹری بتا رہے تھے تو یوسفی صاحب نے کہا۔ "قبلہ ہسٹری کو چھوڑیں مجھے ان کا جغرافیہ بتائیں۔"

خواتین کے معاملے میں قاضی صاحب کا رویہ اتنا سخت نہیں جتنا مولانا عبدالستار نیازی صاحب کا ہے کہ انہوں نے تو عورت سے شادی تک نہیں کی۔ بہرحال قاضی صاحب سے مس گائیڈڈ میزائل کا پوچھیں تو کہیں گے۔ "وہ میزائل جسے کسی مس نے گائیڈ کیا ہو۔" قاضی صاحب کا نشانہ اچھا ہے۔ ایک بار نشانہ بازی کر رہے تھے' ٹارگٹ پر جو تصویر تھی کوئی نشانہ اسے نہ لگا تو احباب نے فوراً وہاں سے وہ تصویر ہٹا کر ولی خان اور الطاف حسین کی تصویر رکھی تو نشانہ خود تیر پر آ لگا۔ رحمت الٰہی صاحب کا جماعت کا عہدہ چھوڑنا ان کے لیے رحمت الٰہی بنا۔ قاضی وہ تھے ہی' یوں میاں طفیل محمد صاحب کے طفیل جماعت کے میاں بھی بن گئے۔

قاضی صاحب اپنے اور جاوید اقبال کے والد سے متاثر ہیں۔ نرگس پسند ہے اور کرگس ناپسند۔ گرمی اور سردا بہت کھاتے ہیں۔ دوسروں کو سننے کا اس قدر شوق ہے کہ منظر بھی ہو پسند ہے جس میں کچھ سننے کو ہو' جیسے پرندوں کی چہچہاہٹ اور پانی کا شور۔ دیکھنے میں اپنے قد سے لمبے لگتے ہیں۔ سنتے ہوئے سر بلند اور کہتے ہوئے سر بلند رکھتے ہیں۔ پٹھان ہیں اور آپ کو پتہ ہے پٹھان کب پٹھان کی طرح ہوتا ہے؟ جی ہاں' جب غصے میں ہوتا ہے۔ وہ تو تقریر کر رہے ہوں تو لگتا ہے غصہ کر رہے ہیں۔ آپ پوچھیں گے' غصے میں کیا کرتے ہیں تو جناب غصے میں صرف غصہ کرتے ہیں۔ غصے میں ہوں تو بات میں اور کچھ ہو نہ ہو' کرنٹ ضرور ہوتا ہے۔ ہم زمانہ طالب علمی میں اونچی آواز میں بول بول کر سبق یاد کیا کرتے تھے' وہ اس طرح سوچتے ہیں۔ تقریروں میں اقبال کے شعر اس قدر استعمال کرتے ہیں کہ لگتا ہے یوں اقبال پر تقریر فرما رہے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں وہ پردے کے بڑے حق میں ہیں‘ حالانکہ انہیں ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں مخالفین کو ننگا کرتے ہم نے خود دیکھا ہے۔ خود کو بے قرار رکھتے ہیں۔ ان کے ذمے کوئی کام لگایا جائے تو اسے یوں کرتے ہیں جیسے کام ان کے ذمے نہیں لگایا گیا‘ وہ کام کے ذمے لگائے گئے ہیں۔ اس قدر متحرک کہ ایک جگہ بیٹھے ہوئے بھی ساکن نہیں ہوتے۔ وہ آرام کر رہے ہوں تو یقین کر لیں‘ یہ سب اپنی مرضی سے نہیں ڈاکٹر کی مرضی سے کر رہے ہوں گے۔ رات گئے دن کا آغاز کرتے ہیں اور اس وقت تک پہلا دن ختم نہیں کرتے جب تک اگلا شروع نہ کر لیں۔

پٹھان اپنی زبان نہیں بدلتے لیکن وہ ایرانیوں سے فارسی‘ عربوں سے عربی‘ اہل مغرب سے انگریزی‘ اہل خانہ سے پشتو‘ ہم وطنوں سے اردو‘ اور ہم جماعتیوں سے اسی زبان میں بات کرتے ہیں جو وہ سمجھتے ہیں۔ انہیں بولنا تو کئی زبانوں میں آتا ہے مگر چپ رہنا کسی زبان میں نہیں آتا۔ سر ڈھانپنا ان کے نزدیک ستر ڈھانپنا بلکہ بہتر ڈھانپنا ہے۔ لوگوں کے سر پر بال اگتے ہیں‘ ان کے سر پر ٹوپیاں۔ ان کے نزدیک تو ٹنڈ کرانا سر سے ٹوپی اتارنا ہوتا ہے۔ باریش چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ اگرچہ کھیلنے کے لیے مسکراہٹ کے پاس کم ہی چہرہ بچا ہے۔ لہجہ ایسا کہ جنرل دوستم کو بھی جنرل دو ستم کہتے ہیں۔ قاضی حسین احمد مخالفوں کے لیے قاضی بھی ہیں اور حسین بھی۔ انہوں نے ذاتی عدالتیں بھی لگوائیں۔ "پاسبان" کی ان عدالتوں میں ان کی موجودگی ایسے ہی ضروری ہوتی ہے جیسے پنجابی فلم ہٹ کرانے کے لیے سلطان راہی۔ اسی لیے وہ پاسبان کے جلسے میں جا رہے ہوتے ہیں تو لگتا ہے "شوٹنگ" پر جا رہے ہیں۔ مجاہد آدمی ہیں‘ کار سے بھی یوں نکلتے ہیں جیسے مورچے سے نکل رہے ہوں۔ ہاتھ ملا رہے ہوں تو لگتا ہے ہتھ جوڑی کر رہے ہوں۔ چلتے یوں ہیں جیسے پیش قدمی کر رہے ہوں۔ بلاشبہ وہ پاکستان کی مصلّٰی افواج کے سربراہ ہیں۔

• پان کا بادشاہ

اگرچہ وہ پان کی چلتی پھرتی پبلسٹی کمپین ہیں' لیکن اتنی شہرت انہوں نے پان کو نہیں دی جتنی پان نے انہیں دی ہے۔ ویسے تو پان کے ذکر کے بغیر ہمارا بھی حدود اربعہ بیان کرنا دشوار ہے کہ ہم بڑے دھان پان ہیں' لیکن مولانا دھن پان شخصیت ہیں۔ وہ جے یو پی کے تاحیات صدر ہیں یعنی جب تک جے یو پی حیات ہے۔ بول رہے ہوں تو جے یو پی کے کم اور یو پی کے زیادہ لگتے ہیں۔ وہ نام کے ہی شاہ نہیں' کام اور پان کے بھی شاہ ہیں۔ میرٹھ میں پیدا ہوئے مگر پوچھو کہاں پیدا ہوئے تو کہیں گے "گھر میں"

بچپن میں فٹ بال کے کھلاڑی تھے۔ فٹ بال اور سیاست میں یہ قدر مشترک ہے کہ اگر فٹ بال گول میں گرانا ممکن نہ ہو تو مخالف کھلاڑی کو گرانے کی کوشش کریں۔

مولانا صاحب میں شروع ہی سے سیاست دان بننے والی خوبیاں موجود تھیں۔ کوچ نے ایک بار کہا کہ اگر فٹ بال نہ چھین سکو تو مخالف کھلاڑی کو ٹانگ مار کر گرانے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد کہا' ابھی فٹ بال آتا ہے تو کھیل شروع کرتے ہیں۔ اس پر مولانا نے کہا فٹ بال کو چھوڑیں آپ کھیل شروع کروائیں۔ سیاست میں فٹ بال ایم کیو ایم والے لے گئے کیونکہ الطاف حسین حالی تو پانی پت میں پیدا ہوئے تھے مگر ایم کیو ایم کے الطاف حسین بے حالی پانی پت کے میدان میں پیدا ہوئے۔

ہر وقت ان کے منہ میں پان اور جماعت اسلامی ہوتی ہے۔ دوران گفتگو بات کرتے کرتے جماعت اسلامی پر فقرہ یوں پھینکتے ہیں جیسے پان کھاتے کھاتے پیک پھینکتے ہیں۔ اب تو جماعت اور پاندان کے بغیر کہیں جاتے بھی نہیں۔ گلوری گلے میں یوں دباتے ہیں جیسے کلرک فائل دباتے ہیں۔ منہ ایسا کہ اس میں پان نہ ہو تب بھی لگتا ہے کہ ہے۔ ہمیں تو پان کھانے کا سلیقہ ہی نہیں آتا۔ یوں شرم سے پان پان ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا کو اقوام متحدہ پر محبت آئے تو اسے قوام متحدہ کہیں گے۔ پان اس قدر نفاست سے کھاتے ہیں کہ کیا مجال منہ سے پتہ چلے کہ پان کھا رہے ہیں‘ قمیض سے پتہ چلتا ہے۔ پانوں کے بعد ان کی دوسری مصروفیات جماعت اسلامی ہے۔ سال میں چند دنوں کے لیے وہ پاکستان کے تبلیغی دورے پر آتے ہیں۔ مذہبی رہنما انہیں سیاست دان سمجھتے ہیں اور سیاست دان انہیں مذہبی رہنما مانتے ہیں۔ ان کے والد محترم کو قائداعظم نے بیرونی ملک کے دورے پر بھیجا تا کہ باہر پاکستان کی فضا بہتر بنائیں۔ اب مولانا خود دوروں پر چلے جاتے تا کہ پاکستان کی فضا بہتر رہے۔ جب تک وہ باہر رہتے ہیں‘ بہتر رہتی ہے۔

انہیں دنیا کی ہر اہم زبان آتی ہے جو نہیں آتی اسے اہم نہیں سمجھتے۔ فرانسیسی‘ فارسی‘ اردو‘ انگریزی اور سواحلی اس قدر روانی سے بولتے ہیں کہ سننے والے کو بہا لے جاتے ہیں۔ ویسے فرانسیسی تو ہم بھی سمجھ لیتے ہیں بشرطیکہ اردو میں بولی جائے۔ عربی پسند ہے۔ گلا تک عربی سے صاف کرتے ہیں۔ اردو تک یوں بولتے ہیں کہ ایک صاحب خربوزے بیچ رہے تھے۔ ان سے پوچھا۔ ”آپ عدداً بیچتے ہیں یا وزناً؟“ تو دکاندار نے کہا۔ ”مولانا! میں خربوزے بیچتا ہوں۔“ بڑے بدلہ سنج اور بذلہ سنج ہیں۔ بھٹو مرحوم نے ایک بار کہا۔ ”آپ ایک شریف آدمی کی بات پر اعتبار کریں اور میری بات مان لیں۔“ تو مولانا بولے۔ ”آپ ایک شریف آدمی لے آئیں‘ میں اعتبار کر لوں گا۔“ فرماتے ہیں۔ ”جس سے ناراض ہوتا ہوں اسے ایک منٹ میں نکال دیتا ہوں۔ دل سے بھی اور پارٹی سے بھی۔“ ان کی پارٹی اتنی ہی بڑی ہے جتنا بڑا ان کا دل ہے۔ وہ دین کو سیاست سے الگ رکھتے ہیں جیسے ذوالفقار علی بھٹو سے حزب اختلاف کی لڑائی میں۔ وقت نماز وہ اپنی جماعت کی الگ جماعت کراتے ہیں اور سیاست میں مفتی محمود کی امامت میں لڑتے ہیں۔ ان کی جماعت ملک کی چھوٹی پارٹیوں میں سب سے بڑی پارٹی ہے‘ لیکن وہ پارٹیاں جو اس سے بہت بڑی ہیں‘ یہ ان سے تھوڑی ہی چھوٹی ہے۔ البتہ الیکشن کے دنوں میں جب دوسری پارٹیوں کے سربراہ اپنے ووٹ تلاش کر رہے ہوتے ہیں‘ یہ اپنے امیدوار تلاش

کرتے ہیں۔ دوسری پارٹیوں کا منشور ہی ان کا مسلک ہوتا ہے۔ ان کا مسلک ہی ان کا منشور ہوتا ہے۔

ایک تاجر سے ہم نے پوچھا کہ مولانا کے سیاست میں آنے سے کیا فرق پڑا ہے؟ تو اس نے کہا۔ "سرمہ نورانی اور پان نورانی زیادہ بکنے لگا ہے۔" مولانا کے مداح ان کے نام کے ساتھ اتنے القاب و آداب لگا دیتے ہیں جیسے ان جیسے ایک بزرگ نے رات کو ہوٹل کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کمرے کے لیے پوچھا۔ اندر سے آواز آئی۔ "کون؟" کہا۔ "ہم ہیں علامہ سرکار شریعت' حافظ قادری صوفی چشتی صابری ثم لاہوری-----" تو چوکیدار نے گھبرا کر اندر ہی سے جواب دیا۔ "معاف کیجئے صاحبان! ہوٹل میں اتنے آدمیوں کے لیے جگہ نہیں۔"

سیاست میں ہم خیال جماعت سے اتحاد کرتے ہیں۔ ہم خیال سے مراد وہ جو ان کی "ہم" کا خیال رکھے۔ اسمبلی میں ان کے ارکان کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ ساتھ تقریباً لگانا پڑتا ہے۔ گول میز کانفرنس کا اتنا ذکر کرتے ہیں کہ مریدوں نے گھر کی میزیں گول کرنا شروع کر دیں۔ اگرچہ کانفرنس وہ جگہ ہوتی ہے جہاں لوگ وہ کہتے ہیں جو کرنا چاہیے اور جلوس وہ جگہ ہوتی ہے جہاں لوگ وہ کرتے ہیں جو کہنا چاہیے۔ بہرحال وہ کہتے ہیں' ملک کے دو ٹکڑے اس لیے ہوئے کہ یحییٰ خان کے پاس گول میز نہ تھی' لیکن بقول پگاڑہ مولانا کے گھر میں تو میز ہی نہیں' گول میز تو دور کی بات ہے۔ موصوف کا گھر محلے میں ہے جبکہ سیاست دانوں کے گھر میں تو کئی محلے ہوتے ہیں۔ پوچھو گھر سجانا ہو تو کیا کرتے ہیں؟ کہیں گے خود گھر آ جاتا ہوں۔ "خواتین" کا بے نظیر احترام کرتے ہیں۔

مولانا دو ہزار کافر مسلمان کر چکے ہیں۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے' ہم تو ایک کافر کو ہی بمشکل مسلمان بنا سکے۔ دوسری کو بنانے لگے تو پہلی نے کیس کر دیا۔ دوران گفتگو عروسی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یوں پہلو بدلتے ہیں جیسے رائے صاحب پارٹیاں بدلتے ہیں۔ گفتگو میں الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے لگتے ہیں جمعیت علمائے پاکستان کے عہدیداران

کا انتخاب کر رہے ہیں۔ مولانا الیکشن میں صرف اسے کھڑا کرتے ہیں جو کھڑا ہوتا رہا ہو یعنی انہیں دیکھ کر کھڑا ہوتا رہا ہو۔ ان کے پی اے سے وقت لیے بغیر کوئی انہیں نہیں مل سکتا' بلکہ لگتا ہے وہ اپنے پی اے سے وقت لیے بغیر خود سے بھی نہیں ملتے۔ مزاج اور مزاح برار ہو تو بہت برا لگتا ہے۔ بہت اچھا ہو تو صرف اچھا لگتا ہے۔ مخصوص انداز سے بولتے ہی نہیں' چپ بھی مخصوص انداز سے ہوتے ہیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں' لیکن جسے معاف کرنا چاہیں' اسے اینٹ کا جواب اینٹ ہی سے دیتے ہیں۔ ان کا مشورہ بھی کارکنوں کے لیے حکم ہوتا ہے۔ مرید تو ان کی تجویز کو بھی تعویذ سمجھتے ہیں۔ اس قدر انا کہ کوئی کہہ دے کہ آپ تو بوڑھوں کی طرح چلتے ہیں تو کہیں گے' نہیں بوڑھے میری طرح چلتے ہیں۔

وہ جگہ جہاں ناپسندیدہ افراد کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے' سسرال کہلاتی ہے اور مولانا صاحب کی بیوی سعودی عرب کی ہیں۔ صحافیوں میں ان کی افطاری کی بریانی بہت مشہور ہے۔ وہ اتنی لذیذ ہوتی ہے کہ اگر مولانا سیاست نہ بھی کرتے' تب بھی انہیں روزگار کی فکر نہ ہوتی۔ لوگ ان سے اپنا نکاح اور دوسرے کا جنازہ پڑھوانا بڑی سعادت سمجھتے ہیں اور اکثر مذہبی لوگ ہر سال یہ سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہر کام مسلمانوں کے لیے کرتے ہیں۔ وہ تو پان بھی یوں کھاتے ہیں جیسے مسلمانوں کے لیے کھا رہے ہیں۔ یہی نہیں وہ تو کہتے ہیں۔ "میں پان نہیں کھا رہا ہوتا' دراصل مسلمانوں کی امداد کر رہا ہوتا ہوں۔ کیونکہ پان انڈونیشیا' بنگلہ دیش اور سری لنکا سے آتا ہے اور زیادہ تر اس کا مسلمان ہی کاروبار کرتے ہیں۔ یوں اگر میں نے پان چھوڑ دیئے تو مسلمانوں کو نقصان ہو گا۔"

مزاروں پر ہم نے کسی پیر کو جاتے نہیں دیکھا' مریدوں کو ہی دیکھا۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پیر مزار کے اندر ہوتے ہیں۔ لیکن مولانا پہلے سیاست دان ہیں جن کی الیکشن کمپین میں مردے بھی زندوں کی طرح حصہ لیتے ہیں۔ ان کے سیاست میں آنے سے پہلی بار "مزار" کا لفظ سیاست میں آیا کیونکہ وہ "مزاری" سیاست دان ہیں۔

• بلبل پاکستان

ارکان اسمبلی اس کا ادیب سمجھ کر احترام کرتے ہیں اور ادیب شاعر اسمبلی کی ممبر سمجھ کر سلام کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحریوں کے حوالے سے نہیں' تحریریں اس کے حوالے سے

پہچانی جاتی ہیں۔

کہتے ہیں عورت' مرد کا سب سے پہلا احمقانہ مطالبہ ہے اور آج تک مرد صرف اپنے اس مطالبے کو حق بجانب قرار دینے کی کوشش میں ہے۔ محترمہ کی تحریریں اسی مطالبے کی حمایت میں ہیں۔ اس کے قلم کا ہر لفظ اتنا نازک ہوتا ہے کہ صنف نازک لگتا ہے اسی لیے اس کی تحریر پر اس کا نام نہ بھی ہو پھر بھی اسی کے نام لگتی ہے۔ "چادر چار دیواری اور چاندنی" کے نام سے کالم لکھتی ہے جو صرف خواتین کا نمائندہ نہیں کیونکہ بقول میرے دوست "ف" اگر ایسا ہوتا تو اس کا نام "چادر' چار دیواری' چارپائی اور چاندنی" ہوتا۔

تصویر کے علاوہ اس کے ہاں کوئی چیز پرانی نہیں ہوتی۔ ویسے بھی اس کی آج کی یا بیس برس پہلے کی تصویر میں کوئی فرق نہیں۔ اگر کوئی فرق پڑا ہے تو تصویر کھینچنے والوں کی عمر میں ہو گا۔ دور سے ادھیڑ عمر اور پاس سے ہم عمر لگتی ہے۔

سب کام خاوند کی مرضی سے کرتی ہے۔ اس نے شادی بھی خاوند کی مرضی سے کی۔ میاں کا ذکر اس قدر عقیدت سے کرتی ہے کہ بندہ اللہ میاں سمجھتا ہے۔ اس کی قابل ذکر تخلیقات میں چارہ گر' پیاسی' لازوال' خوبصورت' اللہ میاں جی' مبشر' بشر' حسن اور عمر شامل ہیں۔

اسے بچپن میں بھی کھیلنے کو لفظ ملے۔ گھر کی فضا اس قدر ادبی تھی کہ شعروں میں ایک دوسرے کو ڈانٹتے۔ جتنی عمر میں اس نے کہانیاں لکھنا شروع کیں یہ عمر تو ہمارے ہاں کہانیاں سننے کی ہوتی ہے۔ اس کے افسانے اردو ادب کے سب سے مہنگے افسانے

ہیں۔ یعنی جتنے مہنگے کاغذ اور قلم سے وہ افسانہ لکھتی ہے آج تک اردو میں نہیں لکھا گیا۔ صفائی اور بناؤ سنگھار کی اس قدر شوقین کہ جب تک اپنی ہیروئین کو نئے فیشن کا لباس' عاشق اور خوشبو نہ لگا لے اسے کہانی میں نہیں لاتی۔ کہانی میں عورت کی ایسی تصویر کشی کرتی ہے کہ لگتا ہے' شیشے کے سامنے بیٹھ کر لکھتی ہے اس کی کہانیاں پڑھ کر بندہ متاثر ہو نہ ہو بالغ ضرور ہو جاتا ہے اس کے ناولوں کے کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اسی لیے جب مرضی ہو آ جاتے ہیں' جب دل چاہے چلے جاتے ہیں۔ تحریروں کا ماحول ایسا تر و تازہ کہ لگتا ہے ائیر کنڈیشن میں بیٹھ کر تخلیق کی گئی ہیں۔ اس کی کہانی میں اور کچھ ہو نہ ہو وہ خود ضرور ہوتی ہے۔

گفتگو کرتی بیس سال کی لگتی ہے البتہ سنتی ہوئی اپنی ہی عمر کی لگتی ہے۔ اس کی پوری شخصیت اس کی آنکھوں میں ہے وہ چپ ہو تو آنکھیں بولتی ہیں۔ وہ بول رہی ہو تو آنکھیں ہلانے لگتی ہیں۔ چپ رہے تو حسین لگتی ہے بول اٹھے تو ذہین۔ اکیلے آدمی سے یوں گفتگو کرتی ہے جیسے اجتماع سے خطاب کر رہی ہو اور اجتماع سے یوں خطاب کرتی ہے کہ ہر آدمی سمجھتا ہے صرف مجھ سے گفتگو کر رہی ہے۔ دنیا کے ہر موضوع پر بلکہ موضوع کے بغیر بھی بول سکتی ہے۔ لکھنے کا اس قدر شوق ہے کہ جب کچھ لکھنے کو دل نہ چاہے تو چیک لکھنے لگتی ہے۔

اس کا پسندیدہ مقام وہی ہے جو بقول مارکوس عورت کا اصل مقام ہے۔ اس کی تین خواہشیں ہیں' جی بھر کے لکھنا' جی بھر کے بولنا اور اتنا ہی سونا اور وہ بیک وقت تینوں پوری کرنا چاہتی ہے۔

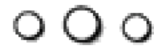
اس کا گھر اتنا بڑا ہے کہ بندہ اس میں راستہ بھول سکتا ہے۔ آج کل خواجہ سرا بادشاہوں کی کہانیوں میں دربانی کرتے ملتے ہیں یا اس کے گھر۔ ایسی مہمان نواز کہ ملنے جاؤ تو خود کھانے والی چیزوں کے ساتھ آئے گی۔ اس قدر حساس ہے کہ کسی کی مصیبت سنتے وقت اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ لگتا ہے سن نہیں رہی سنا رہی ہے۔ اگر کوئی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنا دکھ سنا دے تو اس قدر غمگین ہوتی ہے کہ سنانے والے

کو الٹا اسے تسلیاں دینا پڑتی ہیں۔ اس نے کبھی کسی نوکر کو ملازمت سے نہیں نکالا بلکہ اکثر لگتا ہے کہ اس نے نوکر نہیں رکھا بلکہ نوکر نے اسے مالک رکھا ہوا ہے۔

مرد ایک وقت میں صرف ایک ہی کام کرتا ہے یعنی بولتا ہے تو پھر سنتا نہیں' مگر عورتیں بول بھی رہی ہوتی ہیں اور سن بھی رہی ہوتی ہیں۔ محترمہ تو اپنی باتیں بڑی توجہ سے سنتی ہیں۔ تقریبات میں ایک منٹ بولے تو کئی گھنٹے سنائی دیتی ہے۔ وہ عورت سے زیادہ مرد کے کردار اور نفسیات پر عبور رکھتی ہے' عورت پر اس لیے نہیں کہ یہ مردانہ کام ہے۔ اسے اکثر مالی پریشانیوں کا سامنا رہتا ہے یعنی پریشانی رہتی ہے کہ اتنا مال کیسے خرچ کرے۔ صوفی شعراء سے اس قدر متاثر ہے کہ اب تو وہ بھی اس سے متاثر ہونے لگے ہیں۔

کہتی ہے عورت کو پہلا مرد اور مرد کو آخری عورت ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ مردوں کو عورتوں کا مخالف سمجھتی ہے۔ ہم بھی سمجھتے ہیں بشرطیکہ اس سے مراد صنف مخالف ہو۔

اسے اس قدر شعر آتے ہیں کہ دیوان لگتی ہے۔ جو بھی شعر سناتی ہے بہت اچھا لگتا ہے' جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ اس کا اپنا نہیں ہوتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جس کا شعر ہوتا ہے وہ خود سنانے والا نہیں ہوتا۔ وہ شاعرہ ہے جس پر وہ مبارکباد کی مستحق ہے لیکن خود شاعری کرتی نہیں جس پر وہ مزید مبارکباد کی حق دار ہے۔



بابا جمہورا

بابا جمہورا کو میں بزرگ سیاست دان اس لیے نہیں کہتا کہ وہ خود بزرگ ہوں تو ہوں' اس کی سیاست میں ابھی لڑکپن ہے۔ اس وقت سے سیاست میں ہیں جب انھوں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سیاست میں نووارد ہیں۔ اتنے بڑے سیاست دان ہیں کہ اکیلے پارٹی میں پورے نہیں آ سکتے۔ سو دوسری پارٹیوں سے اشتراک کر کے اپنے رہنے کی جگہ بناتے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں اقلیتوں کا رہنما مانتے ہیں۔ ویسے ان کی پارٹی کے ممبروں کی تعداد دیکھ لیں تو آپ بھی مان جائیں گے۔

ہمارے ہاں آج کل اگر آپ اپنا شجرہ نسب اور سارا خاندانی کچا چٹھا معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی لائبریری میں جانے کی ضرورت نہیں' سیاست میں آ جائیں۔ مخالفین خود ہی بتا دیں گے کہ آپ کے دادا پڑدادا کیا کیا کرتے رہے۔ نوابزادہ صاحب نے سیاست کو عبادت بنا دیا ہے' جس سے یہ پتہ چلے نہ چلے کہ وہ سیاست کو کیا سمجھتے ہیں' یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ عبادت کو کیا سمجھتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی میں ان کی پیدائش کے علاوہ کوئی غیر سیاسی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ وہ تو صبح اٹھ کر ایک سیب بھی یوں کھاتے ہیں جیسے اپنی صحت کے لیے نہیں' جمہوریت کی صحت کے لیے کھا رہے ہوں۔ ان کی تو چھینک تک غیر سیاسی نہیں ہوتی۔ تشدد کے اس قدر خلاف کہ سکول میں ضرب سے کنی کتراتے۔ تقسیم تو کبھی کی ہی نہیں' البتہ جمع ایسی کرتے کہ حساب کا ماسٹر بے حساب داد دیتا۔ ذہین اتنے کہ جس روز ماسٹر شیو بڑھائے بغیر استری کے کپڑے پہن کر کلاس روم میں آتا' انہیں فوراً پتہ چل جاتا کہ آج ماسٹر صاحب اردو شاعری پڑھائیں گے۔ مزاج ایسا جمہوری کہ ایچی سن کالج میں کرکٹ کھیلتے وقت فیلڈنگ کے دوران اسی گیند کو پکڑنے بھاگتے' جس کی طرف سب سے زیادہ کھلاڑی بھاگتے۔

پیر پگاڑا نوابزادہ کو نابالغ سیاست دان کہتے ہیں۔ ان کے بقول نوابزادہ کا مطلب ہی نواب

کا لڑکا ہوتا ہے۔ اصغر خان فرماتے ہیں' نوابزادہ صاحب ۸۰ فیصد شاعری اور ۲۰ فیصد سیاست کرتے ہیں۔ انہوں نے سیاست اور اپنی شاعری کی کتاب کا نام "جمہوریت" رکھا۔ ایک صاحب سے کہا۔ "دیکھیں یہ نام ٹھیک ہے یا بدل دیں؟" اس نے ان کی شاعری پڑھ کر کہا۔ "نام تو ٹھیک ہے' شاعری بدل دیں۔"

حقہ اور نواب زادہ صاحب اس قدر لازم و ملزوم ہیں کہ دونوں کی شخصیت ٹوپی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ مادر ملت فاطمہ جناح نے ایک بار کہا تھا۔ "نوابزادہ نصر اللہ خان حقے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔" حالانکہ ان کے پاس حقہ نہ بھی ہو' تب بھی لگتا ہے کہ ہے۔ حقے کی "نے" میں منہ یوں دبائے ہوتے ہیں جیسے مخالف کی گردن۔ وہ حکم عدولی برداشت کر لیتے ہیں مگر حقہ عدولی نہیں۔ حقہ وہ ساتھی ہے جو اس وقت بولتا ہے جب آپ چاہتے ہیں۔ مارشل لاء کے دنوں میں جب کوئی نہیں بولتا' حقہ پھر بھی بولتا ہے۔ حقہ اجتماعیت کی علامت ہے اور سگریٹ الگ الگ کرنے کی۔ وہ سیاست کا حقہ ہیں جس کے گرد کئی پارٹیاں کش لگا رہی ہیں۔ ان کی پسندیدہ موسیقی تازہ حقے کی آواز ہے۔ وہ حقہ نہ بھی پی رہے ہوں' پھر بھی دھواں دیتے ہیں۔ سگار بھی پیتے ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سگار صرف پیئے ہی جا سکتے ہیں' کھائے جانے سے تو رہے۔

کھانے میں مچھلی پسند ہے۔ مچھلی اور سیاست دانوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ دونوں سانس لینے کے لیے منہ کھولتے ہیں۔ البتہ ایک مچھلی پورے جل کو گندا کر دیتی ہے مگر دو سیاستدان مل کر بھی یہ نہیں کر سکتے' البتہ نہ مل کر کر سکتے ہیں۔ جمہوریت کے لیے کوششیں کرنے والوں کو جو پھل ملتا ہے' وہ نواب صاحب کے باغ کے آم ہوتے ہیں جو عام نہیں ہیں۔ ہمیں تو آم میں یہی خوبی لگتی ہے کہ یہ کھایا بھی جا سکتا ہے اور پیا بھی۔ انہیں سنترہ بھی اچھا لگتا ہے مگر ہمیں تو یہ سنتری کا مذکر لگتا ہے۔

نوابزادہ صاحب کئی دہائیوں سے وہی کر رہے ہیں جس کی دہائی آج دے رہے ہیں' وہ ہے اتحاد بنانا۔ ہر حکومت کے خلاف اتحاد بناتے ہیں۔ جس حکومت کے خلاف اتحاد نہ بنائیں اس میں اتحاد نہیں رہتا۔ ان کا بنایا اتحاد اتنا پائیدار ہوتا ہے کہ اب تو لوگ

انہیں اپنے بچوں کی شادیوں پر بھی بلانے لگے ہیں تا کہ نومولود اتحاد اٹوٹ ہو۔ ان کی طبیعت خراب ہو ڈاکٹر کہتا ہے۔ "تین دن تک نہار منہ اتحاد بنائیں' انشاء اللہ افاقہ ہو گا۔" ہاتھوں اور دلوں کو جوڑتے رہتے ہیں۔ قوالی پسند ہے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ اس میں بہت سے لوگ اتحاد کرے یوں گاتے ہیں کہ کسی ایک کی آواز بھی صاف سنائی نہیں دیتی۔ قوالی بندہ فاصلے سے سنے تو بہت مزہ آتا ہے۔ یعنی اتنے فاصلے سے جہاں تک آواز نہ آتی ہو۔

سیاست کو انھوں نے کبھی دکان نہیں سمجھا۔ ویسے بھی سیاست میں دکان تو کیا' ایک کان کی بھی ضرورت نہیں۔ البتہ زبان چاہیے اور ان کی زبان ایسی ہے کہ اتنی ان کے منہ میں نہیں رہتی' جتنی صحافیوں کے کانوں میں رہتی ہے۔ ان کی تقریر بہرے بھی سمجھ جاتے ہیں کیونکہ اتنا منہ سے نہیں' جتنا ہاتھوں سے بولتے ہیں۔ ہر سوال کا جواب سوچ کر دیتے ہیں۔ نام تک پوچھیں تو سوچ میں پڑ جائیں گے۔ گفتگو کا ایسا انداز کہ بندہ بات سننے سے پہلے ہی کنونس ہو جائے۔ شاید کنونس ہونے کی وجہ بھی یہی ہو۔ ویسے ہم ایک ایسے سیاست دان کو جانتے ہیں جو روز کنونسنگ کے لیے نکلتے ہیں۔ کئی دنوں کے بعد آخر ان سے ایک خاتون کنونس ہو ہی گئیں۔ اب وہ ماشاء اللہ ان کے بچوں کی ماں ہے۔ نواب صاحب کی تقریر کا آغاز اور انجام تقریر کو دلکش بنا دیتا ہے۔ تقریر اور بھی دلکش بن سکتی ہے' بشرطیکہ اختتام آغاز سے پہلے کا ہو۔

وہ ان سیاست دانوں میں سے ہیں جو عوام کے نمائندہ نہیں' سیاست دانوں کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے سیاست دان جو کام سب سے زیادہ کرتے ہیں' وہ غور ہے۔ نواب صاحب پوزیشن بنا کر نہیں' اپوزیشن بنا کر خوش ہوتے ہیں۔

وہ پیدائشی حزب اختلاف ہیں۔ اب تو ان کی اس عادت کی وجہ سے یہ صورت حال ہے کہ اگر وہ کسی بات پر فوراً متفق ہو جائیں تو لوگ پریشان ہو جاتے ہیں کہ اللہ کرے ان کی طبیعت ٹھیک ہو۔ گھڑ سواری کرتے ہیں۔ اب بھی کرسی پر بیٹھے باتیں کرتے ہوئے دائیں ٹانگ سے کرسی کو ایڑ لگا رہے ہوتے ہیں۔ ٹانگ اس قدر پسند ہے کہ

کھانے میں مچھلی کا بھی لیگ پیس ہی مانگتے ہیں۔ مارک ٹوئن نے کہا۔ "صحت مند رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ کھاؤ جو آپ کو پسند نہیں' وہ پیو جو آپ نہیں چاہتے اور وہ کرو جو آپ ویسے کبھی نہ کرتے۔" اس حساب سے انہوں نے کبھی صحت مند رہنے کی کوشش نہیں کی۔ پرانی چیزیں دیکھنا پسند ہیں' اس لیے کمرے میں آئینہ ضرور رکھتے ہیں۔ اپنی چیزیں نہیں بدلتے۔ ان کا وہ برش جس سے شیو کرتے وقت صابن لگاتے ہیں' اتنا پرانا ہو گیا ہے کہ اس کے آدھے بال سفید ہو چکے ہیں۔ جمہوریت میں مارشل لاء کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ مارشل لاء میں جمہوریت کی راہ بناتے ہیں اور ہمیشہ راہ میں ہی رہتے ہیں۔ حکومت میں کبھی نہیں رہے کیونکہ کبھی عہدہ ان سے بڑا ہوتا ہے اور کبھی وہ عہدے سے بڑے نکلتے ہیں۔ مظفر گڑھ جو کبھی ان کا گڑھ تھا' اب ان کے لیے گڑھا بن گیا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے جنازے پر نہ گئے مگر غفار خان کے جنازے پر گئے' جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ سرحدی گاندھی غفار خان پر یہ یقین کرنے گئے تھے کہ واقعی سرحدی گاندھی غفار خان مر گئے ہیں۔

مزاج ایسا کہ سردیوں میں گرمیاں اور گرمیوں میں سردی چاہتے ہیں۔ صحافی ان کے پاس خبر لینے یوں جاتے ہیں جیسے ان کی خبر لینے جا رہے ہوں۔ بھینسیں پالنے کا شوق ہے۔ سنا ہے جو بھینس نہیں پالتے ہیں' وہ اچھے شوہر ثابت ہوتے ہیں۔ اس قدر وضع دار کہ جس جگہ ایک بار پاؤں پھسلا' جب بھی وہاں سے گزرے' پھسل کر ہی گزرے۔ ان کی پوری زندگی سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سیاست بچوں کا کھیل نہیں' بوڑھوں کا ہے۔

○○○

• گنجِ گراں مایہ

وہ ادب کے گنجے گراں مایہ میں سے ہے۔ اس کا سر اوپر سے خالی ہے حالانکہ ہمارے ہاں شعراء کا اندر سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے پاس سنوارنے کو بال نہیں تو کیا ہوا دھونے کو منہ تو بہت ہے۔

بات بات پر لطیفہ سناتا ہے جس دن محفل میں سنجیدہ ہو دوستوں کو اس کی صحت کی فکر ہونے لگتی ہے۔ لطیفہ سنانے سے پہلے ہی سننے والوں کو ہنسا لے گا کہ بعد میں کیا پتہ کوئی ہنسے یا نہ ہنسے' چپ رہنا اس کے لیے مشکل ہے حالانکہ یہ تو اتنا آسان ہے کہ اس کو زبان تک نہیں ہلانا پڑتی۔ امجد اسلام امجد بات کر رہا ہو تو کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ جب لحاظ کر رہا ہو تو بات نہیں کرتا۔ اس لیے اگر آپ سے بات نہ کرے تو سمجھ لیں' آپ کا لحاظ کر رہا ہے۔ برے کی بات سن لیتا ہے مگر بری بات نہیں سنتا۔ اگر بری بات سننا چاہے تو بولنے لگتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں بھی اس کے موسلا دھار بولنے کی وجہ سے استاد اسے اٹھا کر اسٹیج پر بٹھا دیتا۔ اب اتنا بڑا ہو گیا ہے مگر تقریبات میں آج بھی اسے اٹھا کر اسٹیج پر بٹھا دیتے ہیں اس کے بارے میں وہ لوگ بھی اچھی رائے رکھتے ہیں جو اسے ایک بار بھی نہیں ملے۔ شاید اچھی رائے کی وجہ بھی یہی ہو۔

باتوں باتوں میں خوبصورت عورتوں کو شیشے میں اتار لیتا ہے مگر خود ان کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ جرابیں ہی اتار سکتا ہے۔ عورتوں کو ملنے سے پہلے جہاں دوسرے بال' ٹائیاں اور چشمے ٹھیک کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ نیت ٹھیک کر رہا ہوتا ہے۔ اس نے جو چاہا وہ حاصل کیا بلکہ جو حاصل کیا وہی چاہا۔

امجد ہر کام میں اپنے بہن بھائیوں میں اول رہا۔ وہ تو پیدا ہونے کے معاملے میں بھی اول آیا۔ اس کا گھرانہ ایسا مذہبی کہ خواتین اردو شعروں سے بھی پردہ کرتیں' مگر

اس نے اسی کو ذریعہ عزت بنایا جسے غالب نے بھی ذریعہ اظہار ہی بنایا تھا۔ سارے کام اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ اس نے تو شادی بھی اپنی مرضی سے کی حالانکہ ہمارے ہاں بندے کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کا موقع اس وقت ملتا ہے جب وہ اپنی اولاد کی شادی کرتا ہے۔ ویسے ہمارے ہاں شادی کے بعد مرد خود کو اور عورت اپنی قمیضوں کو تنگ محسوس کرتی ہے' مگر امجد شادی شدہ ہو کر بھی گھر میں زیادہ رہتا ہے۔ جس سے یہی لگتا ہے کہ اسے شادی شدہ عورتیں بہت پسند ہیں۔

پہلے لمبرٹیا سکوٹر پر سوار پھرا کرتا تھا' جس پر سفر کرنا دراصل پیدل چلنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہی ہوتا تھا۔ وہ اور اس کا جڑواں دوست عطاء الحق قاسمی جہاں کوئی بارات دیکھتے اس میں شامل ہو جاتے جس سے کسی اور کو کوئی فرق پڑتا نہ پڑتا' بارات کے ساتھ آنے والے بھانڈوں کی آمدنی آدھی رہ جاتی۔ یہ دونوں دولہے کے پاس جا کر اسے کہتے اچھا موقع ہے اب بھی انکار کر دو۔ مگر امجد کی شادی ہوئی تو عطا نے کہا تھا' اچھا موقع ہے چپ کرکے بیٹھے رہو۔ اگرچہ اب دونوں عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں بری بات بری لگنے لگتی ہے مگر اب بھی جہاں یہ دونوں اکٹھے ہوں وہاں لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ وہ باتیں کرتے ہیں کہ سننے والا ٹین ایجر ہو تو اسے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرنا پڑتی ہیں۔

اخبار پڑھتا نہیں دیکھتا اور لوگوں کو دیکھتا نہیں پڑھتا ہے۔ ایک ہی ملاقات میں اس قدر بے تکلف ہو جاتا ہے کہ دوسرا گھبرانے لگتا ہے کہ کہیں قرض ہی نہ مانگ لے۔ دوسروں کی باتیں اس توجہ اور پیار سے سنتا ہے جیسے بچوں کی سن رہا ہو۔ سمجھتا بھی یہی ہے۔ کرکٹ پسند ہے۔ بہت اچھی باؤلنگ کراتا ہے جو مخالف ٹیم کے لیے بہت اچھی ہوتی ہے۔ محنت سے نہیں گھبراتا۔ بندہ اسے کنگھی کرتا دیکھ لے تو اسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے۔

ہمیشہ آٹو گراف بک پر لکھتا ہے۔ "جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے۔" اگر آٹو گراف لینے والی خاتون امید سے نہ ہو تو پھر بھی یہی لکھتا ہے۔ اس کا پسندیدہ رنگ بلیو ہے۔

یہ رنگ ہمیں بھی پسند ہے' بشرطیکہ فلم کا ہو۔

کھانا اس وقت ختم کرتا ہے جب کھانا ختم ہو جائے۔ اسے علم ہوتا ہے کہ لاہور میں اچھا کھانا کہاں سے ملتا ہے اور لوگ اس کے علم سے استفادہ کرتے ہیں۔ اسی لیے جب کوئی نیا ریستوران کھلتا ہے تو وہ اسے بتا کر سمجھتے ہیں کہ آدھے شہر کو بتا دیا۔ اسے کھلا کر بھی یہی سمجھتے ہیں' پیٹ بھر کر کھائے نہ کھائے پلیٹ بھر کر ضرور کھائے گا۔

امجد اسلام امجد پہلے مختصر تخلص کرتا تھا اور جب کسی مشاعرے میں پڑھتا' مختصر مختصر کی آوازیں آتیں۔ اب تو وہ امجد ہو گیا ہے۔ شاعری اور ڈرامے نے اسے عزت نہیں دی اس نے انہیں عزت دی ہے۔

اس کے اس قدر دوست ہیں کہ اسے پتا نہیں کون کون اس کا دوست ہے۔ دوستوں کی اس کے بارے میں بھی یہی رائے ہے۔ امجد ہر لحاظ سے ایک مکمل انسان ہے یعنی اس میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو انسان کو فرشتہ بننے سے روکے ہوئے ہیں۔

○○○

• عروس العلماء

دیکھنے میں ناصح' کہنے میں ناسخ۔ غصے میں نیازی اور اگر آپ غصے میں ہوں تو جنرل نیازی۔

حیات محمد خان کوثر نیازی کا پہلا ہاف میانوالی میں پیدا ہوا اور دوسرے نے لاہور میں جنم لیا۔ وہ میاں والی کے میاں بن سکے نہ والی اور لاہور تو ہے ہی لا...ہور مگر میاں والی کے حیات محمد لاہور کی کوثر بن گئے۔ اداکاراؤں کے لیے حوض کوثر اور علماء کے استفادے کے لیے خوض کوثر۔ حیاتی' حیات محمد کی مونث و مونس رہی۔ جماعت نے کوثر کو مولانا کے پیچھے لگایا اور مولانا کوثر نیازی بنا دیا۔ بچپن میں ایسی حرکتیں کرتا کہ دیکھنے والا کہہ اٹھتا۔ "وا حیات" کلاس میں ٹیچر سوال پوچھتا تو یہ سب سے پہلے ہاتھ کھڑا کرتے اور جب تک فارغ ہو کر آتے' سوال کا جواب دیا جا چکا ہوتا۔ بچپن ہی سے مذہب اور میٹھے سے لگاؤ تھا۔ ویسے اگر کوئی مولوی کہے' مجھے میٹھا ناپسند ہے تو سمجھ لیں یہ جھوٹ ہے۔ اگر وہ سچ بول رہا ہے تو پھر یہ جھوٹ ہے کہ وہ مولوی ہے۔ پڑھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پڑھانے لگو۔ سو یہ سکول ٹیچر ہو گئے۔ بچپن ہی سے بارش اور بارش بھاتی۔ حیات محمد کو "کوثر" رسالے نے نام دیا۔ Weekly "کوثر" نہ چلا مگر Weakly کوثر چل نکلے۔ پھر "شہاب" کے بانی ایڈیٹر ہوئے مگر شہاب آؤٹ ہونے سے ایک دن پہلے ہی آؤٹ ہو جاتے۔ شہاب ایسا پرچہ تھا جس پر پرچہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس رسالے کو پڑھنے کے لیے بڑا سمجھدار ہونا ضروری تھا۔ جو اس معیار پر پورا نہ اترتا' وہ اسے پڑھ تو نہ سکتا' اس میں لکھ سکتا تھا۔

وہ جیسے سیاستدان ہیں' ایسے ہی ادیب ہیں اور جیسے ادیب ہیں' ویسے ہی سیاست دان۔ ان لوگوں سے زیادہ عالم ہیں جو ان سے کم عالم ہیں۔ جتنا انہوں نے لکھا' ہمارے ہاں اتنا کاتب لکھتے ہیں۔ وہ صرف کاتب ہی سے ڈرتے ہیں کیونکہ کاتب تقدیر کے بعد کاتب تحریر ہی جنس بدل سکتا ہے۔ ایک بار کاتب نے انہیں نامزد امیدوار لکھا مگر "ز" کا نقطہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بڑی "نکاتی" ہوئی۔

انہوں نے تین درجن کتابیں لکھیں۔ ویسے بھی ان کی کتابیں اتنی بڑی بڑی ہوتی ہیں کہ آٹھ کتابوں میں ہی درجن پوری ہو جاتی ہے۔ ان کی کتابیں پڑھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے' خاص کر کے اس وقت جب وہ ختم ہوتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو پر لکھی ان کی کتاب "دیدہ ور" پر کسی نقاد نے کہا کہ آج ایسی کتابیں ایک سو دس روپے میں بک رہی ہیں' اچھے وقتوں میں اتنی قیمت میں ساتھ مصنف بھی خریدا جا سکتا تھا۔ صدیق سالک کی کتاب "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ اس کا نام "میں نے ڈھاکہ ڈبوتے دیکھا" ہونا چاہیے تھا۔ ایسے ہی مولانا کی کتاب "اور لائن کٹ گئی" کا نام ہونا چاہیے تھا "اور لائن کاٹ دی"

"زر گل" اور "لمحے" دو شعری مجموعے ہیں جن کے باہر لکھا ہوتا ہے کہ یہ شعری مجموعے ہیں تا کہ پڑھنے والے کو پتہ چل سکے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ ادبی تقریبات کے صدور والی ان میں تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں' یعنی سوتے ہوئے خراٹے نہیں لیتا۔ کوثر وہ شاعر ہیں جن کی وجہ سے ایک گھر میں طلاق ہو گئی۔ ایک میاں روز اپنی بیوی سے کہتے۔ "مجھے کوثر کا یہ شعر پسند ہے' وہ شعر پسند ہے۔" بیوی نے تنگ آ کر کہا۔ "اگر تمہیں کوثر اتنی ہی اچھی لگتی ہے تو اسے لے آؤ۔ میں چلی۔"

مولانا نے ساری عمر نثر بولی۔ سوانح عمری لکھنا چاہ رہے تھے۔ مغرب میں جو رائٹر فکشن لکھنا چاہے' وہ ناول یا افسانہ لکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کام کے لیے سوانح عمری لکھتے ہیں۔ ان کی صلاحیتیں دیکھ کر یہ نہیں لگتا کہ دریا کو کوزے میں سمیٹا گیا ہے' لگتا ہے کوزے کو دریا میں سمیٹا گیا ہے۔ کسی شاعر کا کلام سنائیں تو لگتا ہے' اپنا کلام سنا رہے ہیں اور اپنا کلام سنائیں تو لگتا ہے کسی اور کا سنا رہے ہیں۔

بول رہے ہوں تو ایک صحافی نہیں لگتے' دو لگتے ہیں۔ ایسے مقرر کہ لگتا ہے اسی کام کے لیے مقرر ہیں۔ وہ تو شعر بھی سنائیں تو لوگ مکرر نہیں کہتے' مقرر کہتے ہیں۔ جیسے کارٹونسٹ فیکا کارٹون بناتے بناتے اس مقام پر آ گیا ہے کہ یونہی لکیریں کھینچے تو کارٹون

بن جاتا ہے بلکہ بندہ تو اس کی تصویر کھینچے تو کارٹون بن جاتا ہے۔ ایسے ہی مولانا دیکھنے میں بھی آواز لگتے ہیں۔ چپ ہوں تب بھی سنائی دیتے ہیں۔ انہوں نے گلے کے زور پر سیاست کی۔ ان سے قبل غلے کے زور پر سیاست ہوتی۔ ویسے ہم نے آج تک جس کو متاثر کیا' خاموش رہ کر کیا اور دوسرا اس وقت تک متاثر رہا جب تک ہم خاموش رہے۔ یہ غلط ہے کہ مولانا جب بولتے ہیں تو سنتے نہیں۔ حالانکہ وہ تو بولتے ہی تب ہیں' جب سننا ہو۔ تقریر محبت کی طرح ہوتی ہے۔ اسے ہر بیوقوف شروع تو کر سکتا ہے مگر اختتام تک نہیں لے جا سکتا۔ کچھ ہی بیوقوف اختتام تک پہنچاتے ہیں۔ وہ برنارڈشا کی طرح فی البدیہہ مقرر ہیں اور برنارڈشا کہتا ہے' میں دنیا کے چند فی البدیہہ بولنے والے مقرروں میں سے ایک ہوں' کیونکہ میں نے فی البدیہہ بولنے کی ریہرسل کی ہوتی ہے۔ مولانا تو یہ بتانے میں آدھ گھنٹہ لگا دیں گے کہ بس ایک منٹ بولوں گا۔

دوسروں کے دکھ سکھ میں ایسے شریک ہوتے ہیں کہ آپ کی شادی پر یوں شاد ہوں گے کہ نئے آنے والے کو پوچھنا پڑے گا کہ شادی کس کی ہے۔ ایسے خطیب کہ جو کہتے ہیں' اس کی تصویر کھینچ کے رکھ دیتے ہیں۔ جہنم کا ذکر کر رہے ہوں تو لگتا ہے' آنکھوں دیکھا حال نشر کر رہے ہیں۔ ٹی وی پر مبلغ تین سو روپے میں مبلغ بنتے رہے۔

ہر پارٹی میں چلے جاتے ہیں' بشرطیکہ پارٹی کے منشور میں کھانا ہو۔ وہ اکیلے بھی کھا رہے ہوں تو لگتا ہے' پارٹی کھا رہی ہے۔ مغز بہت کھاتے ہیں۔ یوں ان کے پیٹ میں بھی مغز ہے۔ ایک بار ان کو کھاتا دیکھ کر کسی نے لکھ دیا کہ یوں کھاتے ہیں' جیسے پہلی بار کھا رہے ہوں۔ ویسے وہ اس کی دوا بھی لیتے رہے ہیں کہ کھانا کھانے سے بھوک نہیں لگتی۔ پوچھو "کھانوں میں زیادہ کیا پسند ہے؟" تو کہیں گے۔ "زیادہ کھانا پسند ہے۔" کھانے والی چیزوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑتے ہیں۔ کھانے کا اس قدر شوق کہ کسی کی بات پسند آئے تو کہیں گے۔ "بڑی لذیذ بات ہے۔"

جسے دور کرنا چاہیں' اس کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لوگ انہیں مولانا کوثر نیازی بھی کہتے ہیں۔ پیر پگاڑا صاحب نے کہا ہے۔ "مولانا کوثر نیازی اتنے ہی مولانا ہیں' جتنے ہم پیر

ہیں اور ہم اتنے ہی پیر ہیں جتنے وہ مولانا ہیں۔" وہ سیاست میں بعد میں آئے' پہلے ان میں سیاست آئی۔ ان میں اتنی انٹیلی جنس ہے' جتنی انٹیلی جنس والوں میں ہوتی ہے۔

شورش کاشمیری کے بقول "بھٹو کی مردم شناسی دیکھئے' اطلاعات بہم پہنچانے والے کو انہوں نے مشیر اطلاعات بنا دیا۔"

تاریخ کا علم رکھتے ہیں۔ ہم تو تاریخ کا علم اس لیے نہیں رکھتے کہ وہ بڑی جلدی بدلتی ہے۔ آج دس تاریخ ہے تو کل گیارہ ہو گی۔ مولانا تاریخ ساز شخصیت ہیں۔ چاہیں تو رانی جھانسی کو رانی جھانسہ بنا دیں۔ ذہین و فتین مولانا کے کلام میں بڑی فسادت و بلوغت ہے۔ فطرت پسند ہے۔ جی ہاں' اپنی فطرت پسند ہے۔ انہوں نے ڈبل لائف گزاری۔ ویسے تو ہمارے ہاں اکثر لوگ ڈبل لائف ہی گزارتے ہیں۔ ایک اپنی اور ایک اپنی بیوی کی۔

فلمی سنسر بورڈ میں تھے کہ کوئی سین سنسر کرنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے یقین کر لیتے کہ یہ سین فحش ہے اور اس وقت تک سین بار بار دیکھتے جب تک یقین نہ ہو جاتا کہ سین فحش ہے' لیکن اس قدر باحیا کہ اس سین کو ساتویں بار دیکھ کر بھی ان کے کان اتنے ہی سرخ ہوتے' جتنے پہلی بار دیکھ کر ہوتے۔ ان دنوں اداکاراؤں کے ساتھ جتنی ان کی تصویریں چھپتیں' اتنی تو ان اداکاراؤں کی اپنے خاوندوں کے ساتھ نہ چھپی ہوں گی۔ تصویروں میں اکثر اداکارائیں ان کا سانس روکے کھڑی ہوتیں۔

اسلام سے اس قدر محبت ہے کہ ہر کام اسلام کو آباد دیکھنے بلکہ اسلام آباد کو دیکھنے کے لیے کیا۔ یہ علم کا وہ چشمہ ہیں جس میں حکمران غرارے کرتے رہے۔ غرارے انہیں بھی پسند ہیں' بشرطیکہ پہننے والے پسند کے ہوں۔ مہمان اچھے ہیں اور اچھا مہمان وہ ہوتا ہے جو میزبان سے کہے کہ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ بھٹو دور میں ڈاکٹر نے میٹھے سے منع کیا تو خوشی کے موقع پر یہ کہنے کی بجائے کہ منہ میٹھا کرواؤ' کہا کرتے۔ "منہ کڑوا کرواؤ۔"

بغیر سوچے سمجھے بات نہیں کرتے۔ کیونکہ بغیر سوچے سمجھے بات کرنے سے بعد میں پریشانی ہوتی ہے' حالانکہ سوچ سمجھ کر بات کرنے سے پہلے پریشانی ہوتی ہے۔ زندگی میں پہلی بار جو کتاب لائبریری سے پڑھی' وہ سکھوں کے گرو نانک کے بارے میں تھی۔ اس سے بہت متاثر ہیں مگر جب تک غصے میں نہ ہوں' اس کا پتہ نہیں چلنے دیتے۔ ان کی ذاتی لائبریری اتنی بڑی ہے کہ وہاں کتاب ڈھونڈنے میں اتنی ہی دیر لگتی ہے جتنی پورے لاہور سے ڈھونڈنے میں لگتی ہے۔ کہتے ہیں' میں صرف معیاری کتابیں پڑھتا ہوں۔ ٹھیک کہتے ہیں ہم نے کبھی انہیں اپنی لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے نہیں دیکھا۔ ۱۹۷۰ء میں جیل ہی میں قومی اسمبلی کے ممبر چنے گئے تو کسی سے کہا۔ "دیکھا' حالانکہ میں بند تھا اور لوگوں سے مل نہ سکتا تھا۔" تو سننے والے نے کہا۔ "اسی لیے تو جیت گئے۔"

میاں طفیل محمد کے طفیل پتہ چلا کہ جب کوثر نیازی جماعت اسلامی میں تھے تو ایوب خان کے ساتھ تھے۔ جب ایوب خان کے پاس تھے تو بھٹو کے ساتھ تھے اور جب بھٹو کے ساتھ تھے تو پتہ نہیں اندر سے کس کے ساتھ تھے۔ بہرحال مولانا وہ شخص ہیں جو ان پر پہلی بار بھی یقین کر رہا ہوتا ہے' وہ بھی دراصل آخری بار کر رہا ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں' مولانا کوثر نیازی نے کسی سے بیوفائی نہیں کی ہے۔ انہوں نے صرف ایک شخص سے بیوفائی کی ہے اور اس کا نام ہے ------- "مولانا کوثر نیازی"

○○○

• وزیر جنگ

اطہر مسعود ان لوگوں میں سے ہیں جن سے پہلی ملاقات میں ہی آپ کو محبت ہو جاتی ہے جسے کم کرنے کے لئے ان سے کئی بار ملنا پڑتا ہے۔ ایسی شکل و صورت والے بندے کا سکینڈل نہ ہونا اس کے لئے بڑی رسوائی کی بات ہے۔ وہ صحافی ہیں اور صحافی سے تو بندہ شرط بھی یہ لگاتا ہے کہ اگر میں ہار گیا تو تمہیں سات دن تک کھانا کھلاؤں گا اور اگر تم ہار گئے تو تم سات دن تک اپنے گھر سے کھانا کھاؤ گے لیکن روزنامہ جنگ کے ایگزیکٹو ایڈیٹر اطہر مسعود صاحب جس گھرانے سے ہیں' وہاں کا ماحول اتنا ادبی و علمی تھا کہ بچے کا بڑے ہو کر صحافی بننے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بچپن میں ہر کسی میں بڑی بڑی خوبیاں ہوتی ہیں۔ جو اس وقت تک رہتی ہیں جب تک وہ بڑا نہ ہو جائے۔ ویسے آج کل اگر کوئی بچہ بات بات پر لڑے' دوسرے کو گالی اور الزام دے' مائیک دیکھتے ہی اسے چھیننے کو دوڑے تو محلہ والوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بڑا ہو کر ضرور ایم پی اے یا ایم این اے بنے گا۔ اطہر صاحب بچپن میں اتنے تیز تھے کہ ایک دفعہ سیڑھی کے اوپر والے ڈنڈے پر کھڑے تھے کہ ان کے ہاتھ سے چونی گر پڑی۔ جب یہ نیچے اترے تو چونی ان کے سر پر آ گری۔ ان کے والد چاہتے تھے ملک کی تعمیر میں حصہ لیں' شاید اسی لئے وہ انہیں انجینئر بنانا چاہتے تھے کیونکہ آج کل انجینئر ہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ تعمیر میں حصہ لے رہے ہیں۔ ٹیچر انہیں کلاس سے نکال دیتا کہ تم جاؤ' تمہیں تو پہلے ہی سب آتا ہے۔ انہوں نے روزنامہ جنگ میں دس سالوں میں پندرہ سال کام کیا۔

ان کے اتنا بڑا جرنلسٹ بننے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ ایم اے جرنلزم نہیں ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں جرنلزم میں ان کی عزت بڑے بھائی اطہر سہیل کی وجہ سے ہے۔ ان کا تو پتہ نہیں محلے میں ہماری عزت اپنے چھوٹے بھائی کی وجہ سے ہے۔ محلے والے

اس کی حرکتوں سے اتنا تنگ ہیں کہ اب ہمیں اچھا سمجھنے لگے ہیں۔ اخبار کے لئے اطہر صاحب نے جو سب سے پہلی تحریر لکھی' وہ استعفیٰ تھا جو انہوں نے "چٹان" کے لئے لکھا۔ ان دنوں کسی سے "چٹان" کا مطلب پوچھا تو جواب ملتا "شورش کاشمیری" ------

اطہر مسعود صاحب نے شورش مرحوم سے یہ سیکھا کہ کیا نہیں لکھنا چاہیے۔ کیا لکھنا چاہیے' یہ قمر اجنالوی صاحب سے سیکھا۔ اجنالوی صاحب اس معاملے میں اتنے سخت تھے کہ اگر کوئی غلطی کرتا تو اسے اپنا پورا ناول پڑھواتے۔ اطہر صاحب نے رپورٹنگ مصر اور اسرائیل کی جنگ کی خبریں سن کر شروع کی اور آج وہ جس مقام پر ہیں' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگوں کے کتنے دور رس نتائج نکلتے ہیں۔ وہ امن پسند نہیں "جنگ پسند" ہیں۔ انہیں جنگ اچھی نہیں لگتی' جنگ اچھا لگتا ہے۔ اس کی ترقی پر وہ جامے بلکہ پاجامے میں پھولے نہیں سماتے۔ ہم نے ایک دوست سے ان کے لباس کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا "پہن لیتے ہیں" ویسے موسم کے حساب سے لباس پہنتے ہیں یعنی گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد۔ گرمیوں میں تھری پیس سوٹ انہیں سوٹ کرتا ہے۔ مصطفیٰ کھر صاحب کو تو اس موسم میں ہم نے فور پیس میں دیکھا ہے۔ جی ہاں تھری پیس میں وہ ملبوس ہوتے ہیں اور ایک پیس ساتھ ہوتا۔ اطہر صاحب کا لباس صحافیانہ نہیں ہوتا۔ ہمارے ایک جاننے والے درزی نے بتایا کہ صحافی سوٹ وہ ہوتا ہے جس میں جیب نہیں ہوتی' وہ اس لئے کہ انہوں نے کونسا اپنی جیب میں کبھی ہاتھ ڈالنا ہوتا ہے۔

اطہر مسعود صاحب کا مشغلہ گلے کے لئے ٹائیاں جمع کرنا ہے۔ پرانی ٹائیوں کو یہ کہہ کر دوسرے کو دے دیتے ہیں کہ یہ مجھے تنگ ہو گئی ہے۔ انہیں آٹھ دس ہزار شعر یاد ہیں مگر شرافت دیکھیے کہ کسی اکیلے بندے کو دیکھ کر "شعر گوئی" کے لئے بڑھتے۔ ایسی میٹھی شخصیت کہ روز ملنے پر ذیابیطس ہونے کا ڈر رہتا ہے۔ طبیعت ایسی ہے جیسی ہماری ہے اور ہماری طبیعت ایسی ہے کہ نیلی چھتری والے سے اس لئے "نیلی" نہیں مانگتے کہ پھر اس کے پاس صرف "چھتری" ہی رہ جائے گی۔ شروع میں جس کے ساتھ

زیادتی کرتے‘ بعد میں اس سے معافی مانگ لیتے۔ سو جس کی بے عزتی کرتے‘ رج کے کرتے اس لئے کہ بعد میں معافی تو مانگ ہی لینا ہے۔ پھر وہ وقت آیا کہ سارا دن پچھلے دن کی معافیاں مانگتے رہتے۔ نئی بے عزتی کرنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ تب سے غصے میں آ کر انہوں نے دوسروں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیا ہے۔ اب جسے بے عزت کرنا ہو‘ اس کی زیادہ عزت کرنے لگتے ہیں۔ ریسلنگ دیکھنے کا شوق ہے‘ اس کے لئے اکثر ٹی وی پر کشتیاں دیکھتے ہیں۔ کبھی کبھی اسمبلی میں بھی چلے جاتے ہیں۔ یہ ان لوگوں سے زیادہ اچھے ہیں جو ان سے کم اچھے ہیں۔ لکھنے والے صحافی نہیں‘ پڑھنے والے صحافی ہیں۔ ڈائجسٹ تو منٹوں میں ڈائجسٹ کر جاتے ہیں۔

سرخی لگانے کے فن میں ماہر ہیں۔ اس کے انہیں کئی طریقے آتے ہیں۔ ہمیں تو بس ایک ہی طریقہ آتا ہے‘ وہ ہے سرخی ہونٹوں پر مل لی جائے۔ دفتر آ کر سٹاف سے یوں محبت سے ملتے ہیں کہ ان کو شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں اطہر صاحب کو نوکری سے نکال تو نہیں دیا گیا۔ زمانہ بدلا‘ پہلے بلی راستہ کاٹ جاتی تو لوگ پلٹ آتے۔ اب ٹی اینڈ ٹی والے راستہ کاٹ جائیں تو لوگ واپس پلٹ آتے ہیں۔ بڑے لوگوں کو مرنے کے بعد عزت ملتی ہے اس لئے جسے مرنے سے پہلے عزت مل جائے اس کا بڑا ہونا مشکوک ہو جاتا ہے۔ ہمارے ادیب شاعر تو عزت حاصل کرنے کے لئے یہ تک کرنے کو تیار ہیں کہ کچھ دنوں کے لئے مر کے ہی دیکھ لیں۔ بہرحال حکومت نے اطہر مسعود صاحب کو زندگی میں ہی عزت دی اور تمغہ برائے حسن کارکردگی دیا۔ اللہ نے انہیں پہلے ہی تمغہ حسن برائے کارکردگی دے رکھا ہے۔ اطہر مسعود ان صحافیوں میں سے ہیں جن کے لئے عزت کا باعث یہ ہے کہ حکومت اور لوگوں نے انہیں پہچانا جبکہ ہمارے بیشتر صحافیوں کی عزت اسی وجہ سے ہے کہ لوگوں نے ابھی تک انہیں پہچانا نہیں۔

○○○

• اصغر اعظم

یہ وہ زمانہ تھا جب جموں اور سری نگر میں تعلیمی سہولتیں اتنی تھیں کہ ایک طالب علم نے کہا۔ "میں اس وقت چوتھی جماعت میں تھا جب میں نے پہلی مرتبہ سکول ٹیچر دیکھا۔" ان دنوں وہاں ایک ہیڈ ماسٹر اپنی کلاس کے بچوں کو تقریر کرنا سکھا رہا تھا۔ ہر بچے کو بتاتا کس طرح بولنا ہے۔ ایک بچہ آیا تو ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "تم صرف یہ سیکھو کہ چپ کیسے ہونا ہے؟" یہ بچہ بڑا ہو کر پاک فضائیہ کا پہلا اور دنیا کا سب سے کم عمر کمانڈر انچیف بنا۔ پوری قوم نے اسے "شاہین" کہا مگر حنیف رامے نہ کہتے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولے۔ "میں جب انہیں شاہین کہہ کر بلاؤں' لوگ سمجھتے ہیں میں اپنی پہلی بیوی کو بلا رہا ہوں۔"

دیکھنے میں اپنے بیٹے عمر اصغر خان پر گئے ہیں۔ بچپن ہی سے ان میں سیاست دانوں والی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اگر کلاس میں کامیاب نہ ہوتے تو گھر والوں کو یہ نہ کہتے کہ میں ناکام ہوا ہوں' کہتے دھاندلی ہوئی ہے۔ والد اس قدر سخت تھے کہ انہیں لگتا' میں گھر میں نہیں' سکول میں پیدا ہوا ہوں۔ آدمی انہیں الٹا ہو کر دیکھے تو سیدھے سادے آدمی ہیں۔ وطن کا دفاع کر کر کے اب یہ حال ہو گیا ہے کہ دوران گفتگو بھی دفاعی پوزیشن میں رہتے ہیں۔ کسی سے پانچ روپے بھی وصول کرنے ہوں تو ضرور کریں گے' چاہے وصول کرنے میں سو روپے لگ جائیں۔ اس قدر ذمہ دار کہ اگر انہوں نے آپ کو نیند کی گولی کھلانا ہو تو وقت پر کھلائیں گے' چاہے اس کے لیے انہیں آپ کو سوتے میں اٹھانا پڑے۔ جو غلطی ایک بار کی' پھر اسے کبھی نہیں دہرایا۔ ہمیشہ نئی غلطی کی۔

عمر اور ارادہ پختہ' البتہ عمر کا پوچھو تو عمر اصغر خان کا بتانے لگتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے ہاں سیاست کا یہ حال ہے کہ لیڈر عوام کے حال کے بجائے ان کے ماضی کو ہی بہتر بناتے ہیں۔ وہ بھی ایسے کہ عوام کا وہ حال کرتے ہیں کہ اسے ماضی بہتر لگنے لگتا

ہے۔
اصغر خان کہتے ہیں۔ "سیاست میں میرا آنا ایک حادثہ ہے۔" سیاست کو یہ حادثہ ۱۹۶۸ء میں پیش آیا۔ بھٹو صاحب نے کہا تھا۔ "ایوبی دور میں میری نظر بندی نے دو شخصیتوں کو لیڈر بنایا' ایک بیگم نصرت بھٹو تھی اور دوسرے بے غم اصغر۔" خان صاحب نے سکول میں اتنی بار اے بی سی ختم نہ کی ہو گی جتنی سیاسی اتحاد بنا بنا کر کی۔ مثلاً جے بی' ٹی آئی' پی این اے' ایم آر ڈی اور پی ڈی اے وغیرہ وغیرہ۔ وہ فاتح سیاست ہیں۔ اندرون ملک ان کا دورہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کے دورے کا سنتے ہی حکومت ایمبولینس روانہ کر دیتی ہے۔

جب فوج میں تھے تو ہمیشہ خطرناک کام سب سے پہلے خود کرتے' پھر جونیئرز کو اس کی اجازت دیتے۔ یہاں تک کہ شادی بھی پہلے خود کی۔ ہوائی اور ہوائی جہاز اڑانے کے ماہر ہیں۔ کہتے ہیں جب میں ائیر مارشل تھا تو کبھی کسی نے یہ شکایت نہ کی کہ چھلانگ لگاتے ہوئے اس کا پیرا شوٹ نہیں کھلا۔ پی آئی اے میں آئے تو اسے اتنا آرگنائز کیا کہ ہر کام کے لیے الگ سٹاف رکھا۔ یہاں تک کہ مسافروں کی خدمات کرنے کے لیے الگ عملہ ہوتا اور نہ کرنے کے لیے الگ۔ خان صاحب آج کل بھی Plan کو Plane سمجھتے ہیں۔ ڈرائیور ایسے کہ ان کی گاڑی کے آگے آنے والے کو اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنا پیچھے آنے والے کو۔

عمر اصغر خان دراصل کم عمر اصغر خان ہیں۔ اس لیے معمر اصغر خان صرف نو عمر اصغر خان کے مشورے پر ہی عمل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میری پارٹی اکیلی ہی پی پی کو ہرا سکتی ہے اور ۱۹۹۰ء میں انہوں نے اکیلے پی پی سے اتحاد کر کے اسے ہرا کے دکھا دیا۔ واحد سیاستدان ہیں جو مقابلہ میں بھی کھڑے ہوں تو ہار جائیں۔ جتنی محنت سے وہ ہارتے ہیں' اس سے کم محنت میں بندہ جیت سکتا ہے۔ ان کا حلقہ انتخاب ہمیشہ ہلکا انتخاب رہا۔ ہر الیکشن پر وعدہ کرتے ہیں کہ الیکشن کے بعد اس حلقے کو بدل کر رکھ دیں گے۔ واقعی الیکشن کے بعد اس حلقے کو بدل کر کسی اور جگہ سے الیکشن لڑتے ہیں۔ صرف چار

بار الیکشن ہارے۔ جس کی ایک وجہ تو یہ رہی کہ وہ صرف چار بار ہی الیکشن کے لیے کھڑے ہوئے۔ ہار تو انہیں اس قدر پسند ہے کہ کوئی کسی اور کے لیے لایا ہو تو بھی وہ اپنی گردن آگے کر دیتے ہیں۔ بقول پیر پگاڑا "انہیں ہمیشہ کرسی ملی مگر اپنے گھر کے لاؤنج میں۔" یہ وہ ہوا باز ہیں جنہوں نے تمام حادثے ہائی وے پر کیے۔ وہ بھی یوں کہ لوگ ہائی وے کی بجائے "ہائے وے" کہہ اٹھے۔ وہ اسی سیاسی پارٹی کے سربراہ ہیں جسے ووٹ لینے کے لیے ہی کیمپین نہیں چلانا پڑتی' امیدوار لینے کے لیے بھی یہی کچھ کہنا پڑتا ہے۔

ونسٹن چرچل نے کہا تھا۔ "سیاست اور جنگ دونوں ایک جیسی خطرناک ہوتی ہیں' البتہ جنگ میں آپ صرف ایک بار مارے جاتے ہیں لیکن سیاست میں بار بار۔" اور اگر سیاست دان خان صاحب جیسا ہو تو ہر بار۔ اگرچہ ان کا دبدبہ اب دب دبا گیا ہے مگر پھر بھی ہر بات پر کہتے ہیں۔ "میری نہ مانی گئی تو اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔" اور بقول شفیق الرحمٰن یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اس کے لیے صرف دو اینٹیں ہی تو چاہییے ہوتی ہیں۔ فرماتے ہیں۔ "ہم ملک میں امن و امان قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس نے ہمیں روکنے کی کوشش کی' ہم اسے کچل دیں گے۔" لوگ کہتے ہیں۔ "اصغر خان صاحب تاریخ کو دہراتے ہیں مگر اس سے سبق نہیں سیکھتے۔" حالانکہ وہ تو اس مقام پر ہیں کہ تاریخ کو خود ان سے سبق سیکھنا چاہییے۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب محبت سے خان صاحب کو ایسے نام سے پکارتے جس سے بھٹو صاحب کی خان صاحب سے اتنی محبت ظاہر نہیں ہوتی' جتنی سبزیوں سے۔ ویسے تو محبت اور روزنامہ "جنگ" میں سب جائز ہوتا ہے۔

اصغر خان صاحب دوسروں کی خامیوں کی اس قدر دلجمعی سے اصلاح کرتے ہیں کہ بعد میں پتہ چلتا ہے' موصوف ساتھ خوبیوں کی بھی اصلاح کر گئے ہیں۔ کہتے ہیں۔ "ہر مصیبت کا سامنا مسکرا کر کرتا ہوں۔" یہ بات انہوں نے بیگم مہناز رفیع کے سامنے کہی۔ انہیں اپنی پارٹی کے ہر کارکن کا نام آتا ہے' لیکن اس کی وجہ ان کا حافظہ نہیں'

کارکنوں کی تعداد ہے۔ خان صاحب میں اس قدر استقلال ہے کہ آج بھی وہیں ہیں' جہاں بیس سال پہلے تھے۔ انہوں نے تحریک استقلال کو یوں چلایا جیسے کوئی ہیڈ ماسٹر کمیٹی

کا سکول چلاتا ہے۔

ایک بار انہوں نے تقریر میں اپنی زندگی کی کہانی ان لفظوں میں سمیٹی۔ "میں وطن کا سپاہی تھا' وطن کا سپاہی ہوں اور وطن کا سپاہی رہوں گا۔" تو پیچھے سے آواز آئی۔ "ترقی نہ کرنا۔" اس کے باوجود وہ جس امیدوار کو چاہیں الیکشن میں جتوا سکتے ہیں۔ انہیں بس اتنا ہی کرنا پڑتا ہے کہ اس امیدوار کے خلاف خود کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ویسے ایک تجزیہ نگار کے خیال میں وہ خود بھی الیکشن جیت سکتے ہیں۔ بس انہیں یہ کرنا ہو گا کہ وہ اس حلقے سے الیکشن لڑیں جہاں سے اصغر خان الیکشن لڑ رہا ہو۔



• مولانا دستار نیازی

۱۹۳۶ء میں پنجاب یونیورسٹی ہال میں ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ "جناح کو معزول کیا جائے۔" ہال سے پاٹ دار آواز ابھری اور سب آوازوں پر چھا گئی۔ "بد بختو! ہم یہ تسلیم نہیں کرتے۔"

یہ آواز آج بھی ہماری سیاست میں اتنی ہی بلند ہے۔ کم از کم "بد بختو" تو آج بھی اتنے ہی زور سے کہتی ہے۔ اسے آج ہم مولانا دستار نیازی کے نام سے پہچانتے ہیں۔ ان کو دور سے دیکھو تو جو چیز سب سے پہلے نظر آتی ہے' وہ ان کی دستار ہی ہے۔ جس کا طرہ جیسے ان کے سر پر پچاس برسوں سے کھڑا ہے' ایسے تو ہماری سیاست میں کوئی لیڈر پچاس ماہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ مولانا جب نوجوان تھے تو ۹ جون تھے۔ اب ان کا بڑھاپا جوانی پہ ہے مگر آج بھی ایسا دبدبہ کہ کوئی کہے کہ میں نے انہیں دبایا ہے تو یقین کر لیں' اس نے ان کی ٹانگوں کو دبایا ہو گا۔ سیاست میں کبھی ڈنڈی نہیں ماری' ہمیشہ ڈنڈا مارا ہے۔ وہ داڑھی' آنکھیں' ڈنڈا اور سینہ نکال کر چلتے ہیں اور کسی کی نہیں چلنے دیتے۔ ان کے سامنے اگر کسی کی چل رہی ہوتی ہے تو وہ سانس ہی ہوتی ہے۔ غصے میں ایسے ہی نظر آتے ہیں جیسے تصویر میں دکھتے ہیں۔ بغیر داڑھی اور غصے کے ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔

میاں والی کے میاں ہیں۔ ایسے گھر میں پیدا ہوئے جہاں بندہ ایک رات بسر کر لے تو یہی سمجھتا ہے رات مسجد میں ٹھہرا تھا۔ وہ تو تب بھی مولانا تھے' جب ابھی ان کی داڑھی نہ تھی۔ مولویوں کی طرح سوچتے مگر کہتے نیازیوں کی طرح ہیں۔ یعنی زبان سے سوچتے اور ہاتھ سے کہتے ہیں۔ بچپن میں سکول میں مانیٹر تھے اور ساری کلاس کے لڑکوں کو نماز پڑھانے لے کر جاتے اور خود ڈنڈا پکڑ کر انہیں دیکھتے رہتے کہ کوئی آدھی نماز پڑھ کر تو نہیں کھسک رہا۔ کلاس نہ رہی مگر وہ ہمیشہ مانیٹر رہے۔ آج بھی گفتگو میں

ان کے پاس جو سب سے وزنی دلیل ہوتی ہے' وہ ان کے دائیں ہاتھ نے تھامی ہوتی ہے۔ دوسرے سے جس لہجے میں بات کرتے ہیں' اس سے پتہ چلے نہ چلے کہ وہ دوسرے کو کیا سمجھتے ہیں' یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ دوسروں کو بہرہ سمجھتے ہیں۔ ایک بندے سے بھی بات کر رہے ہوں تو لگتا ہے عالم اسلام سے مخاطب ہیں۔

وہ واحد سیاست دان ہیں جو ابھی تک واحد ہیں۔ ان سے پوچھو۔ "حضرت ذرا عمر بتائیں۔" تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا بتانے لگیں گے۔ ویسے بھی ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو ان کی شادی بھی نہیں ہوئی۔ آج تک جتنی دعائیں مولانا کی شادی کے لیے مانگی گئی ہیں' شاید ہی کسی اور کے لیے کی گئی ہوں۔ مسجدوں' عید گاہوں اور گھروں میں ہر زبان پر یہی خواہش ہوتی ہے۔ یہی نہیں ہر پاکستانی حکومت یہی وعدہ کر کے بر سر اقتدار آتی ہے کیونکہ مولانا نے اعلان کیا ہے کہ اس وقت تک شادی نہ کروں گا' جب تک ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ نہ ہو جائے۔ اس سے قبل اداکارہ شمیم آراء نے اعلان کیا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گی جو کشمیر فتح کرے گا۔ جس سے ہمیں ابھی تک کشمیر فتح نہ کرنے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ ہو سکتا ہے پاکستان کی ہر بر سر اقتدار حکومت دراصل مولانا کی شادی میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے اسلام نافذ نہ کرتی ہو۔ مولانا عورت کی حکمرانی کے حق میں نہیں' اگر ہوتے تو شادی شدہ ہوتے۔ فرماتے ہیں۔ "میری بیوی نہیں' اس لیے سارا وقت سیاست کو دیتا ہوں۔" فخر امام صاحب کہتے ہیں۔ "میری بیوی ہے' اس لیے سارا وقت سیاست کو دیتا ہوں۔" مولانا نے سیاست کو بیوی کا وقت ہی نہیں' مقام بھی دیا ہے۔

فرانس کے مثالی سیاست دان رابرٹ شوماں عمر بھر کنوارے رہے۔ ایک صحافی نے وجہ پوچھی تو بولے۔ "میں ساری عمر مثالی بیوی کی تلاش میں رہا۔" صحافی نے پوچھا۔ "وہ ملی؟" کہا۔ "ہاں ملی' مگر وہ خود مثالی خاوند کی تلاش میں تھی۔"

کنوارہ بندہ وہ ہوتا ہے جسے پتہ ہوتا ہے کہ اس کی مہینے کی تنخواہ کہاں جاتی ہے۔ مولانا کا یہ مسئلہ بھی نہیں۔ انہوں نے تن کو جن آلائشوں سے پاک رکھا' ان میں تن...خواہ

بھی ہے۔ اگرچہ امارت ایسی چیز ہے جسے ہم خود بڑی مشکل سے برداشت کرتے ہیں۔
جی ہاں' دوسرے کی امارت۔ ویسے بھی غریب ایسی چیز ہے جس پر تمام سیاست دان فخر کرتے ہیں اور اس وقت تک فخر کرتے ہیں جب تک وہ خود غریب نہیں ہوتے۔ مگر مولانا دولت کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں اور انہیں میلے ہاتھ پسند نہیں۔
سنا ہے دنیا میں سب احمق نہیں ہوتے' کچھ کنوارے بھی ہوتے ہیں۔ مولانا تو مجرد ملت ہیں۔ سنا ہے مولانا دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے۔ ویسے ہمارا خیال ہے بیوی سے ڈرتے ہیں۔ اگر نہ ڈرتے ہوتے تو شادی شدہ ہوتے۔ ایک صحافی نے کہا۔ "آپ ہمارے دادا کی جگہ ہیں' اب شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" کہا۔ "اسی لیے نہیں کرتا کہ دادی سے شادی کرتا کون اچھا لگتا ہے۔"
مولانا نوجوانی میں منہ پر اختلاف کرتے اور کبھی کبھی اختلاف اتنا گہرا ہوتا کہ ڈاکٹر کو اس کی گہرائی کم کرنے کے لیے پٹی کرنا پڑتی۔ ویسے تو اب بھی وہ اس عمر میں ہیں جس میں ہمارے ہاں بات سننے کے لیے آلہ سماعت اور سنانے کے لیے ڈنڈا استعمال ہوتا ہے۔ انہیں لٹھ اور لٹھا پسند ہے۔ ۱۹۵۵ء میں گورنر جنرل غلام محمد کو چڑیوں کا مغز کھلانے کے لیے لکھنؤ سے جو پچانوے سالہ حکیم آئے' ان کے ساتھ جوان بیوی تھی جس کی گود میں بچی تھی' جسے حکیم صاحب اپنے نسخوں کے تیر بہدف ہونے کے ثبوت کے طور پر ساتھ ساتھ رکھتے۔ مولانا اسی مقصد کے لیے ڈنڈا ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ تو پریس کانفرنس میں بھی یوں آتے ہیں جیسے سکول ماسٹر ڈنڈا لے کر کلاس میں آتا ہے۔
مولانا نیازی جوانی میں بیک وقت تین آدمیوں سے کشتی لڑ سکتے تھے۔ ویسے تو نیازی ایسے ہوتے ہیں کہ جنرل نیازی اس بڑھاپے میں بھی بیک وقت تین آدمیوں سے کشتی ہار سکتے ہیں۔ مولانا ایسی بڑی شخصیت ہیں کہ کھانے کی میز پر موجود ہوں تو ان کے لیے واحد حاضر کی بجائے جمع حاضر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ لوگوں کا سر بھاری ہو تو اسپرین کھاتے ہیں' ان کا سر بھاری ہو تو غصہ کھاتے ہیں۔ ہر کام اسلام کے لیے کرتے ہیں۔

وہ تو ناشتہ بھی اپنے لیے نہیں اسلام کے لیے کرتے ہیں۔ جو بات صحیح سمجھتے ہیں' کہہ دیتے ہیں اور جو بات کہہ دیتے ہیں' اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ درست بات یوں کرتے ہیں کہ درشت بات لگتی ہے۔ جانتے ہیں سچ کڑوا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی جو بات دوسروں کو جتنی کڑوی لگے' سمجھتے ہیں اتنی سچی ہے۔ کوئی کام آرام سے نہیں کرتے۔ وہ تو آرام سے آرام بھی نہیں کرتے۔ ہم نے آج تک انہیں تھکا ہوا نہیں دیکھا۔ اگر آپ کو کبھی وہ تھکے تھکے لگیں تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ آپ خود تھکے ہوئے ہیں۔

طبیعت ایسی جلالی کہ دعا بھی یوں مانگتے ہیں جیسے سود خور پٹھان قرض۔ ہر مسئلے پر سب سے پہلے ڈٹ جاتے ہیں۔ اکثر تو مسئلے سے پہلے ہی ڈٹ جاتے ہیں۔ نماز کے اس قدر پابند کہ وہ تو ہم عصر بھی اسے مانتے ہیں' جس کے ساتھ عصر پڑھی ہو۔ عورتوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ خواتین کو دیکھ کر ہم بھی آنکھ بند کر لیتے ہیں' بس راستہ دیکھنے کے لیے ایک آنکھ کھلی رکھتے ہیں۔

سیاست میں جوشیلے نوجوان کے طور پر داخل ہوئے۔ آج تک اپنی کسی بات سے نہیں پھرے۔ یہاں تک کہ آج بھی اتنے ہی جوشیلے اور نوجوان ہیں۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں تھے تو مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھے۔ جے یو پی کے جنرل سیکرٹری تھے تو سیکرٹری کم اور جنرل زیادہ تھے۔ تحریک ختم نبوت میں تو انہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ جب موت کی سزا ملی تو لگا جیسے موت کو سزا ملی۔

مولانا اسلام پورہ میں رہتے ہیں مگر انہیں اسلام پورا پسند ہے۔ اپنی پہلی بات کو آخری بات سمجھتے ہیں۔اگر آپ نہ مانیں تو ہو سکتا ہے یہ آپ کی بھی آخری بات ہی ہو۔ گدھے گھوڑے کو ایک ہی ڈانگ سے ہانکتے ہیں جس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی ڈانگ ہے۔ ان کی آواز آج بھی اتنی ہی بلند ہے جتنی ۱۹۳۶ء میں تھی' مگر ہمارے سیاستدان سرگوشیاں سننے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اب انہیں بلند آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ مولانا کی شخصیت کو اگر ایک لفظ میں لکھا جائے تو وہی ہے

جس عنوان سے ان کی آپ بیتی چھپی ہے۔ وہ ہے "میں" ------ ان کی شخصیت "میں" کے گرد گھومتی ہے۔ وہ بات "میں" سے شروع کرتے ہیں۔ بات ختم ہو جاتی ہے مگر "میں" ختم نہیں ہوتی۔

○○○

- ادب کی پھولن دیوی

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں لاہور شہر میں ایک انٹر کالجیٹ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ہال میں سر ہی سر تھے اور جب سر بڑھ جائیں تو دماغ کم ہو جاتے ہیں۔ یوں شعر سے زیادہ شور سنائی دے رہا تھا۔ اس مشاعرے میں جب ایک لڑکی نے یہ اعلان کیا کہ میں عورت ہونے کے ناطے حوصلہ افزائی کا انعام نہیں لوں گی اور لڑکے لڑکیوں سے برابر کی سطح پر مقابلہ کروں گی تو ہال میں شور بڑھ گیا۔

آج کچھ لوگ اسے ادب کی پھولن دیوی کہتے ہیں اسی لیے وہ جس تقریب میں جاتی ہے اسے لوٹ لیتی ہے۔ مشاعرے لوٹتے تو اسے میں نے خود دیکھا ہے۔ لہجہ ایسا کہ خدا حافظ بھی یوں کہتی ہے جیسے جانے کا حکم دے رہی ہو۔ صاف گو اتنی جتنی ایک عورت زیادہ سے زیادہ ہو سکتی ہے۔

انتظار حسین کہتا ہے' اس کے آنے سے غزل میں سوکن کا ذکر ہونے لگا ہے حالانکہ اس کے لہجے سے لگتا ہے وہ سوکن کا نہیں رقیب کا ذکر کر رہی ہے۔ مرد عورت سمجھ کر اس کے مقابلے سے ڈرتے ہیں اور عورتیں مرد سمجھ کر اس کے سامنے نہیں آتیں بلکہ بعض شاعر تو اپنی بیویوں کو اس سے پردہ کراتے ہیں۔ خود تو کچھ پردہ کرنے لگتے ہیں۔ کہتی ہے عورت کی حیا اس وقت ختم ہوتی ہے جب مرد بے حیا ہو جائے۔ اسی لیے مردوں کو حیا کی تلقین کرتی ہے۔ حسن ظن اور حسن زن سے کام نہیں لیتی۔ مردوں کے اس قدر خلاف ہے کہ اس سے بھیڑ کا تذکرہ پوچھو تو بھیڑیا کہے گی۔ وہ مردوں سے بھرے کمرے میں یوں آ کر بیٹھتی ہے جیسے خالی کمرے میں آ کر بیٹھی ہو۔ بات وہی کرتی ہے جو لکھنے والی نہیں ہوتی۔ مردوں سے بات وہاں سے شروع کرتی ہے جہاں دوسری عورتیں ختم کرتی ہیں۔ گفتگو دوسرے کے ذوق کے مطابق کرتی ہے

اگر کسی سے بری گفتگو کرے تو اسے خود کو برا سمجھنا چاہیے۔
مرد دوستوں سے ایسا برتاؤ کرتی ہے کہ وہ اس کے دفتر میں بھی یوں گھبرائے بیٹھے ہوتے ہیں جیسے اپنے گھر میں ہوں۔ دوستوں کے دکھوں میں اس کی باتیں دوا کا اثر رکھتی ہیں بعض اوقات ذائقہ بھی دوا کا ہی ہوتا ہے۔
اگر وہ آپ کی ماتحت ہے تو آپ اس سے ناراض نہیں ہو سکتے اور اگر آپ اس کے ماتحت ہیں تو آپ سے خوش نہیں ہو سکتی۔ جس دفتر میں ہوتی ہے وہاں کا عملہ کبھی دیر سے نہیں آتا دیکھا' ہمیشہ دیر سے جاتا دیکھا ہے۔
کہتے ہیں جسے کسی نے گالی نہیں دی وہ سچا نہیں ہو سکتا اس لحاظ سے تو پھر اس نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں اس قدر حوصلہ مند ہے کہ ہر مسئلے پر ڈٹ جاتی ہے بلکہ بغیر مسئلے کے بھی ڈٹ جاتی ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاسوں میں نہیں جاتی کیونکہ وہ کسی کو کسی اور کے ہاتھوں بے عزت ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔
اس دنیا اور دوسری دنیا کی بجائے اسے تیسری دنیا کی زیادہ فکر ہے' وہ بھی عورتوں کی۔ مردوں کی طرف سے اسے کوئی فکر نہیں۔ عورتوں کے حقوق کے لیے اس کا کام دیکھ کر اس کے قریبی دوست یہ سوچنے لگتے ہیں کہ مردوں کو بھی عورتوں کے برابر حقوق ملنے چاہئیں۔
کہتے ہیں ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے ناکام مرد کے پیچھے ایک سے زیادہ۔ مگر یہ وہ عورت ہے جو ایک سے زیادہ کامیاب مردوں کے پیچھے ہے۔ وہ غلط کام بھی نیک نیتی سے کرتی ہے۔
لباس کا خیال نہیں رکھتی اور لباس بھی اس کا خیال نہیں رکھتا۔ اپنی ذات میں ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ یعنی خود ہی شوہر' خود ہی بیوی' خود ہی بہو اور ساس بھی آپ ہی۔
دفتر میں افسر' ماتحت حتیٰ کہ چوکیدار تک خود ہے۔ اسی لیے اس کے دفتر میں آنے والا ملاقاتی چوکیدار کو بعد میں نظر آتا ہے یہ اسے پہلے دیکھ لیتی ہے۔
نئی نسل کے لیے اس کے دل میں پدرانہ شفقت پائی جاتی ہے۔ اسے دور سے جاننے والے

اس پر شک کرتے ہیں اور قریب سے جاننے والے رشک۔ اردو ادب میں اس کا سفر برقعے سے بوائے کٹ تک کا ہے۔

کہتی ہے میری شاعری میں واحد متکلم کا صیغہ نہیں جمع متکلم کا ہے۔ ٹھیک کہتی ہے کیونکہ جب وہ "میں" کہتی ہے تو اس میں کئی بڑے ادیب اور سولھویں گریڈ سے بڑے افسر شامل ہوتے ہیں۔

وہ نہ صرف دوستوں کے کام آتی ہے بلکہ دشمنوں کے کام بھی آتی ہے۔ کچھ لوگ مشہور ہونے کے لیے اس سے دوستی کرتے ہیں اور کچھ اس مقصد کے لیے دشمنی۔ جو لوگ اسے گالیاں دیتے ہیں' یہ ان کا کام بھی کرا دیتی ہے تا کہ یکسوئی سے گالیاں دے سکیں۔

اس کی پوری زندگی ضدوجہد کی کہانی ہے۔ یوں جو بات عورت کی حوصلہ افزائی سے شروع ہوئی اب عورت کی حوصلہ مندی تک آ پہنچی ہے مگر ہال میں آج بھی اتنا ہی شور ہے لیکن اس شور نے اس کی آواز مزید نمایاں کر دی ہے۔

○○○

• لاؤڈ سپیکر

خالد احمد چپ رہے تو اچھا لگتا ہے۔ باتیں کرنے لگے تو سننے والا اچھا لگنے لگتا ہے۔ لوگ اس کی باتوں سے بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ خاص کر اس وقت جب وہ سانس لینے

کے لیے رکتا ہے۔

اس میں اگر کوئی خاص بات ہے تو وہ یہ کہ بڑا عام سا بلکہ سرعام سا آدمی ہے۔ رنگ ایسا جیسے دن رات اختلاط کر رہے ہوں۔ چلتے وقت کاغذوں کا پلندہ یوں اٹھائے ہوتا ہے جیسے راستے سے اکٹھے کرتا آ رہا ہے۔ جس دن پتلون پہنی ہو' گھر دیر سے پہنچتا ہے کیونکہ پتلون ایسی ہے کہ چند قدموں کے بعد اسے دوبارہ پہننا پڑتا ہے۔ اگر شیو بنی ہوئی ہے تو سمجھ لیں ٹی وی پر مشاعرہ پڑھ کر آ رہا ہے۔ سگریٹ نہیں تو جیب خالی ہے۔ منہ بند ہے تو سمجھ لیں وہ اکیلا ہے۔

علم و فنون میں اسے "فنون" سب سے زیادہ پسند ہے اپنے دفتر جائے نہ جائے "فنون" کے دفتر ضرور جائے گا۔ کہتے ہیں وہ اپنے دفتر اس لیے نہیں جاتا کہ اسے کام سے محبت ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کے دفتر کے آدمی آرام سے کام کریں اور "فنون" کے دفتر اس لیے باقاعدگی سے آتا ہے کہ کہیں دوسروں کو پتہ نہ چل جائے کہ اس کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وہ اپنے لباس کی طرح رائے بدلتا ہے یعنی نہیں بدلتا۔ نہانے سے اس پر وہی اثر پڑتا ہے جس کے لیے عورتیں ڈائٹنگ کرتی ہیں۔ جس دن نہا کر صاف کپڑے پہن

کر گلی میں آ جائے محلے کے بچے اپنے گھر جا کر والدین سے عیدی مانگنے لگتے ہیں۔

دوران گفتگو ہنستا رہتا ہے تاکہ ہم سے کم لوگوں کو اس کی بات کی سمجھ آئے اور وہ سمجھیں اس نے بڑی اچھی بات کی ہے۔ کچھ پوچھ لو تو بتاتا بتاتا آپ کو کہاں سے

کہاں لے جائے گا۔ یہاں تک کہ آپ بھول جائیں گے کہ آپ نے پوچھا' کیا تھا؟ جو بات آپ چپ رہ کر بھی کر سکتے ہیں وہ آدھ گھنٹے کی مسلسل تقریر کے بعد بھی نہیں کہتا۔

اس قدر ناقابل اعتبار کہ کسی وقت بھی سچ بول سکتا ہے۔ اگر وہ صحافی نہ ہوتا تو میں یہاں تک کہہ دیتا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ باتیں جنہیں کرنے سے پہلے نوجوان ادھر ادھر دیکھ لیتے ہیں کہ کوئی انہیں یہ باتیں کرتا تو نہیں دیکھ رہا' وہ یوں کہہ دیتا ہے کہ سننے والا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے کہ کہیں کوئی اسے سنتا ہوا تو نہیں دیکھ رہا۔ وہ اچھی بات برے طریقے سے کرنا جانتا ہے اسی لیے مذہبی بحث کرتے وقت مولوی لگتا ہے۔ موسیقی سے لگاؤ ہے اور جب اپنی پسند کا گانا سننا چاہے خود گانے لگتا ہے۔ اسے منافقت اور ٹوتھ پیسٹ سے نفرت ہے۔ پہلے دوائیوں کی ایک کمپنی میں ملازم تھا۔ اگر وہیں ہوتا تو بہت ترقی کرتا۔ یہ وہاں نہیں تو کمپنی ترقی کر گئی۔ چھوٹی موٹی بیماری کی دوا اب بھی خود تجویز کر دیتا ہے مگر پہلے یقین کر لیتا ہے کہ دوسرے کے چھوٹے موٹے بچے نہ ہوں۔

دوستوں سے یوں محبت کرتا ہے جیسے زیادتی کر رہا ہو اسی لیے اتنے لوگ اس کی نفرت سے نہیں ڈرتے جتنے اس کی محبت سے خوف کھاتے ہیں۔ صرف بچوں کا احترام کرتا ہے۔ اسی لیے جس کسی کا احترام کرے' سمجھ لیں اسے بچہ سمجھ رہا ہے۔ سوائے اجنبیوں کے کسی کے ساتھ مہذب طریقے سے نہیں ملتا۔ اگر کسی مسئلے پر قہقہے لگا رہا ہو تو سمجھ لیں یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اگر کسی مسئلے پر پریشان ہو رہا ہے تو یہ اس کے کسی دوست کا ہو گا۔ اس کے حلقہ احباب میں ہر قسم' کسب اور عمر کے لوگ ہیں۔ بوڑھے اسے پسند ہیں اور نوجوانوں کو یہ پسند ہے۔ اس کے دوست اچھے شاعر ثابت ہوں نہ ہوں اچھے شوہر ضرور ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو خالد احمد کے ساتھ گزار سکتا ہے وہ ہر قسم کی بیوی کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ کہتا ہے صرف اچھی کتابیں پڑھتا ہوں شاید اسی لیے اس نے ابھی تک "تشبیب" اور "ہتھیلیوں پر چراغ" نہیں پڑھی۔

اس کے پاس بیٹھ کر لگتا ہے آدمی اپنے پاس آ بیٹھا ہے۔ وہ وہی بات کرے گا جو آپ سننا چاہتے ہیں۔ ان ادیبوں میں سے نہیں جو جوانوں میں اس لیے نہیں بیٹھتے کہ ان میں بیٹھ کر انہیں اپنے بوڑھے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

جب اس کا دل لکھنے کو نہ چاہے' اخبار کے لیے کالم لکھنے لگتا ہے۔

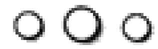
پہلی ہی ملاقات میں دل جیت لیتا ہے۔ اسی لیے دوسری ملاقات میں لوگ اسے بے دلی سے ہی ملتے ہیں۔ وہ اپنے باہر کی صفائی کی بجائے اندر کی صفائی کا قائل ہے۔ اسی لیے اندر کی ساری غلاظت اپنی باتوں میں تھوک دیتا ہے۔ دوستوں کو سر ماتھے پر بٹھاتا ہے۔ اسی لیے وہ اسے خود سے نیچا سمجھتے ہیں۔

کہتے ہیں مرد غلط بات کرنے سے پہلے سوچتا ہے اور عورت ایسی بات کرنے کے بعد' لیکن خالد احمد پہلے سوچتا ہے نہ بعد میں۔

کھانے کا دشمن ہے اور کھانا اس کا دشمن ہے۔ مل جل کر کھانے پینے کی ایسی عادت ہے کہ آدھا سگریٹ خود پیتا ہے آدھا ایش ٹرے کو پلاتا ہے۔

اکثر سوتے وقت پاؤں پر جوتے اور باقی جسم پر لحاف اوڑھے ہوتا ہے۔ مگر جوتے لحاف کے اندر نہیں کرتا تا کہ جوتے خراب نہ ہو جائیں۔

احمد ندیم قاسمی پیار کا شہر ہے تو خالد احمد اس کا دروازہ ہے یعنی آنے جانے والوں کو روکتا ہے۔



- چار کا ٹولہ

چار کے ٹولے میں یہی بات مشترک ہے کہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان چاروں میں اس قدر اتفاق ہے کہ بس اتفاق ہی سے اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان میں علی اکبر عباس' نذیر ناجی سے چھوٹا' علی اصغر عباس سے بڑا اور رضا سہیل سے بہت بڑا ہے۔ چاروں بھائیوں نے والد سے سوائے ذہانت کے کچھ نہیں لیا اور دیا بھی کچھ نہیں۔ سب نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کام دکھایا۔ علی اکبر ایک بار الیکشن ہارا تو علی اصغر دو بار اور رضا سہیل مزید اور بار۔ ان میں نذیر ناجی کا تعلق بائیں بازو' علی اکبر کا دائیں بازو سے جبکہ علی اصغر عباس دائیں بائیں ہو جاتا ہے تاہم رضا سہیل کا تعلق بازوؤں سے نہیں بانہوں سے ہے۔

رضا سہیل نر بچہ ہے۔ علی اصغر نرا بچہ ہے اور نذیر ناجی بوڑھا بچہ ہے۔ جبکہ علی اکبر عباس کا ابھی پتہ نہیں چلا وہ بچہ ہے' جوان ہے یا بوڑھا۔ وہ ہر عمر کے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ جس عمر کے لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے' انہی کی عمر کا لگتا ہے۔ علی اکبر کا پیٹ عمر اور سائز میں علی اصغر سے بڑا ہے جبکہ نذیر ناجی اور رضا سہیل پیٹ کے ہلکے ہیں۔

نذیر ناجی اس قدر مذہبی ہے کہ جو بھی غلام مصطفیٰ نظر آئے وہ کہیں کا بھی ہو اسی کے پیچھے چلنے لگتا ہے۔ اندر سے بھی ویسا ہی ہے۔ اس کا غصہ خالص ہوتا ہے یعنی بلا وجہ صرف اس وقت غصے میں نہیں ہوتا جب دوسرا غصہ میں ہو۔ جو اس کی عزت کرنا چاہیں اس سے ملنا بند کر دیتے ہیں اور جس سے یہ تعلق ختم کرنا چاہے اسے روز ملنے لگتا ہے۔

رفیق ڈوگر کی طرح لٹھ بردار صحافی ہے' مگر ڈوگر لٹھ قارئین کے سر میں مارتا ہے جبکہ یہ موضوع کے سر میں۔ منو بھائی شخصیات پر اچھے کالم لکھتا ہے۔ وہ آپ پر بھی اچھا

کالم لکھ سکتا ہے۔ اور یہ آپ پر منحصر ہے کہ وہ اچھا کالم کب لکھے' کیونکہ وہ اچھا کالم صرف مرحومین پر لکھتا ہے۔ لیکن نذیر ناجی کالم لکھنے کے لیے کسی کے مرنے کا انتظار نہیں کرتا۔ یہ کام اس کا کالم خود ہی کر لیتا ہے۔ اس نے زندگی ایسے گزاری کہ اس پر زیادہ سے زیادہ چار حروف ہی کہہ سکتے ہیں مگر اس کے کالموں پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اس نے خود اپنے آپ کو پالا یوں وہ اپنی ہی صحبت میں رہ کر خراب ہو گیا۔ ناجی ہمیشہ ناں جی ہی میں رہا کبھی ہاں جی نہ ہوا۔ اس کی شخصیت کا پازیٹو پہلو یہ ہے کہ اس کے خون کا گروپ +O ہے۔

وہ خود تو سعادت مند بیٹا نہ بن سکا مگر اس کے بچوں نے اسے سعادت مند باپ ضرور بنا دیا۔ کہتے ہیں جوانی میں آدمی سوچتا سمجھتا نہیں' عمر ڈھلتی ہے تو سوچتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں اور بڑھاپے میں یہ سمجھتا کہ سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نذیر ناجی بیک وقت ان تینوں مقاموں پر مقیم ہے۔

علی اکبر عباس چار کے ٹولے میں دو نمبر ہے۔ اس کے لیے دوسروں کو بے عزت کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اپنی عزت کرانا۔ تخلیقی آدمی ہے اس کی تمام چیزیں اوریجنل ہوتی ہیں یہاں تک غلطیاں بھی۔ مگر وہ کبھی غلط کام نہیں کرتا' کیونکہ غلطی کے بعد کہے گا میں نے تو تجربہ کیا تھا تا کہ جو اصل کام کرنا چاہتا ہوں اس میں غلطی نہ ہو۔ غصہ پی جاتا ہے مگر اسے پیتے وقت منہ ایسا ہی بناتا ہے جیسا ایک شریف آدمی حرام چیز پیتے وقت بنا سکتا ہے۔ شہرت ایسی کہ منہ بھی دھو رہا ہو تو لوگ کہتے ہیں' وضو کر رہا ہے۔

اس قدر گرم جوشی سے ملتا ہے کہ بندے کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بھی حلقہ ارباب ذوق کی الیکشن کمپین پر نکلا ہے۔ نمایاں ہونے کا شوق ہے۔ اس کا اندازہ اس کے دوستوں کو دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ ان کی عمریں بھی ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے ساتھ ٹی ہاؤس میں داخل ہو تو بندہ سمجھتا ہے کوئی سکول ماسٹر لڑکوں کو شاعر دکھانے لایا ہے۔ وہ اسے دوست نہیں بلکہ علی بھائی کہتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دوست تو بندہ

اپنی مرضی سے بناتا ہے۔ یہ بھی انہیں اپنے چھوٹے بھائی ہی سمجھتا ہے۔ یعنی جب دل چاہے بلا وجہ ڈانٹ لیتا ہے۔ ساری زندگی اگر وہ کسی سے لڑا ہے تو یقین کر لیں الیکشن ہی لڑا ہو گا۔ وہ تو دشمن سے بھی ملنے جائے تو جیب میں صرف پستول کا لائسنس ہی لے کر جائے گا۔ کسی کو آنکھ نہیں دکھاتا' بلکہ اسے تو خود بھی اپنی آنکھیں ڈھونڈ کر دیکھنا پڑتی ہیں۔

جن لوگوں نے کئی برس پہلے علی اکبر عباس کی کتاب "بر آب نیل" پڑھی وہ کہتے ہیں "در نگاہ سے" پہلی کتاب کی نسبت جلدی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ جس کی وجہ مجھے تو یہ لگتی ہے کہ وہ لوگ اتنے برسوں میں سیانے اور سمجھ دار ہو گئے ہیں۔ علی اکبر عباس نے اپنی تازہ کتاب میں شامل کرنے کے لیے غزلوں اور نظموں کا انتخاب امجد طفیل کی سربراہی میں ایک پانچ رکنی کمیٹی کے سپرد کیا اور جو غزلیں کمیٹی کی سمجھ میں آ گئیں وہ اس نے رکھ لیں اور باقی کتاب میں شامل کر لیں۔

اس کی شاعری ادب کے لیے ہی نہیں صحت کے لیے بھی مفید ہے۔ اس کے بعض مصرعے پڑھ کر تو بندے کی وہی حالت ہوتی ہے جو سو میٹر کی ریس جیتنے کے بعد۔ مثلاً اس کا ایک مصرع ہے۔

"گونگوں بہروں کی بستی میں پیدا ہونے والے بچے بولنا سیکھیں گے"

حالانکہ مصرع اتنا لمبا ہے کہ مصرع ختم ہونے سے پہلے ہی پیدا ہونے والے بچے بولنا سیکھ لیتے ہیں۔ شعر چھپ کر لکھتا ہے۔ حالانکہ اکثر شاعروں کو یہ کچھ شعر لکھنے کے بعد کرنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں اس کے سر کے بال آدھے سفید ہیں مگر مجھے آج تک اس کا پتہ نہیں چلا کیونکہ جب وہ دوستوں سے ہنسی مذاق کرتا ہے تو اس کے سارے بال سیاہ ہوتے ہیں اور جب کوئی پیارا مصیبت میں ہو تو اس کا سارے کا سارا سر سفید ہوتا ہے۔

وہ اپنی تعریف کے لیے کسی کا محتاج نہیں' خود ہی کر لیتا ہے۔ یوں بھی اس کی شاعری پر سب سے معتبر رائے اسی کی ہو سکتی ہے کہ اس سے زیادہ تو اسے کسی نے نہیں

پڑھا۔

علی اصغر عباس چھوٹے میاں ہے۔ یاد رہے چھوٹے میاں Small Husband کو نہیں کہتے۔ تاہم یہ ہفتے میں چھ دن شوہر اور ایک دن شاعر ہوتا ہے۔ لیڈری کا شوق ہے اور اس میں ہمیشہ سب سے آگے رہا۔ اتنا آگے کہ دور دور تک اس کے پیچھے کوئی نہیں ہوتا۔ شکل و صورت ایسی کہ اپنے بھائیوں میں بیٹھا ہو تو خوبصورت لگتا ہے۔ شاید اسی لیے وہ اس کے پاس نہیں بیٹھتے۔ ہنستے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے یکدم پھولے غبارے سے ہوا نکل جائے۔ اسے ہنسنے کے لیے کسی بات کی نہیں بس ایک شخص کی ضرورت ہوتی ہے' جس کے ہاتھ پر ہاتھ مار سکے۔

چھوٹی عمر کے لڑکوں کے پاس بیٹھ کر اسے وہی خوشی ہوتی ہے جو بڑی عمر کے لڑکوں کو اس کے پاس بیٹھ کر ہوتی ہے۔ پکے رشتے بناتا ہے اسی لیے دوستوں سے زیادہ دشمن بناتا ہے کیونکہ آج کل یہی سب سے پکا رشتہ ہے۔ دوستوں سے یوں ملتا ہے کہ دیکھنے والے چھڑانے کو دوڑتے ہیں۔ دوستوں کی خامیوں کی بجائے ان کی خوبیاں تلاش کرتا ہے۔ اس کے دوست ہیں بھی ایسے کہ ان کی خوبیاں واقعی تلاش کرنا پڑتی ہیں۔ دوسروں کے بارے میں وہی رائے رکھتا ہے جو لوگ اس کے بارے میں رکھتے ہیں۔ دوستوں میں پانچ منٹ سے زیادہ مہذب نہیں بیٹھ سکتا ہے۔ اور دشمنوں میں پانچ منٹ سے زیادہ بیٹھ نہیں سکتا۔ بہت اچھا مقرر ہے۔ اس لیے ایک آدمی سے بھی یوں بات کرتا ہے جیسے اجتماع سے خطاب کر رہا ہو۔

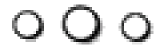
رضا سہیل کی حرکات نذیر ناجی کی اور سکنات علی اکبر کی ہیں۔ بچوں سے اس قدر پیار کرتا ہے کہ جس بچے کو اٹھا لے اس کا باپ اپنی بیوی کو شک سے دیکھنے لگتا ہے۔ کوئی حرام چیز نہیں پیتا اسی لیے غصہ نہیں پیتا۔ ہر وقت اپنی ملازمت کا استعفیٰ ساتھ رکھتا ہے کہ کہیں کبھی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ غلطی سنگین بھی ہو سکتی ہے' اس لیے بھرا ہو نکاح نامہ بھی ساتھ رکھتا ہے۔

کہتا ہے کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے ملنے کے بعد آپ بھی مان جائیں

گے۔ وہ جرنلزم کا ونڈر بوائے ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو آگ لینے جاتے ہیں اور پیغمبری لے کر لوٹتے ہیں۔ بات دل میں نہیں دماغ میں رکھتا ہے بلکہ وہ تو رہتا بھی دماغ میں ہی ہے۔

کپڑے دھونے کا شوق ہے اکثر کپڑے آدمی سمیت دھو ڈالتا ہے۔ اچھا لباس پہنتا ہے' یعنی وہ لباس جو اسے اچھا لگے۔ دوسروں کو چاہے وہ لباس بھی نہ لگے۔ گفتگو صحافیوں والی کرتا ہے یعنی اس میں لفظ کم اور دھمکیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ عورتوں کے تمام کام اور مردوں کے کام تمام کرتا ہے۔ لڑکیوں سے دوستی وہاں سے شروع کرتا ہے جہاں سے دوسرے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لیے پتہ نہیں چلتا شروع کر رہا ہے یا ختم کر رہا ہے۔

اگر آپ اس کے دوست ہیں تو خوش قسمت ہیں کیونکہ وہ دوستوں سے کوئی توقع نہیں رکھتا اور اگر وہ آپ کا دوست ہے تو آپ بد قسمت ہیں کیونکہ وہ کسی توقع پر پورا نہیں اترتا۔



• ضیاع بٹ

ضیاء بٹ مجھے زبانی یاد ہو گیا ہے پر میں اسے سمجھ نہیں سکا حالانکہ بٹوں کو سمجھنا اتنا دشوار نہیں جتنا سمجھانا۔ مشکل سا چہرہ جسے یاد رکھنا آسان ہے۔ چہرہ کیا ہے؟ لگتا ہے کسی نے اپنی گوری چٹی ہتھیلیاں دعا کے لیے پھیلا رکھی ہیں جن پر کئی سلوٹیں سر اٹھا اٹھا کر سجدوں میں گر رہی ہیں۔ جب وہ ہنستا ہے تو لگتا ہے گیس کا سلنڈر پھٹ گیا اور سلوٹیں سمٹ جاتی ہیں۔ ہنستے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور وہ یہ سرخی ہاتھ سے قریب بیٹھے شخص کے جسم پر منتقل کر دیتا ہے۔

چلتے وقت قدم یوں اٹھاتا ہے جیسے پانی سے گزر رہا ہو اس نے ماتھا سر پر چڑھا رکھا ہے۔ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ کرنے کے لیے اس کو دوبارہ جوان کرنا پڑے گا۔ وہ ہر دم دوستوں اور بالوں کو بناتا رہتا ہے۔ سر پر سہمے سہمے بال جو بیچارے یونہی سر اٹھانے لگتے ہیں ان پر ایسا ہاتھ پھیرتا ہے کہ وہ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہتے۔

دیکھنے میں وہ ادیب کم اور سیاست دان زیادہ لگتا ہے۔ ہمارے ہاں ادیبوں اور سیاست دانوں میں صرف ایک ہی بات مشترک ہے کہ دونوں کسی کی بات نہیں سنتے۔ لیکن ضیاء بٹ سن لیتا ہے۔ دوسرے بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی بات سن رہا ہے حالانکہ وہ تو اپنی بات ان کے منہ سے سنا رہا ہوتا ہے۔ اگر کوئی بات اچھی لگے تو کہے گا سبحان اللہ۔ اگر کوئی بات اچھی نہ لگے تو پھر بھی یہی کہے گا۔ اس لیے کبھی پتہ نہیں چلا کہ اسے کس بات پر دکھ ہوا ہے اور کس پر خوشی۔

عورتیں آنکھوں سے ہنستی اور گلے سے روتی ہیں مگر ضیاء بٹ گلے سے ہنستا اور دل سے روتا ہے۔ عمر کے اس حصے میں ہے جہاں بوڑھے اسے جوان نہیں مانتے اور جوان اسے بوڑھا نہیں مانتے۔ "فنون" کے دفتر اس قدر وقت پر آتا ہے کہ یقین نہیں آتا کہ اس کا محکمہ ریلوے سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ دفتر میں خود بعد میں داخل ہوتا ہے

اس کی ناک پہلے داخل ہو جاتی ہے۔ جس موضوع پر آپ بات سننا گوارہ نہیں کرتے' وہ اس پر بات کر سکتا ہے۔

"ضیا" اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے ان لوگوں میں سے ہے جو کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ چپ ہو تو لگتا ہے یہ شخص کبھی بولا ہی نہیں اور بول رہا ہو تو لگتا ہے یہ کبھی چپ ہی نہیں ہوا۔

جس طرح عورتوں کا کچھ نہ کچھ بھاری ہی رہتا ہے کبھی سر بھاری ہے تو کبھی پاؤں' ایسے ہی اس کا کچھ نہ کچھ خراب ہی رہتا ہے۔ کبھی صحت خراب ہے تو کبھی صحبت۔ اپنے انجام کا ذکر کرکے دوسروں کو فکر مند رکھتا ہے۔ دوسرے اس لیے فکر مند ہوتے ہیں کہ انہیں پتہ ہے کہ ان کا انجام اس سے بہتر نہ ہو گا اور اس کا انجام بہتر نہ ہو گا۔

لوگ ہنستے ہنستے لڑ پڑتے ہیں مگر وہ لڑتے لڑتے ہنس پڑتا ہے۔ غصے میں آئے گا تو اس کی آنکھیں لہولہان ہو جائیں گی۔ لگے گا اگر اس نے نیچے دیکھا تو آنکھوں سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں گی۔ سانسیں آدم بو آدم بو پکارنے لگتی ہیں مگر اگلے ہی لمحے اس کا الف لیلوی قہقہہ ساری فضا کو بدل دیتا ہے اور مسکراہٹ اڈاریاں مارنے کی لیے ہر چہرے کے چبوترے پر کلیانے لگتی ہے۔

دوسروں کی خاطر خالی پیٹ خلال کرنے والا ضیا بٹ یاروں کی خاطر زہر بھی پی سکتا ہے اسی لیے جب کسی دوست کو سگریٹ کا گھونٹ بھرتے دیکھتا ہے اور فوراً چھین کر اپنے منہ سے لگا لیتا ہے وہ مانگا ہوا سگریٹ بھی اتنے اطمینان سے پیتا ہے کہ سگریٹ کو بھی اس وقت پتہ چلتا ہے جب شعلہ اس کی شہ رگ تک آ پہنچتا ہے۔ ضیاء بٹ پہلے ادیب ہے اور بعد میں بٹ یعنی پہلے زبان کا استعمال کرتا ہے پھر ہاتھ کا۔

وہ دوست بدلنے اور جگہ نہ بدلنے سے گریز کرتا ہے وہ ان لوگوں میں سے ہے جو نئی چیز ڈھونڈنے کی بجائے پرانی کے نئے استعمالات تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے وہ ایک ہی شخص کے پاس بیٹھے ہوئے بھی کرسیاں بدل بدل کر نئے مزے لوٹتا رہتا ہے۔ علم

جہاں بھی ملے اسے اپنی گمشدہ میراث سمجھتا ہے اسی لیے کتابیں لے کر واپس نہیں کرتا۔

ضیاء بٹ کی کہانیوں کے کردار اس کی اپنی شخصیت کے ترجمان ہیں۔ شاید اسی لیے جب یہ کردار غصے میں ہوں تو کہتے ہیں "بکواس بند کرو" خود کو "سنی دانشور" کہتا ہے تو سب اعتراض کرتے ہیں۔ جنہوں نے اسے دور سے دیکھا ہے وہ "دانشور" کہنے پر اور جو اسے قریب سے جانتے ہیں وہ "سنی" کہنے پر۔

○○○

- ملا دو پلازہ

جس مولوی کا پیٹ بڑا نہ ہو' اس کے مولوی ہونے پر شک ہونے لگتا ہے کہ لوگ تو مولوی کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں' مگر مولوی اپنے پیٹ کے پیچھے پڑھتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن دیکھنے میں مولوی لگتے ہیں' یعنی پیدل بندہ ان کی شلوار میں نالا نہیں ڈال سکتا۔

یہ سپر ہیوی ویٹ مولانا سیاست میں لائیٹ ویٹ مولانا ثابت ہوئے۔ ان کی پالیسیاں اتنی دھندلی ہوتی ہیں کہ پارٹی ورکروں کو بھی نظر کی عینک لگا کے دیکھنا پڑتی ہیں۔ ان کی پارٹی ایسی ہے کہ جس پارٹی کے ساتھ ہو' اسے بھی پتہ نہیں ہوتا بلکہ خود مولانا کو اخبار کے دفتر فون کر کے پوچھنا پڑتا ہے کہ آج ہم کس کے ساتھ ہیں؟

وہ جمعہ کے روز جمعیت العلمائے اسلام کے گھر اس وقت پیدا ہوئے' جب گھر والے جمعہ کی نماز پڑھنے گئے تھے۔ وہ جب پیدا ہوئے تب بھی مولانا تھے۔ عین جوانی میں بوڑھے ہوئے اور ۲۶ سال کی عمر میں ۶۲ سالہ ناظم اعلیٰ بنے۔ مولانا مفتی محمود نے آدھی عمر اللہ سے "فضل" مانگا اور باقی آدھی عمر اس کی صحت دیکھ کر کہا۔ "میرے گھر میں اللہ کا بڑا فضل ہے۔" مفتی صاحب کے انتقال کے بعد جمعیت علمائے اسلام کا انتقال مولانا فضل الرحمٰن کے نام ہو گیا۔ پارٹی ورکروں نے انہیں یوں مانا جیسے مفتی صاحب کا فتویٰ مان رہے ہوں۔ مولانا سیاست میں بڑے باپ کی حیثیت سے داخل ہوئے اور ابھی تک ان کی یہی حیثیت ہے۔ وہ اس سے کم عمر کے بیٹے ہیں جس کی عمر کے وہ نظر آتے ہیں اور اس سے زیادہ عمر کے ہیں جس عمر کے اپنے بیانوں سے لگتے ہیں۔ وہ جمعیت کے امیر اور سیاست کے غریب ہیں۔ سیاست میں کسی سے اتنی دشمنی نہیں رکھتے کہ اس سے دوستی نہ ہو سکے اور کسی سے اتنی دوستی نہیں رکھتے کہ اس سے دشمنی ہو سکے۔ کوئی بات خلاف مرضی ہو تو ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے' حالانکہ پٹھان ہیں اور پٹھانوں کی مرضی کے خلاف بات کی جائے تو چہرہ ضرور سرخ ہوتا ہے' مگر بات کرنے

والے کا۔ دوستوں کا پتہ نہیں' البتہ ان کا لباس چند ہی دنوں میں تنگ آ جاتا ہے۔ شلوار قمیض تو ایک طرف انہیں تو دھوتی کرتہ تنگ ہو جاتا ہے۔ ان کا عرض بڑا طول ہے۔ ہمیشہ سفید لباس پہنتے ہیں۔ "ف" کہتا ہے' یہ کونسی بڑی بات ہے۔ میں بھی جب لباس پہنتا ہوں تو وہ سفید ہی ہوتا ہے۔ ایک رومال کاندھے پر اور ایک سر پر باندھتے ہیں۔ تبدیلی چاہیں تو سر کے رومال کو کاندھے پر رکھ لیتے ہیں اور کاندھے والا سر پر باندھ لیتے ہیں۔ کسی عورت کو ننگے سر دیکھنا تو دور کی بات ہے' آج تک کسی عورت نے انہیں ننگے سر نہیں دیکھا۔

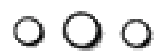
سنا ہے مولانا فٹ بال نہیں کھیل سکتے کہ جہاں فٹ بال رکھ کر ہٹ لگا سکیں' وہاں فٹ بال ہو تو نظر نہیں آتا اور جہاں سے فٹ بال نظر آتا ہے وہاں سے وہ ہٹ نہیں لگا سکتے۔ ہری پور جیل میں ان کا ساٹھ پاؤنڈ وزن کم ہوا تو انہوں نے خدا کا لاکھ شکر ادا کیا۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے' انہوں نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ جیل جاتے وقت ساٹھ پاؤنڈ کا نہیں تھا' ورنہ جیل سے باہر کیا نکلتا؟ اگرچہ منہ سے نکلی بات اور پیٹی سے نکلا پیٹ واپس نہیں آتا' پھر بھی وہ جیل جا رہے ہوں تو سمجھتے ہیں' سلمنگ سنٹر جا رہا ہوں۔ کہتے ہیں پیاز کھانے سے بھی دوست اور وزن کم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے ایک نشست میں کئی بیٹھکیں لگاتے' اب ایک بیٹھک کئی نشستوں میں لگاتے ہیں۔ پسندیدہ کھانا ثرید ہے کہ یہ وہ کھانا ہے جسے کھانے والا مولوی ہو تو کھانا نہیں بچتا اور اگر مولوی نہ ہو تو کھانے والا نہیں بچتا۔ مولانا جو کھاتے ہیں وہ سب کے سامنے ہوتا ہے بلکہ وہ تو جو کھا چکے ہوتے ہیں' وہ بھی سب کے سامنے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں چائے سے انکار کفر ہے۔ اس لیے چائے کی دعوت قبول کر رہے ہوں تو لگتا ہے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مہمان نواز ہیں۔ جو چند گھڑیوں کے لیے ان کا مہمان ہو' اسے یوں دیکھتے ہیں جیسے وہ چند گھڑیوں کا مہمان ہو۔ کسی مہمان کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے۔ ایک بار مولانا درخواستی انہیں ملنے آئے تو ان کے پاس انہیں دینے کو کچھ نہ تھا۔ سو آدھی

جمعیت علمائے اسلام دے دی۔ البتہ محترمہ بے نظیر بھٹو ان کے گھر آئیں تو محترمہ کو وہ تحفہ دیا جو محترمہ نے آج تک سنبھال کے رکھا ہے۔ انہوں نے محترمہ کو دوپٹہ دیا تھا۔ مولانا کو میٹھے میں میٹھا رنگ پسند ہے۔

صوبہ سرحد کا مزاج ایسا ہے کہ وہاں بندہ اپنے کمرے سے بیوی کے کمرے میں جائے تو بھی بندوق لے کر جاتا ہے۔ مگر مولانا مسلح محافظوں کی بجائے مصلّی محافظوں کے ساتھ پھرتے ہیں۔ وہ کلاشنکوف سے زیادہ کیمرے سے ڈرتے ہیں۔ جیل میں پڑھنے لکھنے کا کام کرتے ہیں۔ اس لیے جیل یوں جاتے ہیں جیسے لائبریری جا رہے ہوں۔ فرماتے ہیں۔ "مجھے زندگی میں پھل' پھول' رنگ اور خوشبو ایسی چیزوں پر غور کرنے کا وقت نہیں ملا۔" انہوں نے جس گھر میں آنکھ کھولی وہ مذہب اور سیاست کی یونیورسٹی تھا۔ والد محترم مفتی محمود صاحب نے اپنی زندگی میں انہیں سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے سے منع کیا' جس سے اندازہ لگائیں کہ وہ کتنے دور اندیش تھے۔ کہتے ہیں دیکھنے میں وہ مفتی محمود سے جتنی مماثلت رکھتے ہیں' اتنی مماثلت اپنے آپ سے نہیں رکھتے۔ انہوں نے جمعیت علمائے اسلام اور گاڑی چلانا خود ہی سیکھا۔ صلاحیتیں اور انداز سیاست ایسا ہے کہ انہیں کے بقول مارشل لاء حکومت کو اس بات کی جرات ہی نہ ہو سکی کہ مجھے وزارت کی پیشکش کرتی۔ ممکن ہے' مارشل لاء والے ڈرتے پیشکش نہ کرتے ہوں کہ کہیں یہ قبول ہی نہ کر لیں۔

ادب سے اتنا لگاؤ ہے کہ "نظم" کا پوچھو تو کہیں گے' آج کل میں چلا رہا ہوں۔ اس قدر رحم دل ہیں کہ جب کار چلانے لگیں تو ساتھ بیٹھنے والے سے پوچھ لیتے ہیں کہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے تو نہیں۔ من کی بات سب کو بتا دیتے ہیں' بات من سے کم کی ہو' تب بھی سب کو بتا دیتے ہیں۔ ان کی ہلکی پھلکی باتوں میں بھی بڑا وزن ہوتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کو ہر بات بتا کر چلتے ہیں۔ وہ تو لطیفہ سنانے سے پہلے بتا دیتے ہیں کہ یہ لطیفہ ہے تا کہ سننے والوں کو پتہ ہو۔ زیادہ بولتے ہیں نہ کم۔ اتنا دیکھتے نہیں جتنا دکھتے ہیں۔ بات سنجیدہ کرتے ہیں مگر مزاحیہ انداز میں' جبکہ سیاستدانوں کا انداز

سنجیدہ ہوتا ہے' بات مزاحیہ۔ وہ عورت کو آدھا سمجھتے ہیں۔ اس لیے اپنی گھریلو زندگی میں اسے پورا کیا۔ ان سے کوئی پوچھے کہ آپ نے دوسری شادی کرنے کے لیے کیا کیا؟ تو یہی کہیں گے۔ "اس کے لیے پہلی شادی کی۔" رمضان واحد مہینہ ہے جس میں وہ گھر پہ رہتے ہیں۔ اس لیے گھر میں ان کے قیام کو تیسرا دن ہو جائے تو گھر والے سحری کا انتظام کرنے لگتے ہیں۔ وہ سیاست میں کئی آدمیوں پر بھاری ہوں نہ ہوں' وہ کئی آدمیوں سے بھاری ضرور ہیں۔ انہیں کرسی کا کوئی لالچ نہیں کیونکہ ان کے ہاں سب کچھ فرشی نشستوں پر ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے والد کے کام کو ترقی دی۔ وہ ایک پارٹی چھوڑ کر گئے تھے' انہوں نے اسے ترقی دے کر دو بنائیں۔ وہ دنیا سے زیادہ دین کا علم رکھتے ہیں۔ ان کی سیاست بھی ایسی ہے کہ اس کا اجر اگلی دنیا میں ہی ملے تو ملے۔ وہ بنیادی طور پر ایک مدرس ہیں اور جمعیت علمائے اسلام کو یوں چلا رہے ہیں جیسے مدرسہ چلا رہے ہوں۔ سیاست میں ان کو وہی مقام حاصل ہے جو فلموں میں مسرت شاہین کو۔ مذہب کے یہ ملا دو پیازہ سیاست کے ملا دو پلازہ ہیں۔



• مس پریشانی

عورت اچھی حکمران ہوتی ہے کیونکہ اس کا حکومت کرنے کا بڑا تجربہ ہوتا ہے۔ شاید ہی کوئی خاتون ایسی ہو جس نے کسی پر حکومت نہ کی ہو۔ اس کے باوجود پاکستان جیسے ملک میں اب خاتون وزیراعظم صرف اسی صورت میں کہلا سکتی ہے کہ اس کا نام وزیر بی بی ہو اور وہ کسی اعظم نامی شخص سے شادی کر لے۔ لیکن مس پریشانی وہ واحد خاتون ہیں جو پاکستان کی وزیراعظم رہیں۔ دنیا انہیں میڈیم ڈیمو کریسی کے نام سے جانتی ہے۔ اس لیے انہیں کھانسی بھی لگ جائے تو ہمیں جمہوریت کے خلاف سازش لگتی ہے۔ محترمہ میں دو بڑی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے آج وہ بین الاقوامی قد کی لیڈر ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی ہے اور دوسری بھی یہی ہے۔ ان کا نام بے نظیر نہ ہوتا' تب بھی لوگ انہیں یہی کہتے۔ جیسے اصغر خان کا نام یہ نہ بھی ہوتا' تب بھی وہ سیاست میں اصغر ہی ہوتے۔

سر شاہنواز بھٹو مس پریشانی کے نرم دل دادا اور سیاست کے سخت دلدادہ تھے۔ بچپن میں بھی محترمہ گول میز کانفرنس اور سمٹ کانفرنس کے نتائج یوں سنتیں جیسے ان کے ہم عمر ورلڈ کپ کرکٹ کی سکور سنتے۔ تعلق اس خاندان سے تھا جہاں بچے سونے کے برتنوں میں کھانا کھاتے رہے ہیں۔ بچپن میں اگر محترمہ سے پوچھا جاتا کہ غریب آدمی کے متعلق آپ کیا جانتی ہیں تو یہیں کہتیں کہ غریب وہ ہوتا ہے جس کی کوٹھی میں سب غریب ہوں۔ اس کی کار کا ڈرائیور' اس کے ملازمین' اس کے کارخانے کا چوکیدار غرضیکہ اس کا ہر بندہ غریب ہو۔ بچپن میں رنگ ایسا تھا کہ سرخ گلاب کے پھولوں میں چلی جاتیں تو گھر والوں کو ڈھونڈنے میں مشکل ہوتی۔ آواز قد سے بھی بلند۔ ان کی تو سرگوشی ایسی کہ میلوں تک سنائی دے۔

پیٹر گلبرتھ کے بقول "محترمہ نے ریڈ کلف سے بی اے' آکسفورڈ سے ایم اے لیکن پی ایچ ڈی سکھر جیل سے کی۔" سولہ برس کی عمر میں جب وہ ریڈ کلف گئیں تو اپنی عمر سے بہت چھوٹی تھیں' مگر باپ کی پھانسی کی ایک رات نے پچیس سالہ بچی کو کئی سال بڑا کر دیا۔ ان کا پچیسواں سال مشکل سے گزرا۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے' یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میری بیوی نے بھی پچیسواں سال بڑی مشکل سے کہیں جا کے سات آٹھ سال میں گزارا۔ وہ بچی تھیں تو بھائیوں کا بڑا بھائی بننا پڑا۔ جوان ہوئیں تو والد بننا پڑا۔ شادی ہوئی تو خاوند بننا پڑا۔ اتنی پریشانیاں دیکھیں کہ اب جس دن پریشانی نہ دیکھنا چاہیں' آئینہ نہیں دیکھتیں۔

کوئی پوچھے کہ اس دنیا میں ایک سیاست دان سے زیادہ ناقابل اعتبار آدمی کوئی ہے؟ تو یقیناً اس کا جواب یہی ہو گا کہ دو سیاست دان۔ مگر وہ واحد سیاست دان ہیں جن سے کوئی امید ہو سکتی ہے' ویسے بھی وہی امید سے ہو سکتی ہیں۔ محترمہ ذوالفقار علی بھٹو سے کئی لحاظ سے برتر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ذوالفقار علی بھٹو کا والد اتنا بڑا لیڈر نہ تھا جتنا بڑا محترمہ کا باپ تھا۔ محترمہ نے سیاسی سفر کا آغاز گھر سے نہیں' جیل سے کیا۔ اگرچہ ان کے ہاں جیل کا آغاز بھی گھر سے ہوتا ہے۔ محترمہ اپنے والد کے ادھورے مقاصد کی تکمیل کے لیے اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہیں اور ان مقاصد میں سے ایک اقتدار حاصل کرنا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو پورے وزیراعظم تھے' ملک آدھا تھا۔ گواہی کے حساب سے یہ وزیراعظم بھی آدھی ہی تھیں۔ ان کا نعرہ ہے ------- اسلام ہمارا دین' سوشلزم ہمارا الہ دین اور جمہوریت ہماری دین ہے۔ بھٹو مرحوم سے کسی نے کہا تھا کہ آپ جاگیرداری نظام کیا ختم کریں گے' پہلے اپنی زمینیں تو غریبوں میں تقسیم کریں۔ بھٹو صاحب نے یہ سن کر کہا کہ میری زمینیں تو اتنی ہیں کہ ان کو پاکستان کے غریبوں میں بانٹا جائے تو ہر فرد کے حصے میں صرف پندرہ پیسے آئیں گے۔ یہ لو اپنے حصے کے پندرہ پیسے اور آرام

سے بیٹھ جاؤ۔ محترمہ کو بھٹو عزم تو نہ ملا' بھٹو ازم مل گیا۔ بھٹو صاحب صرف ایک ولی کو مانتے تھے' وہ تھا میکاولی۔ وہ اکثر دوروں پر محترمہ کو ساتھ رکھتے۔ شملہ معاہدے پر بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ جب معاہدہ پر دستخط ہوں تو بے نظیر موجود ہو۔ وفد کے ارکان نے کامیابی اور ناکامی کا کوڈ مقرر کر رکھا تھا کہ اگر ناکام ہوئے تو کہیں گے لڑکی ہوئی ورنہ لڑکا۔ سو جب رات ساڑھے بارہ بجے ارکان "لڑکا ہوا ہے" کہتے ہوئے محترمہ کے کمرے کی طرف آئے اور سامنے محترمہ کو دیکھا تو کہا۔ "لڑکا ..... ہوئی ہے۔"

کہتے ہیں خدا نے مرد کو پہلے بنایا' پھر عورت کو پیدا کیا۔ عورت کو پہلے اس لیے پیدا نہ کیا گیا کہ خدا آدم کو کسی کے مشورے کے بغیر بنانا چاہتا تھا۔ دنیا میں صرف ایک خاتون ہے جو صرف مانگنے پر مشورہ دیتی ہے' وہ ہے لیڈی ڈاکٹر۔ مگر مس پریشانی نے کبھی مشورہ نہیں دیا' ہمیشہ فیصلہ دیا ہے۔ اس سے قبل مرد ہی عورتوں کو فیصلے دیتے آئے ہیں۔ محترمہ کے والد امیر عورت سے شادی کرنا چاہتے تھے' اس لیے ان کی پہلی بیوی امیر بیگم تھی۔ مس پریشانی نے بھی زردار چنے۔ مگر شادی کے بعد وہ مسز زرداری نہ بنیں۔ مس بے نظیر نے اپنے خاوند کو مسٹر بے نظیر بنا دیا۔ مسٹر بے نظیر خود بڑی خوبیوں والے ہیں۔ جیسے وہ سانس لیں تو صاف ہوا اندر جاتی ہے۔ ان کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے۔ چلیں تو سایہ ساتھ ساتھ چلتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ شوہر کامدار ہیں جنہیں بیوی کی تقریر سننے کے لیے دیر سے گھر جانے کی بجائے جلدی اسمبلی جانا پڑتا ہے۔ مس پریشانی کا بحیثیت وزیراعظم بیس ماہی اقتدار دراصل ماہی کا اقتدار ہی تھا۔

کہتے ہیں عابدہ حسین بے نظیر سے بڑی سیاست دان ہیں۔ جنہوں نے عابدہ حسین کو دیکھا ہے' وہ مانتے بھی ہیں۔ عابدہ حسین تو اتنی بڑی ہیں کہ بندہ ان سے بات کر رہا ہو تو اسے لگتا ہے وہ اجتماع سے خطاب کر رہا ہے۔ جبکہ محترمہ کی صحت مندی کے بارے میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی صحت "مندی" ہی ہے۔ پارٹی کے لوگ ہر کام ان سے پوچھ کر کرتے ہیں۔ وہ تو یہ بھی پوچھتے ہیں کہ بی بی سوموار کو پارٹی لائن کے

مطابق کون سا دن ہو گا۔ اس بار دسمبر کے مہینے میں مارچ آئے گا؟ جن سیاست دانوں کے پیچھے لاکھوں ہوں، انہیں نظر نہیں آتا اور اگر ان کے پیچھے کوئی نہ ہو تو وہ کسی کو نظر نہیں آتے۔ مس پریشانی کو اس معاشرے میں لاکھوں لوگ چاہتے ہیں۔ جس معاشرے میں ایک بھی مرد چاہے تو یہ بھی چھوٹی بات نہیں سمجھی جاتی۔ محترمہ اپنی ذات سے نہیں، ذہانت سے متاثر کرتی ہیں۔ ویسے ذہانت عورت کی وہ خوبی ہے جس کا نہ ہونا بھی خوبی سے کم نہیں۔

پورے کام کو آدھا نہیں کرتیں، آدھے کام کو پورا کرتی ہیں۔ ان ملکوں میں رہیں جہاں عورتوں کا لباس دیر سے شروع ہوتا ہے اور جلد ختم ہوتا ہے، مگر وہ اب ایسا لباس پہنتی ہیں جو جلد شروع ہو جاتا ہے اور دیر سے ختم ہوتا ہے۔ وہ جمہوریت کی شہزادی ہیں۔ ان سے پوچھو۔ "جمہوری حکومت سے کیا مراد ہے؟" کہیں گی۔ "ہماری حکومت" سندھی کو مادری زبان کہتی ہیں۔ ان کی مادری زبان ان کی والدہ کو نہیں آتی۔ بچپن میں محترمہ نے دوسرے بچوں سے پہلے بولنا شروع کر دیا۔ اب بھی اپنی پسند کی آواز سننا چاہیں تو بولنے لگتی ہیں۔ سننا تو اب تک نہیں آتی۔ انہوں نے اردو کا ٹیوٹر رکھا تا کہ اردو کی غلطیاں نکال سکے۔ حالانکہ ان کی اردو پڑھ کر لگتا ہے کہ ٹیوٹر کو ان کی درستیاں نکالنا چاہئیں۔ اب بھی محترمہ کی اردو سمجھنے کے لیے اردو کی سمجھ ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا انگریزی کی۔ اردو کی املا تو اب بھی ایسی ہے کہ عامر کو آمر، ذیابیطس کو ضیا بیطس اور ضیاء الحق کو ضیاع الحق ہی لکھتی ہیں۔ البتہ آمر یوں کہتی ہیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ "آ .... مر"

مقرر ایسی کہ کمیونزم پر کئی گھنٹے ایک فقرہ بھی اس کی حمایت اور مخالفت میں کہے بغیر تقریر کر سکتی ہیں۔ دوسرے لیڈروں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ جیسی باتیں دوسرے سیاست دان سوچے سمجھے بغیر کہہ دیتے ہیں، وہی یہ سوچ کر کہتی ہیں۔ جتنا وہ کام کرتی ہیں اور نہیں تھکتیں، اتنا تو ہم آرام کریں تو تھک جائیں۔

مصروفیت کا یہ عالم کہ خاوند سے ملاقات ہونا تو دور کی بات' کئی کئی ماہ محترمہ کی خود سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔ وہ خوفزدہ لڑکی ہیں اور خوفزدہ لڑکی سے نڈر کوئی نہیں ہو سکتا۔

سوانح عمریاں پڑھنے کا شوق ہے۔ جب پسند کی سوانح عمری کو دل چاہا تو اپنی سوانح عمری لکھ دی۔ بڑی بات پر خوش نہیں ہوتیں' البتہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر ناراض ہو جاتی ہیں۔ شروع میں پارٹی میٹنگز میں کوئی ان سے اختلاف کرتا تو روتی ہوئی اٹھ جاتیں۔

اب یہ کام اختلاف کرنے والے کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ بقول کرسٹینا لیمب ------ وہ بحیثیت وزیراعظم سرکاری دعوتوں میں کھانوں اور برتنوں پر زیادہ توجہ دیتیں۔ اتنی توجہ اس مسئلے پر نہ دیتیں جس وجہ سے یہ دعوت دی ہوتی۔ ایسے دل کی ہیں کہ اگر ان کے ہاتھ کا پکا کھانا بلی کھا لے تو انہیں اتنا دکھ ہو گا کہ اس وقت تک اداس بیٹھی رہیں گی جب تک آپ یقین نہ دلا دیں کہ بلی بچ جائے گی۔ انہیں پاکستانی سفید بلیاں پسند ہیں جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پاکستانی سفید بلیاں کالی نہیں ہوتیں۔

عمر کے معاملے میں عورتوں کا یہ رویہ رہا ہے کہ جب وہ چھوٹی ہوتی ہیں تو چاہتی ہیں انہیں بڑا سمجھا جائے اور جب بڑی عمر کی ہو جاتی ہیں تو چاہتی ہیں' انہیں چھوٹی سمجھا جائے مگر محترمہ ان خواتین میں سے ہیں جو کسی کو خود سے بڑا نہیں سمجھتیں۔ وہ تو چچوں کو یوں بلاتی ہیں جیسے بچوں کو بلا رہی ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت میں کم سے کم دوست اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دشمن بنانے کا گر جانتی ہیں۔ مولویوں کے بارے میں ان کی رائے وہی ہے جو مولویوں کی ان کے بارے میں ہے۔ نصرت بھٹو اور بے نظیر کے اسٹائل میں اتنا ہی فرق ہے' جتنا ان کے ہیئر سٹائل میں۔

کہتی ہیں میں سیاست دان نہ ہوتی تو اخبار کی ایڈیٹر ہوتی۔ ویسے ہر عورت میں ایڈیٹر بننے کی پیدائشی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ خاوند کی جیب ان سے اچھی کون ایڈٹ کر سکتا ہے۔

کہتی ہیں بلاول کو وکیل بناؤں گی یا فوجی جرنیل۔ فیصلہ صحیح ہے۔ اگر فوجی جرنیل بن گیا تو راج کرے گا اور اگر وہ نہ بن سکا تو پھر وکیل ہونا چاہیے تا کہ اپنے خلاف

ہونے والے مقدمے تو لڑ سکے۔ ارسطو کہتا ہے کہ کسی کی افتاد طبع کا سراغ اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے ملتا ہے' بڑے بڑے کاموں سے نہیں۔ بڑے کام تو بندہ سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور بسا اوقات طبیعت کے خلاف کرتا ہے۔ مگر محترمہ نے ساری زندگی کبھی چھوٹا کام کیا ہی نہیں۔ وہ تو سر درد کی دوا بھی کھا رہی ہوں تو لگتا ہے' قوم کا درد سر کم کرنا چاہتی ہیں۔ خود پر اتنا اعتماد ہے کہ کسی پر اعتماد نہیں۔ والد کے نقش قدم اور نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ مارشل لاء سے اتنا ڈرتی ہیں کہ اس کی موجودگی میں ان کے منہ سے کرسی نہیں' آیت الکرسی نکلتی ہے۔ ضیاء الحق کو قاتل کہتی ہیں حالانکہ وہ تو انتقال دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ جیتے جی ان سے اقتدار کا انتقال نہ دیکھا گیا کسی اور کا کیا دیکھا جاتا۔ ضیاء الحق ست آدمی تھے کہ انہوں نے نوے دن کا کام نو سال میں کیا' جبکہ محترمہ اتنی تیز نکلیں کہ پانچ سال کی حکومت ڈیڑھ سال میں پوری کر دی۔ وہ فتح حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں' یہاں تک کہ ہار بھی سکتی ہیں۔ ضیاء الحق مارشل لاء میں اکثر کارکنوں نے انہیں کمر دکھائی۔ کچھ نے اس لیے بھی دکھائی تا کہ اس پر پڑے کوڑے دکھا سکیں۔ میاں نواز شریف کے اس قدر خلاف ہیں کہ ایک وقت ایسا آیا کہ میاں کا نام لینا چھوڑ دیا۔ ان دنوں وہ اللہ میاں کو بھی اللہ صاحب کہنے لگیں۔ اقتدار میں آنے کے لیے مزاروں پر چادریں چڑھائیں' ایک چادر خود پر بھی چڑھا لی۔

مس پریشانی بے نظیر کم' بھٹو کی بیٹی' مرتضیٰ اور شاہنواز کی بہن' آصف کی بیوی اور بلاول کی ماں زیادہ ہوتی ہیں۔ ان میں عظیم سیاست دان بننے والی تمام خوبیاں موجود ہیں اور انہوں نے خود کو بڑی مشکل سے عظیم سیاست دان بننے سے روکا ہوا ہے اور اپنی مقبولیت کم کرنے کے لیے دن رات کام کر رہی ہیں۔ ان کا سیاسی سفر جو زیڈ اے (ذوالفقار علی بھٹو) سے شروع ہوا' اب اے زیڈ (آصف زرداری) تک آ گیا ہے۔

• شیطان

ایک دن ایک اداکارہ نے مجھ سے پوچھا۔ "اس دنیا کی رنگا رنگی اور خوبصورتی کس کے وجود سے ہے؟" یہ سوال کرکے وہ جواب بن کر سامنے بیٹھ گئی' لیکن جب میں نے کہا "شیطان کے دم قدم سے!" تو اس نے سر سے لے کر پاؤں تک مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے کہہ دیا ہو "میری وجہ سے۔" شیطان سے میرا پہلی بار باقاعدہ تعارف اس دن ہوا جب میری ملاقات اپنے گاؤں کے مولوی صاحب سے ہوئی' میں نے ان کی کسی بات پر اختلاف کیا تو انہوں نے میرے والد صاحب سے کہا "آپ کا لڑکا بڑا شیطان ہو گیا ہے۔" انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا کیونکہ اس دنیا میں پہلی بار اختلاف رائے شیطان ہی نے کیا۔ یوں وہ اس دنیا میں جمہوریت کا بانی بھی ہے۔

شیطان مرد کے دماغ میں رہتا ہے اور عورت کے دل میں۔ ہر آدمی شیطان سے پناہ مانگتا ہے اور کئی لوگوں کو وہ پناہ دے بھی دیتا ہے۔ شیطان اور فرشتے میں یہ فرق ہے کہ شیطان بننے کے لئے پہلے فرشتہ ہونا ضروری ہے۔ جہاں تک شیطان کا آدم کو سجدہ نہ کرنے کا تعلق ہے' وہ سب اس کا پبلسٹی سٹنٹ تھا جس کی وجہ سے اسے شہرت ملی کہ جہاں رحمان کا نام آتا ہے وہاں اس کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ ورنہ اس آدم کو تو وہ آج بھی سو سو سجدے کرنے کے لئے تیار ہے۔ میں شیطان سے کبھی نہیں گھبرایا لیکن برا آدمی دیکھ کر ہی ڈر جاتا ہوں کیونکہ شیطان برا فرشتہ ہے برا انسان نہیں۔

میں جب تک بزرگوں اور نیک لوگوں کے پاس رہتا ہوں' اپنا آپ برا لگتا ہے کیونکہ جب ان کی روزانہ نیکیوں کی گنتی سنتا ہوں تو خود کو برا سمجھنے لگتا ہوں۔ یہ تو بھلا ہو شیطان کا جس کے پاس جا کر مجھ جیسا بھی نیک لگتا ہے۔ کہتے ہیں شیطان نہ ہوتا تو برا آدمی نہ ہوتا لیکن میں کہتا ہوں شیطان نہ ہوتا تو کوئی اچھا آدمی نہ ہوتا کہ شیطان سے ڈر کر تو سارے نیکیاں کرتے ہیں۔

اس دنیا میں شیطان اکیلا نہیں بلکہ رحمان اکیلا ہے۔ جب آدمی اچھا کام کرنے جا رہا ہو شیطان ساتھ ہوتا ہے اور جب برا کام کرنے جا رہا ہو تو وہ شیطان کے ساتھ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں لاحول ولاقوۃ پڑھو تو شیطان غائب ہو جاتا ہے۔ میرا دوست "ف" کہتا "کسی کو غائب کرنا کون سا مشکل کام ہے' یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" ٹھیک کہتا ہے جب وہ بایاں ہاتھ بڑھا کر ادھار مانگتا ہے تو مقابل آنکھ جھپکتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔

شیطان کائنات کا سب سے پہلا صحافی ہے' جس نے اللہ تعالیٰ کو یہ خبر دی کہ آدم زمین پر جا کر کیا کیا کرے گا! یہی نہیں وہ پہلا وکیل بھی ہے جس نے آدم کو مشورہ دیا کہ پھل کھا لو پھر کوئی تم سے جنت کا قبضہ نہ لے سکے گا' ہمیشہ کے لئے یہیں رہو گے اور فیس مشورے میں جنت لے لی۔اپنی غلطی تسلیم کرنا دراصل خود کو انسان ماننا ہے۔ کیونکہ وہ صرف شیطان ہے جس نے آج تک اپنی غلطی تسلیم نہیں کی شاید اسی لئے ہم بھی آج کل اپنی غلطی نہیں مانتے۔

جھوٹ کے پاؤں نہیں پہیے ہوتے ہیں' مگر سچ کے پاؤں تو ہوتے ہیں مگر سر نہیں ہوتا۔ اس دنیا کا پہلا سچ شیطان نے بولا جو یہ تھا کہ آدم زمین پر جا کر فساد برپا کرے گا۔ کہتے ہیں اکیلے آدمی کے ساتھ دوسرا شیطان ہوتا ہے۔ اسی لئے میں ساتھ ہوں' تو "ف" کہنے لگتا ہے "وہ خود کو اکیلا محسوس کر رہا ہے۔"

اس دنیا کا پورا نظام شیطان کی وجہ سے چل رہا ہے' اگر شیطان نہ رہے تو کوئی انسان نہ رہے' سب فرشتے ہو جائیں۔ ہمیں انسان رہنے کے لئے شیطان چاہیے۔ وہ نہ ہوتا تو مولویوں اور واعظوں کے بچے بھوکے مر جاتے کہ یہی تو ان کا ذریعہ روزگار ہے۔ شیطان نہ ہو تو وہ کس کے خلاف تقریریں کریں یہ سارے حسن کے بازار' رقص و موسیقی کی محفلیں اسی کے دم قدم سے تو ہیں' یہی نہیں عبادت گاہیں بھی اسی سے پناہ مانگنے کے لئے ہیں۔ وہ نہ ہوتا تو کوئی سیاست دان اور شاعر نہ ہوتا۔ عورت کا تو کوئی کام ہی نہ رہ جاتا۔ کہتے ہیں عورت زمین پر شیطان کی ایجنٹ ہے۔ یہ ٹھیک لگتا

ہے کیونکہ شیطان بھی تو مذکر ہی ہے۔

شیطان سب سے اچھا فرشتہ تھا مگر برا تب بنا جب وہ بول پڑا' اسی لئے پیدا ہونے والے بچے فرشتے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں بولنا نہیں آتا اور جونہی وہ فرافر بولنے لگتے ہیں ماں باپ کہتے ہیں یہ شیطان ہو گئے ہیں۔

انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ بندے کے پاس شیطان ہے اور جانوروں کے پاس رحمان تو ہے مگر شیطان نہیں۔ شیطان نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے ورنہ تو وہ ایک سماجی جانور ہے۔ جس دن جانوروں کو یہ شعور مل گیا کہ ایک شیطان کی راہ ہے اور ایک رحمان کی۔ اپنی مرضی سے جو چاہو چن لو' اسی دن جانور بھی اشرف المخلوقات میں سے ہو جائیں گے۔ "ف" کہتا ہے "جانور تو سگریٹ بھی نہیں پیتے' جھوٹ بھی نہیں بولتے' وہ اشرف المخلوقات کیسے بن سکتے ہیں؟"

اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں پر کتابیں اتاریں' کچھ ادیبوں کی کتابیں پڑھ کر تو لگتا ہے شیطان نے بھی اپنے برگزیدہ بندوں پر کتابیں اتاری ہیں۔ شیطان کی عمر کیا ہے؟ وہ بوڑھا ہے یا ادھیڑ عمر! میں نہیں جانتا لیکن اتنا پتہ ہے کہ اسے وہ سب پسند ہے جو صرف جوانی میں ہی پسند کیا جا سکتا ہے۔

وہ جگہیں جہاں صرف خدا کو یاد کیا جاتا ہے' وہ ویگنیں یا بسیں ہیں ورنہ عبادت گاہوں میں تو زیادہ تر شیطان ہی کے بارے میں تلقین ہوتی ہے۔ بڑے بوڑھے بچوں کو ابتدا ہی سے شیطان سے ڈرانا شروع کر دیتے ہیں تاکہ وہ ان کا ادب کرتے رہیں۔

میرا دوست "ف" کسی اداکارہ کو برتھ ڈے پر بھی برتھ ڈے سوٹ میں دیکھ لے تو شیطان کو برا بھلا کہنے لگتا ہے اور آج کل وہ دن رات شیطان کو برا بھلا کہنے کے مواقع ڈھونڈتا رہتا ہے۔ ویسے اگر شیطان نہ ہوتا تو اردو ادب کو بڑا نقصان پہنچتا' ڈاکٹر شفیق الرحمان مزاح نگار کیسے بنتے!

شیطان انسان کا دوست ہے یا دشمن ' اس کا تو پتہ نہیں۔ اتنا پتہ ہے کہ دوست اپنی برائی آپ کے نام لگا کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں جبکہ آپ برائی کرکے شیطان کو

برائی الذمہ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں مولوی حضرات ہمیں دنیا میں ہر اس چیز سے منع کرتے ہیں جسے حاصل کرنے کے لئے ہی وہ جنت میں جانا چاہتے ہیں' حالانکہ جنت اور دنیا کا بڑا فرق ہی یہ ہے کہ جنت میں شیطان نہ ہو گا۔

شیطان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اسے موت نہیں آتی' ورنہ وہ اتنا شیطان نہ ہوتا۔ پہلے اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا تو شیطان بنا' اب اسے شیطان رہنے کے لئے آدم کو روز سجدہ کرنا پڑتا ہے۔

جس دن انسان نے پہلی بار کسی دوسرے کی دھڑکن سنی اور اس نے چاہا کہ یہ آواز دوسروں کو سنائے تو اس نے ڈھول بنایا۔ پچھلے ہفتے میں اپنے گاؤں گیا تو ڈھول کی دھڑکن گاؤں کے سینے میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ لوگوں نے ایک پہلوان کو کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور دنگل جیتنے کی خوشی میں اس کے گلے میں ہار ڈال رہے تھے۔ جو یہ دنگل ہارا تھا' سر جھکائے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ مجھے عجیب سا لگا کہ کاندھوں پر تو اسے اٹھانا چاہیے جس کی وجہ سے سب کو یہ خوشی نصیب ہوئی۔ اگر وہ نہ ہوتا تو جسے سب لوگوں نے کاندھے پر اٹھا رکھا تھا ' کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ آج انسان اشرف المخلوقات ہے' اسے اگر تمام مخلوقات نے اس رتبے کی وجہ سے کاندھوں پر بٹھایا ہے تو صرف اس لئے کہ یہ شیطان سے دنگل جیتتا رہتا ہے۔ اس لئے شیطان کی سلامتی کی دعا مانگنا چاہیے کیونکہ اس کی سلامتی کی دعا ہماری بلند قامتی کی دعا ہے۔

○○○

• دکن کی طوائف

وہ پیدائشی طوائف ہے اس لیے جب بھی بات کرے گی یہ کہہ کر شروع کرے گی "عرض کیا ہے!" طوائف کو سننے کے لیے دولت چاہیے' علم بھی دولت ہے اس لیے اسے سننے کے لیے جیب خالی ہو تو ہو' سر خالی نہیں ہونا چاہیے۔ قصیدہ اس کی ماں اور رودکی اس کا باپ تھا۔ فارسی میں پیدا ہوئی تو اس کا نام غزل رکھا گیا۔ ولی دکنی اس کا باوا آدم ہے جو اسے فارسی سے زمین اردو پر لایا۔ اس زمانے میں بھی اس کے ساتھ تعلق رکھنے والا شریف کی بجائے شاعر کہلایا' آج بھی یہی کہلاتا ہے اور اس کا مجرا مشاعرہ کہلاتا ہے۔

ہر شخص نے اسے حرم زوگی کے بعد اپنا نام دیا مگر سب نے اسے اپنے اصلی نام کی بجائے کوئی اور نام ہی بتایا اور خود کو مخلص ظاہر کرنے کے لیے اس نام کو تخلص کہا۔

غزل کا انداز بھی طوائفوں والا رہا۔ جس نے تنہائی میں اسے پڑھا یہی سمجھا یہ صرف میرے لیے ہے۔ تنقید ادب کا شعبہ پولیس ہے جس نے چھاپے مار مار کر کئی لوگوں سے اسے چھڑوایا' بااثر افراد کو سپلائی بھی کیا۔

غزل اور نظم میں وہی فرق ہے جو محبوبہ اور منکوحہ میں ہے۔ نظم میں بڑا نظم و ضبط ہوتا ہے۔ نظم' سنانے والے کا اور ضبط سننے والے کا۔ نثر تو نری شریف زادی ہے جو باتیں آپ غزل میں کہہ دیتے ہیں' نثر میں کہہ دیں تو آپ کو کوڑے پڑ جائیں۔

جس معاشرے میں شاعری نہ پڑھی جائے وہ معاشرہ بڑا ظالم ہوتا ہے اور جس میں شاعری نہ کی جائے وہ بڑا مظلوم ہوتا ہے۔ شاعر تو بے چارہ کھانا بدوش ہے۔ وہ خوابوں کے محل بناتا ہے' نقاد ان محلوں کو کرائے پر چڑھا دیتا ہے' جبکہ پبلشران کا کرایہ وصول کرتا ہے۔ شاعری امن کی علامت ہے۔ "ف" کہتا ہے "واقعی پہلے جو چھوٹی چھوٹی بات پر

ایک دوسرے کو گالیاں دیتے' اب ایسی بات ہو تو ایک دوسرے کو اپنے شعر ہی سناتے ہیں۔" یہی نہیں شاعروں کے ساتھ رہنے سے بندہ پر امن ہو جاتا ہے۔ اس لیے اولاد کو کبھی ان کے مرنے کے بعد جائیداد پر جھگڑتے نہیں دیکھا' جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ اس قدر امن پسند ہوتے ہیں کہ وجہ لڑائی چھوڑتے ہی نہیں۔

کہتے ہیں پانی پینے والے شاعر کی شاعری زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتی۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو پھر یہ بھی غلط نہیں کہ شراب پینے والا شاعر خود زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتا۔ اگر کوئی شاعر بہت گھٹیا شعر سن کر بھی شرمندہ اور پریشان نہ ہو تو اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے' وہ یہ کہ یہ شعر اس کا اپنا ہو گا۔

ہمارے شاعروں کے قدم سڑک پر اور خیال آسمان پر ہوتا ہے۔ اکثر جب خیال سڑک پر آتا ہے' قدم آسمان پر پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ شاعری کرنا بہت مشکل ہے اور اس سے مشکل اگر کوئی کام ہے تو وہ ہے شاعری پڑھنا۔ میرا ایک دوست تو شاعری کی ایک کتاب پڑھ کر درخت کاٹنے کے خلاف ہو گیا۔ جس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ ان درختوں کو کاٹ کر ان سے کاغذ بنایا جاتا ہے جس پر ایسی کتابیں چھپتی ہیں۔ ویسے اچھی غزلوں کی کتاب وہ ہوتی ہے جسے پڑھنے میں اتنی ہی دیر لگے جتنی دیر اسے لکھنے میں لگی۔

"ف" کہتا ہے:"مشاعرے میں پڑھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔" حالانکہ مشاعرے میں نہ پڑھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ وہ کہتا ہے "میں کئی مشاعروں میں پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاعری کتابی صورت میں دوسروں تک پہنچانا زیادہ محفوظ طریقہ کار ہے کہ اس میں چوٹ لگنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔" ویسے لوگ اس کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ جونہی وہ مشاعرہ پڑھنے کے لیے اٹھتا' سارا ہال اٹھ کھڑا ہوتا۔ اس کا مقطع تو اس قدر پسند کیا جاتا ہے کہ جونہی وہ اپنی غزل کا پہلا شعر سناتا' آوازیں آنے لگتیں "مقطع! مقطع!...."

ہر شعر کے تین مطلب ہوتے ہیں' ایک شاعر کا' دوسرا آپ کا اور تیسرا شعر کا اصل مطلب۔ جو کسی شاعر پر زیادتی کرنا چاہیں' وہ اس کے اچھے شعر پر داد نہیں دیتے اور

مزید زیادتی کرنا چاہیں وہ برے شعر پر داد دینے لگتے ہیں۔
شاعر جوانی میں کئی سال بعد بھی گھر جائے تو وہاں جا کر وہ جو دوسرا کام کرے گا وہ بیوی کو شعر سنانا ہی ہو گا اور اگر بوڑھا ہوا تو پہلا کام بھی یہی ہو گا۔ اکثر شاعروں کی غزلیں دور دور تک گائی جاتی ہیں۔ اگر چند گھڑی ان کے پاس بیٹھ جائیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ دور دور کیوں گائی جاتی ہیں؟
میرا دوست "ف" کہتا ہے "میری بیوی میری کتابوں کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرتی ہے۔" واقعی یہ میں نے خود دیکھا ہے۔ ایک دن جب ان کے ہاں گیا' رستہ دکھا رہی تھی۔ ابھی آدھی کتاب ہی روشن ہوئی تھی کہ بجلی آ گئی۔ وہ کہتا ہے "میری بیوی شاعری کی کتابوں کا اتنا ہی احترام کرتی ہے' جتنا آسمانی کتابوں کا۔" واقعی گھر میں وہ انہیں اتنی بلند جگہ پر رکھتی ہے جہاں بچوں اور اس کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ ویسے "ف" کی غزلوں کی زبان ایسی ہے کہ بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے اللہ اس کی زبان دراز کرے۔
دنیا کا سب سے خوبصورت تہہ در تہہ شعر خاموشی ہے کہ ہر کوئی اس سے اپنی مرضی کا مطلب نکال کر محظوظ اور محفوظ ہو سکتا ہے۔ ہمارے شاعروں نے بڑی حکیمانہ شاعری کی ہے کہ حکیموں کی مسلسل دوائیوں سے بھی جن کو بے خوابی اور نیند نہ آنے کی بیماری سے نجات نہ ملی انہیں ایک ہی غزل سے افاقہ ہوا۔ آج کل سنا ہے عالم چنا بھی شاعری شروع کر رہا ہے' چلو اس کی وجہ سے ہم یہ تو کہہ سکیں گے کہ ہمارے ہاں کوئی عالمی قد کا شاعر ہے۔
کہتے ہیں عورتوں سے باتیں کرنا غزل کہلاتا ہے تو پھر عورتوں کا باتیں کرنا نثری نظم ہوا۔ یوں دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جس نے غزل نہ کہی ہو یعنی جس نے عورت سے بات نہ کی ہو۔ غزل عورت کی سطر پوشی ہے۔ یوں یہ زنانہ صنف سخن ہے۔ شاید اسی لیے اس میں وزن کا اتنا ہی خیال رکھنا پڑتا ہے جتنا عورتوں کو اپنے وزن کا۔ "ف" کہتا ہے کہ ہمارے ہاں غزل پڑھ کر یہ نہیں لگتا کہ شاعر تنہائی میں عورت سے باتیں

کر رہا ہے، بلکہ لگتا ہے عورتوں کے اجتماع سے خطاب کر رہا ہے۔
غزل تو لفظوں سے بنی خوبصورت پینٹنگ ہے جو ویسی ہی لگے گی جیسا دیکھنے والا ہو گا۔

خیال اس کا بدن اور لفظ اس کا لباس ہے، اسی لیے کم سے کم لفظوں میں زیادہ بھلی لگتی ہے۔ جس نے کبھی شاعری نہیں کی وہ اس پرندے کی طرح ہے جس نے کبھی پرواز نہیں کی۔ جب تک انسان شاعری کرتا رہتا ہے وہ جوان رہتا ہے اور جب تک انسان جوان ہوتا رہے گا شاعری ہوتی رہے گی۔



• فن کا لیبر روم

فن و ثقافت سے وابستہ جو شخص یہ کہے کہ میں اعظم خورشید کو نہیں جانتا' وہ جھوٹ بول رہا ہے اور جو یہ دعویٰ کرے کہ میں اسے جانتا ہوں وہ بھی جھوٹ بول رہا ہے۔

وہ بڑا مشکل آدمی ہے اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ بڑا آسان لگتا ہے۔ شکل و صورت سے اپنا بیٹا اور کام سے اپنا باپ لگتا ہے۔ لباس کے معاملے میں اس قدر محتاط کہ رات کو سوتے وقت پہلو بعد میں بدلتا ہے' لباس پہلے بدل لیتا ہے۔ وہ تو جس کے پاس بیٹھے اس نے جو ساڑھی صبح پہنی ہو' شام کو بدلی ہو گی۔ اگر ساڑھی وہی ہے تو پہننے والی بدلی ہو گی۔ خوبصورتی سے اس قدر لگاؤ ہے کہ جس کام کا نتیجہ خوبصورت نہ ہو اس کام کو غلط سمجھتا ہے۔

اعظم خورشید آئینے کی طرح ہے اور آج تک کوئی آئینہ ایسا نہیں بنا جس نے عورت سے کہا ہو کہ تم خوبصورت نہیں۔ عورت کے منہ پر سچ کہنا دراصل اسے برا بھلا کہنا ہے بلکہ جو شخص کہے میں نے کبھی عورت سے جھوٹ نہیں بولا' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ساری عمر عورت سے نہیں بولا۔ اعظم خورشید اپنے بارے میں اس قدر سچ بولتا ہے کہ جھوٹا لگتا ہے۔ اس کی گھڑی ٹائم صحیح بتائے نہ بتائے ڈیٹ صحیح بتائے گی' اس لئے جب بھی گھڑی دیکھے گا یہ جاننے کے لئے کہ اب کون سی ڈیٹ کا وقت ہے۔ اس کی لائف ہسٹری ذرا سی ایڈٹ کر لی جائے تو حسینہ معین کی کئی سیریلز بن سکتی ہیں۔

موڈ میں ہو تو گیت سنائے گا' تعریف کرو تو اور سنائے گا' نہ کرو تو بھی اور سنائے گا کہ یہ پہلے سے بہتر ہے۔ ایک سگریٹ پینے میں پندرہ منٹ لگا دے گا۔ "ف" بھی اتنی ہی دیر لگاتا ہے لیکن اس میں چودہ منٹ سگریٹ مانگنے کے ہوتے ہیں۔

اپنے کسی ذاتی مسئلے کے لئے پانچ منٹ سے زیادہ پریشان نہیں ہوتا۔ اگر وہ ذاتی مسئلے کے لئے اس سے زیادہ پریشان رہے تو یقین کر لیں یہ مسئلہ ذاتی تو ہے مگر کسی اور کا۔ ویسے وہ اکیلا پاکستان کی آدھی آبادی کے مسئلے حل کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ آدھی آبادی اس لئے کیونکہ پاکستان میں اتنی ہی عورتیں ہیں۔

اس کی صحت کا راز رات کو دیر سے سونے اور صبح دیر سے اٹھنے میں ہے۔ یوں بھی شہروں میں جو جلدی سوئے اور صبح جلدی اٹھ جائے' محلے والے اس پر شک کرنے لگتے ہیں۔ اس قدر خود پسند ہے کہ پوچھو "تم نے خوب دوبئ کی سیر کی؟" تو کہے گا۔ "ہاں میں نے خوب دوبئ کو سیر کرائی" وہ نئے انداز سے بات کرتا ہے۔ کوئی کہے کہ سالن میں نمک زیادہ ہے تو وہ کہے گا ہاں اس نمک میں سالن کم ہے۔

ٹی وی پروڈیوسرز ہوم ورک کے بہت قائل ہیں۔ اس لئے جن کو ڈراموں میں کام دیتے ہیں ان سے "ہوم ورک" بھی کراتے ہیں۔ اعظم جانتا ہے کہ ہر زمانے میں ہدایت ہمیشہ اوپر سے اتری' اس لئے ٹی وی کا افسر ہوتے ہوئے وہی کرتا ہے جس کی ہدایت اوپر سے آتی ہے۔

اعظم خورشید شعر کہتا نہیں' شعر پیدا کرتا ہے مگر "بڑے آپریشن" سے! جو لفظ دوسرے کی سمجھ میں نہ آئے گفتگو میں استعمال نہیں کرتا' نظم میں کرتا ہے۔ اس کی شاعری اسی کی طرح کی ہے یعنی مشکل اور خوب شکل! سنا ہے آج کل وہ اپنی نظموں کو منظوم کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اس کے شعر سے بندہ چار بار محظوظ ہوتا ہے۔ ایک بار جب وہ شعر سناتا ہے' دوسری بار اس وقت جب آدمی سنتا ہے' تیسری بار جب یہ شعر سمجھاتا ہے اور چوتھی بار جب بندے کو شعر کی سمجھ آتی ہے۔ ہمیشہ اپنا غیر مطبوعہ کلام سناتا ہے جسے سن کر کلام سمجھ آئے نہ آئے اس کے غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سمجھ آ جاتی ہے۔

جن میاں بیوی میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا' مجھے ان پر ترس آتا ہے کیونکہ اس کی ایک

ہی وجہ ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے آج تک ایک دوسرے کو میاں بیوی تسلیم ہی نہیں کیا۔ عبیدہ اعظم اور خورشید اعظم کے تعلقات سے ایسا ہی لگتا ہے۔ عبیدہ اس کی بیوی تو لگتی ہے مگر ہونے والی۔ آدمی جس نظر سے دوسروں کی بیویوں کو دیکھتا ہے اس نظر سے ایک بار اپنی بیوی کو دیکھ لے تو ایک ہفتہ کی خوشگوار ازدواجی زندگی کی ضمانت دے سکتا ہوں۔ اگر زیادہ بار دیکھ لیا تو پھر خوشگوار ازدواجی زندگی واقعی ایک ہفتہ ہی ہو گی۔ اکثر دوست عبیدہ اور اعظم کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔ ان کی پریشانی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ دونوں کبھی پریشان نہیں ہوتے۔

گھر میں اعظم کا کمرہ آپ کو ایک نامکمل سا عجائب گھر لگے گا جو آپ کے جاتے ہی مکمل ہو جائے گا۔ اس کمرے میں سکوں سے لے کر سکون تک اور ذرے سے لے کر خورشید تک بڑی نایاب کولیکشن ہے۔ اسے پرانی چیزوں سے بہت لگاؤ ہے جس کی وجہ سمجھ میں آئے نہ آئے' اس کی کامیاب ازدواجی زندگی کی وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔ حالانکہ بیوی جتنی پرانی ہو اتنی ہی پرائی ہوتی ہے' لیکن وہ عجیب شخص ہے اس عمر میں بھی اس کے پاس بیوی سے چھپانے کو کچھ نہیں' حالانکہ جس لڑکی کے پاس شادی سے پہلے کچھ چھپانے کو نہ ہو جس مرد کے پاس شادی کے بعد کچھ چھپانے کو نہ ہو' ان دونوں کا میڈیکل چیک اپ ہونا چاہیے۔

اعظم خورشید جوان ہے یا بوڑھا' مجھے معلوم نہیں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں جو شخص ایک وقت میں ایک سے زیادہ لڑکیوں سے دوستی کرے' وہ بوڑھا نہیں ہو سکتا اور جو ایک وقت میں ایک سے زیادہ لڑکیوں سے دوستی نبھائے' وہ نوجوان ہرگز نہیں ہو سکتا۔ شاعروں اور اداکاروں کو عزت دیتا ہے۔ ظاہر ہے دوسروں کو وہی چیز دی جاتی ہے جو ان کے پاس نہیں ہوتی' مگر کسی سے کچھ نہیں لیتا۔ اس نے تو کبھی کسی لڑکی سے یہ نہیں کہا کہ دو ہاتھ! ہمیشہ کہا لو ہاتھ! وہ شاعر ہے مگر یہ دعا نہیں مانگتا کہ چاند اس کے گھر میں اترے' وہ خود چاند کے گھر میں اتر جاتا ہے۔ اگر آپ اسے پسند ہیں تو بڑی دیر

بٹھانے کے بعد آپ کا کام کرے گا اور اگر ناپسند ہیں تو آپ کے بیٹھنے سے پہلے ہی آپ کا کام کر دے گا۔

اعظم خورشید کو خوبصورتی سے عشق ہے اور ایک دن وہ خود کو آئینے میں دیکھ کر اپنے آپ پر عاشق ہو گیا۔ اس دن سے اپنے بالوں میں یوں انگلیاں پھیرتا ہے جیسے محبوب کے بالوں میں پھیر رہا ہو۔ اب تو اس نے شیشے کے سامنے کپڑے بدلنے شروع کر دیئے ہیں۔ اپنے دوستوں کی طرح خود کو بڑی لفٹ کرانے لگا ہے۔ جیسے امجد اسلام امجد اپنے ہر بال پر ایک منٹ لگاتا ہے' یوں اسے صرف بال سنوارنے میں پورے دس منٹ لگتے ہیں۔ مگر اعظم خورشید نے بال چھوٹے کرا لئے ہیں کہ بال اور قدم چھوٹے ہوں تو گرنے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔

جیسے اظہر جاوید کسی لڑکی کی تحریر اپنے رسالے میں نہ چھاپے تو اس سے اس کا رائٹر ہونا اتنا مشکوک نہیں ہوتا جتنا لڑکی ہونا! ایسے ہی جس سے اعظم تنہائی میں ملنے سے گھبرائے' لوگ اس کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اعظم خورشید گلوکار' موسیقار' اداکار' صدا کار' مجسمہ ساز' رائٹر یا ڈائریکٹر کس حیثیت میں سب سے اچھا ہے؟ تو میں کہوں گا وہ بحیثیت اعظم خورشید سب سے اچھا ہے۔ اسے ملنے کے بعد آپ کو اس سے محبت ہو نہ ہو' زندگی سے ضرور محبت ہو جائے گی۔

○○○

- ادبی معمہ

نام انور سجاد' کبھی کبھی خود کو سید انور سجاد لکھتا ہے جس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کبھی کبھی سید بھی ہوتا ہے جیسے اصغر سید اپنے نام کے ساتھ سید بعد میں اس لئے نہیں لگا تا کہ وہ سید بعد میں بنا۔ انور سجاد نے جو کچھ کیا' اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے نہیں' انہیں چھپانے کے لئے کیا۔ اور اس میں اس قدر صلاحیتیں ہیں کہ ان کو چھپانے کے لئے اسے افسانہ نگاری' مصوری نگاری' اداکاری' ہدایت کاری اور ڈاکٹری کرنا پڑی' البتہ یہ پتہ نہیں' ڈانسر کس صلاحیت کو چھپانے کے لئے بننا پڑا!!

تعلق ایسے گھرانے سے جس میں اگر کوئی شخص شعر سنانے لگتا تو اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جایا جاتا۔ یوں یہ لڑکپن میں شعر سناتے ہوئے بہت شرمندگی محسوس کرتا جس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی کہ یہ شعر اس کے اپنے ہوتے۔

عمر کے اس مقام پر ہے جہاں آرٹسٹ کا چہرہ ایسا ہو جاتا ہے کہ دیکھ کر لگتا ہے جیسے اس نے خود بنایا ہے۔ قد ایسا کہ جب تک کھڑا نہ ہو ٹانگیں زمین تک نہیں پہنچتیں۔ پاس ہو تو سب سے آخر میں اور دور ہو تو سب سے پہلے نظر آتا ہے۔ نظر کی عینک لگاتا ہے تاکہ لوگوں کو دور سے پہچان سکے' جس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اب لوگ اسے دور سے پہچان لیتے ہیں۔ دوران گفتگو آدھا فقرہ منہ سے اور آدھا ہاتھوں سے ادا کرتا ہے۔ حال دیکھ کر لگتا ہے کوئی چال چل رہا ہے۔ چپ ہو تو مجسمہ لگتا ہے' بول رہا ہو تو سننے والا مجسمہ لگنے لگتا ہے۔ وہ سنتا سب کی ہے مگر سمجھتا اپنی ہی ہے۔ کہتے ہیں دنیا میں تبدیلی سے زیادہ مستقل چیز کوئی نہیں اور تبدیلی اس قدر پسند رہی کہ جب کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا ہر سال اپنے تمام کلاس فیلوز بدل لیتا تھا۔ آخر کار ڈاکٹر بننے کے بعد اس نے تہیہ کیا کہ آئندہ کبھی ڈاکٹر نہیں بنوں گا۔ کالج ہمیشہ

اس نیت سے گیا جس سے مولوی حضرات جنت جانا چاہتے ہیں۔ وراثت میں والد صاحب کی طرف سے جس جائیداد کا انتقال اس کے نام ہوا' وہ ہزاروں مریض تھے۔ اسے اپنے آپ سے اس قدر محبت ہے کہ کوئی دوسرا اس سے محبت کرے تو اسے اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے۔ دوست اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ ویسے بھی ڈاکٹر کو جو سنجیدگی سے سن رہا ہو وہ مریض ہی ہو سکتا ہے۔ مختصر چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ اسے دیکھ لو تو وجہ بھی سمجھ آ جاتی ہے۔

آج کل افسانوں میں جو علامتیں استعمال ہوتی ہیں' یہ وہ علامتیں ہیں جنہیں بتا کر بندہ ڈاکٹر سے دوائی لے سکتا ہے۔ طویل مختصر افسانہ وہ ہوتا ہے جو لکھنے میں مختصر اور پڑھنے میں طویل ہو۔ جب کہ علامتی افسانہ وہ ہوتا ہے جس کا مطلب قاری افسانہ نگار کو بتاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سجاد افسانہ لکھنے کے بعد اسے پڑھتا ہے' اگر سمجھ میں آ جائے تو رکھ لیتا ہے ورنہ چھپوا دیتا ہے۔ دوسروں کے افسانے بندہ سارا دن پڑھتا ہے اور اس کا افسانہ سارے دن میں پڑھتا ہے۔ ایک پوری نسل نے انور سجاد کے سٹائل پر افسانہ لکھنے کی کوشش کی' جس کی وجہ یہ نسل یہ بتاتی ہے کہ علامتی افسانہ پڑھنے کی نسبت لکھنا آسان ہوتا ہے۔ اگر آپ افسانہ پڑھ کر کنفیوژ نہ ہوں تو اس کی ایک ہی وجہ ہے وہ یہ کہ آپ نے توجہ سے پڑھا نہیں۔ ویسے ایسا علامتی افسانہ بھی لکھا جا سکتا ہے جسے پڑھ کر قاری عش عش کر اٹھے اور اس کے لئے صرف ایک بات ضروری ہے وہ یہ کہ قاری لکھنے والا خود ہو۔

کہتے ہیں جو عورت آپ کو اچھی لگے وہ خوبصورت اور جسے آپ اچھے لگیں خوب سیرت ہوتی ہے۔ وہ عورت جو اپنے حسن سے لوگوں کو متاثر کرے اسے حسینہ اور جو مردوں کے حسن سے آپ کو متاثر کرے اسے حسینہ معین کہتے ہیں۔ انور سجاد بھی اپنے جس ڈرامے میں خوبصورت چہرہ دیکھنا چاہے اس میں خود اداکاری کر لیتا ہے۔ وہ ڈرامے میں جو رول کرے وہ ہٹ ہو جاتا ہے اگر رول نہ کرے تو ڈرامہ ہٹ ہو جاتا ہے۔

وہ ڈاکٹر ہے اور پھر یہ اسپیشلائزیشن کا دور ہے۔ اس لئے اسے کسی عورت کی بائیں

آنکھ سے عشق ہوتا ہے تو کسی کے دائیں کان سے۔ آج تک وہ کسی عورت کو مکمل طور پر ناپسند نہیں کر سکا۔ اگر کسی لڑکی سے ناراض ہو جائے تو اس کا نیچے کا ہونٹ اور نیچے آ کر پھڑکنے لگتا ہے اور اس وقت تک پھڑکتا رہتا ہے جب تک لڑکی کو ناراض نہ کر لے۔

غصے میں نہیں لکھ سکتا' اس لئے پینٹنگ کرنے لگتا ہے اور اچھا فن پارہ وہی ہوتا ہے جسے دیکھ کر بندے کے وہی احساسات ہوں جو بناتے وقت فن کار کے تھے۔ تنہائی میں کام کرتا ہے اور وہ "روم" جہاں دنیا کے ہر بندے کو تنہائی میسر ہوتی ہے' یہی اس کا سٹوڈیو ہے۔ اس کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ہر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا' اور اس کی خوش قسمتی بھی یہی ہے۔ وہ تو کار چلا رہا ہو تو صرف اسے پتہ ہوتا ہے ' کار چلا رہا ہے دوسرے سمجھتے ہیں ہوائی جہاز چلا رہا ہے۔

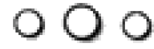
آسان بات بڑی آسانی سے مشکل بنا دیتا ہے۔ وقت کا اس قدر پابند ہے کہ اگر کہیں پہنچنے میں اسے دیر ہونے کا اندیشہ ہو تو یہ بتانے وقت پر پہنچ جائے گا کہ میں شاید وقت پر نہ پہنچ سکوں۔

شہرت کے لئے کسی نام کا سہارا نہیں لیا' بلکہ کئی انگریزوں کی تحریروں کو اپنے نام کا سہارا دیا۔ پھر بھی اردو کے ان ادیبوں میں سے نہیں جن کی کتابیں ہاٹ کیک کی طرح بکتی ہیں یعنی اسی نوے روپے کلو!

انور سجاد کا کوئی دوست نہیں۔ اگر وہ کہے میں کسی کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہوں تو یقین کر لیں اس کا اشارہ عینک کی طرف ہے ان لوگوں کے پاس بھی بیٹھتا ہے جن کے پاس سے لوگ صرف اٹھتے ہیں۔

ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔ اسے کوئی سزا دی جا سکتی ہے تو وہ ہے "آرام کرو" کئی اداکاروں اور فن کاروں کے حالات سنوارنے کے لئے کام کرتا رہا۔ ایک اداکارہ کے حالات سنوارنے میں کامیاب بھی ہوا۔ انور سجاد کا کام اتنا ہے کہ ایک بار ہمسائے ملک کے دورے پر جانے سے پہلے اس نے انہیں اپنی تخلیقی کاوشوں کی فہرست بھیجی

تو انہوں نے اپنے سفارت خانے کو لکھا کہ پتا کرو کتنے آدمی ہیں؟"
انور سجاد وہ نہیں کرتا جو سب کرتے ہیں۔ وہ تو اس راستے سے گھر میں داخل نہیں ہوتا جس سے دوسرے داخل ہوتے ہیں اور جب کبھی دن کو گھر آ جائے تو ملازم جا کر بتاتے ہیں کہ رات والے صاحب آئے ہیں۔ انور سجاد ان لوگوں میں سے ہے جو جنت میں جانے کی کوشش کرنے کی بجائے دوزخ کو ائرکنڈیشن کرنے کا سوچتے ہیں۔
میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر پاکستان میں مرد بچے پیدا کرنے لگے تو یہ تخلیقی کام کرنے والا سب سے پہلا مرد انور سجاد ہو گا۔



• حوا کی بیٹی

حوا کی بیٹی دنیا میں دو بار جنم لیتی ہے۔ ایک بار ماں کے پیٹ سے اور دوسری بار ڈولی کے پیٹ سے۔ مگر ہمارے ہاں پہلی اور دوسری پیدائش میں کوئی خاص فرق نہیں' یعنی دونوں بار پیدا ہونے کی تاریخ' جگہ اور لوگ جن کے ہاں ایسے پیدا ہونا ہوتا ہے ان کے انتخاب میں اس کی رائے نہیں لی جاتی۔

اس کا جسم گولائیوں سے مل کر بنا ہے جب کہ آدمی کا زاویوں سے۔ اس کا وجود پیاز کی طرح ہے جتنی مرضی پرتیں اتاریں پھر بھی کوئی نہ کوئی گولائی موجود ہو گی بلکہ یہ خود بھی اس وقت تک موجود ہو گی جب تک کوئی نہ کوئی پرت ہو گی۔

دنیا کی سب سے پہلی عورت' مرد تھی پھر اسے حضرت آدم کے سینے سے علیحدہ کیا گیا مگر آدم کے علاوہ دنیا کا ہر مرد پہلے عورت ہوتا ہے۔ نو مہینے بعد وہ اس کے جسم سے علیحدہ ہوتا ہے اسی لیے ساری زندگی اسے سب سے زیادہ کشش اپنے اصل ہی کی ہے۔

حوا تو وہ سیڑھی ہے جس کے ذریعے انسان عرش سے فرش پر اترتا ہے اور باقی ساری زندگی واپس چڑھنے کا سوچتا رہتا ہے۔

اس میں اور مرد میں وہی فرق ہے جو پھل اور بیج میں۔ پھل میں ذائقہ اور کئی بیج ہوتے ہیں جبکہ بیج میں پورا شجر۔ وہ آئینے کی طرح ہے یعنی اس میں وہی نظر آتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتا ہے۔

وہ اس دنیا کی سب سے پہلی تخلیق کار ہے مگر اپنی تخلیق مرد کے ہاتھوں تنگ ہے۔

جس نے اسی کا خدا (مجازی) ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے۔

اسے خوش کرنا سب سے آسان اور اسے خوش رکھنا سب سے مشکل ہے۔ اس کو حاصل کرنا آرٹ اور اسے رکھنا سائنس ہے۔ اسے وہ سب سے زیادہ جانتا ہے جس کو یہ پتہ نہیں ہے کہ وہ ابھی اسے نہیں جانتا۔

خاموشی ایک لباس ہے شاید اسی لیے عورتوں کو پسند نہیں۔ کہتے ہیں مرد اس وقت مرتا ہے جب اس کی نبض رک جائے اور عورت اس وقت جب اس کی زبان۔ زبان اس کے جسم کا سب سے سخت عضو ہے۔ دنیا کے آدھے مسائل اس کے پیدا کردہ ہیں اور باقی آدھے ان مسائل کو سلجھانے کی کوشش میں پیدا ہوئے ہیں۔ وہ آنکھوں سے زیادہ کانوں کا استعمال کرتی ہے اور مرد کانوں سے زیادہ آنکھوں کا۔

اگرچہ شادی شدہ عورتوں کو مردوں میں برابر برابر تقسیم کرنے کا نام ہے' پھر بھی اس کی آدھی عمر شادی کے انتظار میں گزرتی ہے اور باقی اس کی یاد میں۔ کہتے ہیں مرد محبت کے لیے شادی کرتا ہے اور عورت شادی کے لیے محبت۔

عورت اس دنیا کی خوبصورت بد صورتی ہے اور مرد بد صورت خوبصورتی۔ اس دنیا میں عورت کی سب سے بڑی محافظ اس کی بد صورتی ہے اور وہ سب سے خوبصورت اس وقت ہوتی ہے جب حاملہ ہو۔ مسکراہٹ اس کے چہرے کا نقاب ہے اور نقاب میں اصلی چہرہ نظر نہیں آتا۔ اس کے لیے سب سے بڑی گالی یہ ہے کہ تم بوڑھی ہو۔ وہ میک اپ جس میں وہ سب سے خوبصورت لگتی ہے "خوشی" ہے۔ اس کا لباس اس کے جسم کی روح ہے۔

حوا کی بیٹی اس دنیا میں اللہ کا سب سے بڑا اور حسین انعام ہے اسی لیے ہر کوئی چاہتا ہے سب سے پہلے یہ انعام اسے مل جائے۔ اچھی بری عورت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ کس بات پر خوش ہوتی ہے۔ اس کے بناؤ سنگھار اور طور اطوار سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ دنیا میں ایک شخص ہے جو دوسروں کو اس کی عزت نہیں کرنے دیتا اور وہ یہ خود ہے۔ یہ مرد کو بیوقوف جانتی ہے اور مرد اسے بیوقوف مانتا ہے۔ عورت سب سے طاقتور اس وقت ہوتی ہے جب مرد اسے کمزور کہے۔ مرد اس وقت بوڑھا ہوتا ہے جب وہ محسوس کرے اور عورت اس وقت بوڑھی ہوتی ہے جب دوسرے محسوس کریں۔

کہتے ہیں حوا دنیا میں شیطان کی ایجنٹ ہے۔ یہ بات درست لگتی ہے۔ کیونکہ شیطان بھی

تو مذکر ہی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عورتوں کی بہترین خصلتیں وہ ہیں جو مردوں کی بد ترین صفتیں ہیں۔ غرور' بزدلی اور کنجوسی۔

تاریخ گواہ ہے مرد دنیا میں سب سے زیادہ عورت سے متاثر ہوا۔ اس سے زیادہ اسے کوئی جنگ بھی متاثر نہ کر سکی لیکن "ٹ" کہتا ہے' عورت بیچاری کیا کر سکتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ جنت سے نکلوا سکتی ہے۔ اس بیچاری کو تو اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ لینے کے لیے بھی ایک مرد پیدا کرنا پڑتا ہے۔ ویسے حوا کی بیٹی نے مرد کو بڑے بڑے مسائل سے بچایا ہے۔ وہ اس کو چھوٹے چھوٹے مسائل میں اتنا مصروف رکھتی ہے کہ اس کے پاس وقت ہی نہیں رہتا کہ وہ بڑے بڑے مسئلوں کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو۔

کام کے معاملے میں مرد کمزور ہے یعنی وہی کام عورت' مرد سے کم زور پر کر لیتی ہے بلکہ مرد تو اس کے سارے کام کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ اسے سانس بھی نہ لینے دے۔

اس کی اور مرد کی نفسیات میں یہ فرق ہے کہ مرد یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی پہنچ میں کیا ہے بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کی پہنچ سے باہر کیا ہے جبکہ حوا کی بیٹی وہی کچھ دیکھتی ہے جو اس کی پہنچ میں ہوتا ہے۔ مرد چاہتا ہے وہ عورت کی زندگی کا پہلا مرد ہو جبکہ عورت چاہتی ہے کہ وہ مرد کی زندگی کی آخری عورت ہو۔

بڑی شکی القلب ہے حیرانی کی بات ہے کہ لوگ اس کے بارے میں متضاد رائے رکھتے ہیں اور اس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ بیک وقت صحیح بھی ہوتے ہیں۔

آزادی نسواں کی تحریک دراصل آزاد نسواں کی تحریک ہے اور وہ یہ چاہتی ہیں کہ وہ مرد کی مرضی سے اس کی غلام نہ بنیں بلکہ اپنی مرضی سے اس کی غلام بنیں۔ لینن نے کہا تھا عورت صحیح معنوں میں اس دن آزاد ہو گی جب گھر سے باہر نکلے گی۔ شاید اسی لیے ہمارے ہاں جب عورت کو گھر سے نکالتے ہیں تو کہتے ہیں جا تجھے آزاد

کیا۔ عورت چاہتی ہے کہ دنیا میں اس کی حکمرانی ہو۔ ہے بھی ٹھیک کہ دنیا تو بنی ہی اس کے لیے ہے ورنہ مرد کے لیے تو اللہ نے جنت بنائی تھی۔ مرد کو جنت سے دنیا میں لانا اسی کا کام ہے اور وہ آج بھی یہی کر رہی ہے کہ بچے کا پیدا ہونا دراصل اس کا جنت سے نکلنے کا عمل ہی تو ہے کہ ماں کے پیٹ سے زیادہ آسائشیں جنت میں کیا ہوں گی۔ یہی نہیں اس بچے سے زیادہ نیک لوگ جنت میں کم ہی ہوں گے۔

عورت اور مرد کا فطری رشتہ ایک ہی ہے جو حضرت آدم اور حضرت حوا کا تھا۔ باقی سارے رشتے انسان کی اپنی دریافت ہیں بلکہ خدا بھی انسان ہی کی دریافت ہے اور وہ شخص اتنا ہی عظیم ہوتا ہے جتنی عظیم وہ دریافت کرے۔

مختلف علاقوں میں لوگ حوا کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ دس عورتوں میں ایک روح ہوتی ہے۔ انگلستان میں کہاوت ہے "عورت تیرا نام کمزوری" جبکہ ایرانی' عورت کا دوسرا نام بیوفائی بتاتے ہیں۔ جاپانی فرماتے ہیں "جو عورت غور و فکر کرتی ہے خراب ہوتی ہے۔" اطالوی کہاوت ہے "گھوڑا اچھا ہو یا برا اس کے لیے مہمیز چاہیے۔" ایسے ہی عورت اچھی ہو یا بری اسے ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جرمن کہتے ہیں بدمعاشوں اور رذیلوں سے محبت کرنے والی ہستی خدا کے بعد عورت ہے جبکہ ہمارے ہاں ہے کہ عورت اور گھوڑی اس کی جس کے قبضے میں ہو۔ اس سے یہ پتہ چلے نہ چلے کہ عورت کیا ہوتی ہے یہ ضرور پتہ چل جاتا ہے کہ ان ملکوں میں عورت کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔

حوا غزل کا شعر ہے اور مرد نثر پارہ۔ نثر پارہ جیسا ہوتا ہے ویسا ہی رہتا ہے' مگر شعر کا مطلب تو ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا پڑھنے والا۔ یوں بھی ہمارے ہاں دو غزلے' سہ غزلے اور چہار غزلے کی قانونی اجازت ہے مگر کوئی دو مضمونہ' سہ افسانہ اور چہار افسانہ سننے میں نہیں آیا۔ چوری چھپے کی بات اور ہے۔

محبت عورت کی ایجاد اور مرد کی دریافت ہے۔ یہ وہ بیماری ہے جس میں مرد عورت کی بینائی کم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ اندھے بھی ہو جاتے ہیں۔

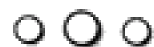
حوا کی بیٹی ہر کسی پر اعتبار کر لیتی ہے اس لیے ناقابل اعتبار ہے۔ کہتے ہیں جذبات مرد

کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور عورت جذبات کے ہاتھ میں' جذباتی ہو کر زندگی کے فیصلے کر لیتی ہے اور پھر ساری عمر انہیں عقل سے صحیح ثابت کرنے میں لگی رہتی ہے۔

حسن ظن سے زیادہ حسن زن سے کام لیتی ہے۔

اس کو وہی پسند ہے جو اللہ تعالٰی کو پسند ہے اور اللہ کو اپنی تعریف سننا پسند ہے۔ یوں بھی مرد کا عورت کی تعریف کرنا دراصل اپنی ہی پیدائش کو حق بجانب قرار دینا ہے ورنہ اس نے دل سے اسے آج تک بیوی' باندی اور بیوہ کے سوا کوئی مقام نہیں دیا۔

لیکن اللہ نے حوا کی بیٹی کو وہ رتبہ دیا ہے کہ اگر خدا کو زمین پر کسی روپ میں آنا پڑا تو وہ یقیناً مرد کی بجائے ماں کا روپ ہو گا۔



• مجرم ظریفی

خد و خال میں وہی ملائمت جو آوٹ آف فوکس تصویر میں ہوتی ہے جب تک بار نہ دیکھو اچھا نہیں لگتا' آپ اسے خوبصورت کہہ سکتے ہیں نہ بد صورت۔ بوڑھا کہہ سکتے ہیں نہ جوان' پاس بیٹھا ہو تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ جو کچھ کہنا ہوتا ہے اسی کو کہنا ہوتا ہے۔ عینک لگاتا ہے۔ کہتے ہیں' عینک آنکھ کا لباس ہے اسی لیے جب وہ عورتوں کے پاس بیٹھتا ہے عینک اتار لیتا ہے۔ اس کا پیٹ زنانہ ہے یعنی چند مہینوں میں باہر نکل آتا ہے اور پھر اندر چلا جاتا ہے حالانکہ ہمارے ہاں ادیبوں کے پیٹ ہی تو مردانہ ہوتے ہیں۔ یعنی جب بڑھتے ہیں تو پھر بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اس کی شخصیت ایسی ہے کہ آپ اسے ساتھ لے جا رہے ہوں تو دیکھنے والا یہی سمجھے گا وہ آپ کو لے جا رہا ہے۔ گروپ فوٹو میں اکیلا نظر آتا ہے اور سنگل تصویر میں ڈیوڑھا۔ اس کی کتاب "جرم ظریفی" پر اس کا کارٹون چھاپا گیا ہے جبکہ پہلی تین کتابوں روزن دیوار سے' خند مکرر اور عطائیے میں یہ کام اس کی تصویر ہی سے لیا گیا تھا۔

عطاء الحق قاسمی امرتسر میں پیدا ہوا اور سارا دن یہی ثابت کرنے میں لگا رہتا ہے۔ خاندان ایسا کہ اس کے آباء و اجداد مسجد میں پیدا ہوئے اور یہیں وفات پائی۔ پیر زادہ ہے مگر خود اسے پیری پسند نہیں لیکن آخر ایک دن اسے بھی پیر ہی ہونا ہے' سدا جوان کون رہا؟ جو کچھ کہتا ہے کرکے دکھاتا ہے۔ کہتا ہے' میں اس مذہبی گھرانے کا آخری چشم و چراغ ہوں۔

ہر کسی کے پاس نہیں بیٹھ سکتا۔ ہر کوئی اس کے پاس بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ جب چپ ہو تو سمجھ لیں اس کے پاس کہنے کو بہت ہے۔ دیر سے بے تکلف ہوتا اور دیر تک رہتا ہے۔ دوست اس کے پاس بیٹھ کر بڑی بڑی پریشانیوں سے بالا تر ہو جاتے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے انہیں وہ پریشانیاں چھوٹی چھوٹی لگتی ہیں۔ دوست دشمن دونوں کو

سینے سے لگا لیتا ہے مگر دوست کو دوست سمجھ کر اور دشمن کو دشمن سمجھ کر۔ کسی کے سامنے جھک نہیں سکتا جس کی وجہ مخالفین اور معالجین اس کی ریڑھ کی ہڈی کا درد بتلاتے ہیں۔ لوگ اپنی پہلی ہی ملاقات میں اس کے بارے میں اچھی رائے قائم کر لیتے ہیں جسے تبدیل کرنے کے لیے انہیں بڑی محنت کرنا پڑتی ہے اس کے ہاں لیفٹ رائٹ نہیں' رائٹ رانگ ہے۔ روز ملنے والے اسے خوش اخلاق نہیں مانتے اور کبھی کبھی ملنے والے ان کی یہ بات نہیں مانتے۔

کھانے کا اس قدر شوق کہ جو چیز اچھی لگے اسے کھانے والی نظروں سے دیکھتا ہے۔ آم دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے عام آم بھی یوں چوستا ہے کہ دروغ بر گردن راوی اسے یہ کچھ کرتا دیکھ کر ایک امریکن لڑکی نے اسے شادی کی پیش کش کر دی تھی۔ وہ سگریٹ' وعدہ' دوستی اور آم کبھی ادھورا نہیں چھوڑتا۔ اس بات پر بھی سبحان اللہ کہتا ہے جس پر اس کے ہم عمر لاحول ولا قوہ کہتے ہیں۔

کہتے ہیں بندہ ضائع کر دیتا ہے فقرہ ضائع نہیں کرتا۔ لیکن وہ فقروں سے بندہ ضائع نہیں کرتا' بندہ بنا دیتا ہے۔ جب اپنی پسند کا کالم پڑھنا چاہے کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ تقریبات میں اس کی تحریروں پر لوگ ایک ایک فقرے پر ہال سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ صرف بور جملے خاموشی سے سنتے ہیں۔ محفل میں وہ چپ ہو تو لوگ یوں بیٹھے ہوتے ہیں جیسے مجلس سن رہے ہوں۔ ہر فقرے پر داد لیتا ہے اکثر داد پہلے لے لیتا ہے' فقرہ بعد میں سناتا ہے۔ یہ وہ میٹرنٹی ہوم ہے جو فقروں کی ڈلیوری کے لیے چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے مزاح لکھا۔ اس کے ہاں فقرہ ہی نہیں فکر بھی ہے۔

خود معمولی بات پر پریشان ہو جاتا ہے البتہ دوسروں کو کبھی معمولی بات سے پریشان نہیں کرتا۔ اگرچہ اس کی عمر شرمانے کی نہیں شرمندہ ہونے کی ہے مگر یہ اب بھی شرماتا ہے اور اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اس کام کے لیے موقع نکال لیتا ہے۔

اس کے کسی دوست سے کہو کہ دوستی کی ایک لفظ میں تعریف کرو تو وہ کہے گا' عطا......

اگر اس کے دشمن سے دشمنی کی تعریف پوچھو تو وہ بھی یہی کہے گا۔ سب اسے اچھا دوست کہتے ہیں' میں نہیں مانتا۔ وہ برا دوست ہے کہ دوستوں کو برائیوں سمیت قبول کرتا ہے۔ وہ اچھا دشمن بھی نہیں اس لیے اس کا کوئی ذاتی دشمن نہیں۔ اس کے تین قسم کے دشمن ہیں۔ اس کے دوستوں کے دشمن' ان دشمنوں کے دوست اور وطن دشمن'

اس میں بڑے آدمیوں والی خوبیاں ہیں۔ بڑے آدمی قوموں کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہیں۔ یہ بھی اپنے پاس کسی کو سونے نہیں دیتا۔ یعنی سویا ہوا ایسے خراٹے لیتا ہے کہ مسلم قوم کا کوئی فرد اس کے پاس خواب غفلت میں نہیں رہ سکتا۔

کہتے ہیں وہ کالمسٹ زندہ رہتے ہیں جن کے قاری انہیں ڈھونڈیں اور ہمارے کالمسٹ بھی اس لیے زندہ ہیں کہ ان کے قاری انہیں ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوتے' لیکن عطا ان کا کفارہ ہے۔ اس کے ہاں طنز کے کانٹے کی چبھن بھی ہے مگر وہ نہیں جو کانٹا چبھتے وقت ہوتی ہے بلکہ وہ جو نکالتے وقت ہوتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تحریریں پڑھ کر لوگ مسکراتے ہیں' ابن انشاء کی پڑھتے ہوئے مسکراتے ہیں جبکہ عطا کی مسکراتے ہوئے پڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں جب تک آدمی برا نہ سوچے' برا نہ دیکھے اور برا نہ سنے وہ اچھا کالم نہیں لکھ سکتا اور عطاء الحق قاسمی بلا شبہ اچھا کالم نگار ہے۔

○○○

• شی مین

یہ جاننے کے لیے سیاست دان مرد ہے یا عورت' اس کی پالیسیاں دیکھنا چاہئیں اور بے غم عابدہ حسین "صاحب" سیاست کی مرد میدان ہیں۔ کہتے ہیں' عابدہ حسین کو خاتون

بنانے کا فیصلہ تو بہت بعد میں کیا گیا' پہلے ان میں ساری مردانہ خصوصیات اکٹھی کی گئیں۔ مگر کاتب تقدیر کی کتابت کی غلطی سے یہ "وہ" بن گئیں۔ جس گھر میں پیدا ہوئی' وہ اتنا بڑا تھا کہ اگر کوئی بدھ کو ملنے جاتا تو چوکیدار کہتا۔ "اس برآمدے میں سیدھے چلے جائیں اور جمعرات کو دائیں مڑ جائیں۔" اس گھرانے کی خواتین کے لباس میں تو گھروں کی بلند دیواریں بھی شامل ہوتیں۔ عورتوں کے دوپٹوں کو بھی غیروں سے پردہ کرایا جاتا۔ شریف شرفاء تو غیروں کے سامنے بیوی کے جوتے کا ماپ تک نہ بتاتے۔ مبادا کوئی ہمدردی کرنے لگے۔ اس گھرانے کو پانچ ہزار ایکڑ کا وارث چاہیے تھا۔ جب تک بے غم صاحبہ پیدا نہ ہوئی تھیں "نشیمن" میں ہر طرف شمعیں جل رہی تھیں اور جب یہ پیدا ہوئیں تو جو چیز جل رہی تھی' وہ ان کی نانی لیڈی مراتب تھیں جنہیں عورت کے "مراتب" کا پتہ تھا۔ خود بے غم عابدہ حسین کو اپنا لڑکی پیدا ہونا اتنا برا لگا کہ اپنی پیدائش کے ایک سال بعد تک انہوں نے کسی سے بات نہ کی' مگر بڑی ہو کر وہ عابدہ حسین کی بجائے عابد حسین بن گئیں۔ یہاں تک کہ جب مارچ ۱۹۷۱ء میں بھٹو صاحب نے انہیں خواتین کی نشست پر الیکشن لڑنے کے لیے کہا تو انہوں نے انکار کر کے پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۸۸ء میں جب بے نظیر بھٹو قائد حزب اقتدار تھیں' بے غم صاحبہ کو کہا گیا کہ آپ لیڈر آف دی اپوزیشن بن جائیں تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ خاتون کا مقابلہ کرنا کوئی مردانگی نہیں۔ وہ پہلی خاتون ہیں جو ڈسٹرکٹ کونسل جھنگ کی چیئر "مین" رہیں۔ یہی نہیں وہ شادی میں بھی فخر امام کو بیاہ کر اپنے

گھر لائیں۔ مردوں کے ساتھ مردوں جیسا سلوک کرتی ہیں۔ یہی نہیں عورتوں کے ساتھ بھی مردوں جیسا سلوک کرتی ہیں۔ شیر افضل جعفری صاحب نے ان کی "بڑائی" بیان کرتے ہوئے کہا۔ "کرنل عابد حسین کی یہ بیٹی کئی بیٹوں پر بھاری ہے۔" جنھوں نے بے غم صاحبہ کو دیکھا ہے' وہ کہتے ہیں۔ فقرہ یہ تھا ------ "کرنل عابد حسین کی یہ بیٹی کئی بیٹوں سے بھاری ہے۔"

وہ سیاست میں بے حیثیت عورت نہیں' بحیثیت سیاستدان آئیں۔ ہمارے ہاں ہر بار ایسے سیاست دان جیت کر اسمبلی میں پہنچتے ہیں' جس سے ان کی سیاست دانوں کی اہلیت سے کہیں زیادہ عوام کے حافظے کا پتہ چلتا ہے۔ جی ہاں عوام کے کمزور حافظے کا۔ بے غم صاحبہ پہلی بار جب گھر سے اسمبلی آئیں تو برقع پہن کر۔ پھر اسمبلی میں گھر کر گئیں۔ اب تو اسمبلی میں یوں پھرتی ہیں جیسے گھر میں پھر رہی ہوں۔ سنا ہے وہ جھنگ کے لوگوں کو بہت کم نظر آتی ہیں۔ حالانکہ ہم نے تو انہیں جب بھی دیکھا' بہت نظر آئیں۔ چہرے کے نقوش سے تو ماہنامہ "نقوش" لگتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ "بھری" بیٹھی ہیں۔ چہرے اور دروازے پر "ڈو ناٹ ڈسٹرب" کا بورڈ لگا ہوتا ہے۔ ہاتھ ایسے نرم کہ ایک صحافی خاتون نے پوچھا۔ "آپ ہاتھوں کو ایسا رکھنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟" کہا۔ "ان کو ایسا رکھنے کے لیے ہی تو میں کچھ نہیں کرتی۔" بچپن میں اپنے پاؤں اٹھا کر مور کی طرح زمین پر رکھتیں۔ یہی نہیں پاؤں بھی مور ہی کی طرح کے رکھتی ہیں۔ بچپن ہی سے سیاست دان بننے کی صلاحیت موجود تھی' یعنی ہر سال اپنی جماعت بدل لیتیں۔ جبکہ ہمارے دوست "ف" تو ایک ہی جماعت سے اتنے کمیٹڈ ہوئے کہ آج کل ان کا ساتویں میں آٹھواں سال ہے۔ غصے میں ایسی انگریزی بولتی ہیں کہ لگتا ہے انگریزی پر انہیں مکمل گرفت نہیں' انگریزی کو ان پر مکمل گرفت ہے۔ کمرے میں انگریزی کتابیں رکھتی ہیں کہ کبھی بندے کا پڑھنے کا دل چاہتا ہے۔ اردو کتابیں بھی رکھتی ہیں کہ کبھی بندے کا دل پڑھنے کو نہیں چاہتا۔

وہ بڑی ہو کر بے نظیر بننا چاہتی ہیں' حالانکہ وہ صرف "چھوٹی" ہو کر یہ بن سکتی ہیں۔ ان میں اور بے نظیر میں وہی فرق ہے جو دونوں کے والدوں میں تھا۔

سیاست میں امام وہ نہیں ہوتا جس کی مرضی پر پیروکار چلیں' بلکہ وہ ہوتا ہے جو پیروکاروں کی مرضی پر چلے۔ فخر امام صاحب پنج وقتی آئینی ہیں۔ ان سے کہو' چاند بہت خوبصورت لگ رہا ہے تو کہیں گے۔ "ہاں' لگتا تو آئین کے مطابق ہی ہے۔" ۱۹۸۵ء میں وہ اسمبلی کے اسپیکر بنے مگر پھر تحریک عدم اعتماد میں انہیں ۷۲ ووٹ ملے اور وہ ہار گئے' تو کسی نے کہا۔ "امام کے ساتھ ۷۲ ہی ہوتے ہیں۔"

فخر امام بے غم صاحب کو اپنی "دنیا" کہتے ہیں۔ کیوں کہتے ہیں' یہ بات گول مول ہے۔ فخر امام صاحب کے لیے وہ فخر بھی ہیں اور امام بھی۔ وہ مرد عورت کی برابری کی قائل ہیں۔ کہتی ہیں مرد اگر با صلاحیت ہو تو وہ عورت کی برابری کر سکتا ہے۔ اگر کوئی مرد ایسا نہ ہو تو اسے برابر کر دیتی ہیں۔ وہ تو تجارتی بنیادوں پر افزائش نسل کے لیے مرغیاں خریدیں تو بھی جتنی مرغیاں خریدیں گی' اتنے ہی مرغے لیں گی۔ ویسے ہم سمجھتے ہیں صرف ایک کام ایسا ہے جو دو مرد تو مل کر سکتے ہیں مگر عورتیں دس مل کر بھی نہیں کر سکتیں۔ وہ ہے "چپ رہنا" بے غم صاحبہ اس موضوع پر بھی بات کر دیتی ہیں جس پر سرگوشی ہی کی جا سکتی ہے۔ جو بات نہ سننا چاہیں' اس کے لیے اپنے کان بند نہیں کرتیں' کہنے والے کی زبان بند کرتی ہیں۔ دوران گفتگو دوسرے کو اپنی سطح پر نہیں لاتیں اور نہ دوسرے کی سطح پر اترتی ہیں۔ بلکہ اپنی سطح پر رہ کر گفتگو کرتی ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتیں۔ اس لیے عمر پوچھو تو جواب نہیں دیتیں۔ وہ بول رہی ہوں تو لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں' کیونکہ سیاسی خاتون اور گلوکارہ کی یہ خوش فہمی ہی ہوتی ہے کہ لوگ اسے صرف سننے آتے ہیں۔

جس کلچر پر وہ اینگری ہیں' وہ اینگری کلچر ہے' لیکن کہتی ہیں۔ "میں جاگیر دارنی نہیں ہوں۔" ٹھیک کہتی ہیں' وہ جاگیر دارنی نہیں ہیں' جاگیر دار ہیں۔ علاقے کے لوگ ان

کو سلام بھی کریں تو لگتا ہے معافی مانگ رہے ہیں۔ گھڑ دوڑ پسند ہے۔ اکثر اس میں حصہ لیتی ہیں۔ یہی نہیں، جیتتی بھی ہیں۔ اس قدر مصروف کہ ان کے پاس دن بھر کی مصروفیت کی لسٹ دیکھنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ یہی ان کی خوشی کا راز ہے۔ فارغ رہتیں تو اپنے وزن کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان رہتیں۔ نارمل گفتگو بھی کر رہی ہوں تو لگتا ہے ڈانٹ رہی ہیں۔ اس لیے ڈانٹ بھی رہی ہوں تو لگتا ہے نارمل گفتگو کر رہی ہیں۔ ویسے بھی باس اور بارش ہوتی ہی برسنے کے لیے ہے۔

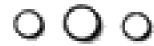
عورت کے تخلیقی کاموں کے اس قدر خلاف ہیں کہ جو تخلیقی کام قدرت نے عورت کے ذمے لگایا، اسے روکنے کے لیے "منصوبہ بندی" کرتی رہیں۔ یوں پاکستان میں جو عورتیں ضبط تولید کی گولیاں کھاتیں، وہ ترقی پسند خواتین کہلاتیں اور جو یہ گولیاں نہ کھاتیں، وہ مائیں کہلاتیں۔ جتوئی صاحب کے دور میں وزیر اطلاعات رہیں۔ ویسے اطلاعات کا شعبہ پیدائشی طور پر خواتین ہی کا ہے۔ آج کل امریکہ میں پاکستانی کلچر کی نمائندہ ہیں۔ پہلے پاکستان میں امریکی کلچر کی نمائندہ تھیں۔

وہ ڈپلومیٹ ہیں۔ ایک سیاست دان نے کسی کو بتایا کہ میں ڈپلومیٹ ہوں تو دوسرا بولا۔ "اچھا، میں تو تمہیں غیر شادی شدہ سمجھتا تھا۔" لیکن اس کے باوجود وہ امریکہ میں کسی کو اپنے گھر دعوت نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں یہاں کون سی میری بیوی ہے جو مہمانوں کو کھانا پکا کر کھلائے۔

امریکی گفتگو اور لباس میں اختصار سے کام لیتے ہیں۔ یہ اختصار میں بھی تفصیل سے کام لیتی ہیں۔ انہیں تو بندہ کہہ دے کہ مجھے مونچھیں پسند ہیں تو کہیں گی، مرد کی یا عورت کی۔ جب حکومت ان کی نہیں ہوتی، یہ حکومت کی ہوتی ہیں۔ سیاست میں آنے سے پہلے تصویریں بناتیں۔ سیاست دان اور مصور میں یہ فرق ہے کہ مصور کی صرف تصویروں کو ہی لٹکایا جاتا ہے۔ ان عورتوں سے زیادہ تیز ہیں جو ان سے کم تیز ہیں۔ غصے میں منہ کھلا رکھتی ہیں اور آنکھیں بند۔ وہی باتیں چھپاتی ہیں جو وہ نہیں جانتیں۔ ایسی با رعب

شخصیت ہیں کہ کچھ نہ بھی کہہ رہی ہوں' تب بھی لگتا ہے کہ کچھ کہہ رہی ہیں۔
مسز تھیچر سے خاوند کو ان سے ملنے سے پہلے محترمہ کے پی اے سے ٹائم لینا پڑتا ہے۔

ایک بار کسی نے تھیچر کے خاوند سے پوچھا۔ "مارگریٹ تھیچر آپ کی بیوی ہیں؟" تو اس نے کہا۔ "آپ کو اس شے پر کوئی شک ہے؟"
جھنگ کے لوگ انہیں اپنا ہیرو کہتے ہیں۔ سنا ہے کچھ "عزیز" انہیں "چاند" بھی کہتے ہیں' جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ چاند "مذکر" ہوتا ہے۔ بہرحال جب تک وہ سفیر بن کر امریکہ نہیں گئی تھیں' لوگوں کو شک تھا کہ پاکستانی سیاست میں بے نظیر واحد خاتون ہیں' اب شک نہیں رہا۔



• شکاری

وہ پاکستان کے ویران صوبے کے آباد سرکار ہیں۔ شکل سے بلوچ نہیں' پورا بلوچستان لگتے ہیں۔ مونچھیں اتنی نوکیلی کہ ان سے کسی کو زخمی کیا جا سکتا ہے۔ چیتے کی پھرتی' عقاب کی نظر' اونٹ کی دشمنی اور شیر سی ہلا شیری ہی نہیں' ان میں اور بھی کئی جانوروں والی خوبیاں موجود ہیں۔ وہ بگٹی قبیلے کے سردار ہیں۔ یہ اس قدر جنگجو قبیلہ ہے کہ ان کے ہاں جس دن بچہ باہر کسی کو مار کر نہ آئے' اس دن بچے کو مارتے ہیں۔ لوگ اپنے ذہن میں خدا کا تصور بنانے کے لیے سردار کو دیکھتے ہیں۔ معاف نہ کرنا اور حکم دینا اکبر بگٹی کو ورثے میں ملا ہے۔ دوسرے کی بات یوں سنتے ہیں جیسے بادشاہ کسی کی فریاد سن رہا ہو۔ خود کو اپنے قد سے بھی اونچا سمجھتے ہیں۔ ویسے ان کا قد ایسا ہے کہ بندہ ان کے پاؤں سے سر تک پہنچے تو موسم بدل چکا ہوتا ہے۔

دوران تعلیم کوئی پوچھتا۔ "آپ کس کلاس میں پڑھتے ہیں؟" تو کہتے۔ "اپر کلاس میں" استاد پوچھتا۔ "ہوم ورک کیا ہے؟" تو کہتے "ہمارے ہاں ہوم ورک نوکر کرتے ہیں۔" ہر معاملے میں خود کو دوسرے سے بڑا سمجھتے ہیں۔ وہ تو دس سال کی عمر میں بھی تیس سال کے لوگوں سے خود کو بڑا سمجھتے۔ ایچی سن کالج میں ان کی تعلیم کے دوران جب چیانگ کائی شیک دورے پر آیا تو بچوں کو لائن میں کھڑا کر کے ان سے ہاتھ ملانے کو کہا گیا۔ "جب معزز مہمان موصوف تک پہنچے تو یہ پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ اب بھی جب کسی "معزز مہمان" کو آتا دیکھتے ہیں' ایسے ہی کرتے ہیں۔

لمبی بات نہیں کرتے' بات اتنی مختصر ہوتی ہے کہ جونہی دوسرا متوجہ ہوتا ہے' بات ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ اتنی مختصر ہوتی ہے کہ اس کے لیے منہ بھی ہلانا نہیں پڑتا۔ اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے زور سے نہیں بولتے' بلکہ چپ ہو جاتے

ہیں۔ اس قدر صاف گو کہ بچپن میں بھی اس وقت تک کسی نے ان کے منہ سے جھوٹ نہ سنا جب تک وہ باتیں نہ کرنے لگے۔ انگریزی ادب اس قدر پسند ہے کہ جس کا ادب کرنا چاہیں' انگریزی میں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ "انگریزی پر میری گرفت ہے۔" واقعی ان کی انگریزی قابل گرفت ہے۔ سنا ہے جب وہ اردو کے خلاف ہوں تو اردو نہیں بولتے' حالانکہ جب وہ اردو بولتے ہیں تو یہی لگتا ہے کہ وہ اردو کے خلاف ہیں۔

مجلس میں کوئی ایسی گفتگو یا واقعہ نہیں سناتے جس میں ان کی حیثیت ثانوی ہو۔ اس لیے وہ قیام پاکستان پر گفتگو نہیں کرتے۔ وہ تو اپنے بیٹے کی شادی کی تقریب کے دولہا خود ہی ہوتے ہیں۔ وہ کام نہیں کرتے' جو سب کر سکیں۔ وہ کتاب تک نہیں پڑھتے' جسے سب پڑھ سکیں۔ سیاست دانوں میں بیٹھے ہوں تو ان کی آنکھوں میں ایسی مستعدی ہوتی ہے جیسے مچان پر بیٹھے ہوں۔ ان سے پوچھو۔ "کس کا شکار پسند کرتے ہیں؟" تو کہیں گے۔ "شکاری کا" نواب اکبر بگٹی ایک بار نصر اللہ خان سے ناراض ہوئے تو کہا۔

"آپ میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ آپ نوابزادہ ہیں اور میں نواب ہوں۔"

خود کو اپنی جماعت کا حصہ نہیں سمجھتے' جماعت کو اپنا حصہ سمجھتے ہیں۔ وہ کسی جماعت میں کھپ نہیں سکتے۔ جس جماعت میں جائیں' وہاں کھپ پڑ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں مخلوط حکومتیں ہی نہیں' حکمران بھی مخلوط ہوتے ہیں لیکن کسی مس کا لیڈ کرنا موصوف کے نزدیک مس لیڈ کرنا ہے۔ حکومت آسان اور حکمرانی مشکل ہے اور وہ حکمرانی کرتے ہیں' حکومت نہیں۔ ہمیشہ اپنا سر اونچا رکھا۔ وہ تو سوتے وقت بھی سر اونچا رکھتے ہیں' چاہے اس کے لیے دو تکیے کیوں نہ استعمال کرنا پڑیں۔ کسی کی تعریف بھی یوں کرتے ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ بھٹو مرحوم نے انہیں بلوچستان کے تخت پر یوں بٹھایا جیسے ہمارے ہاں چھوٹوں کو پاؤں پر بٹھایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سے پوچھو۔ "دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟" تو وہ کہے گا۔ "ہوتے تو چار ہیں مگر آپ فلاں کنسلٹنٹ سے سیکنڈ اوپینین لے لیں اور فلاں فلاں ٹیسٹ کروا لیں۔" سیاست دان سے پوچھو۔ "دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟" تو وہ کہے گا۔ "آپ کتنے چاہتے ہیں۔" مگر اکبر بگٹی کے علاقے میں دو اور دو

اتنے ہی ہوتے ہیں جتنے موصوف کہیں۔ وہ تو قبیلے کے کسی فرد کو زندہ دفن کرنے کا حکم دیں تو لوگ پھر بھی کہیں گے۔ "دفن تو کیا مگر اتنے رحمدل ہیں کہ مار کر نہیں کیا۔" وہ دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر بھی آپ پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ ذہین و "فتین" اکبر بادشاہ کی آنکھوں میں ماضی کے ذکر سے چمک آ جاتی ہیں' جس سے لگتا ہے اب وہ جوان نہیں ہے۔ ویسے بندہ تب بوڑھا ہوتا ہے جب اسے پتہ چلے کہ پچاس کا ہو گیا' لیکن انہوں نے آج تک خود کو یہ پتہ نہیں چلنے دیا۔

Mathematics اتنی کمزور کہ ایماڈنکن نے ان سے پوچھا۔ "آپ نے اپنے ہاتھوں سے کتنے لوگوں کو قتل کیا؟" تو انہوں نے کہا۔ "مجھے گنتی یاد نہیں۔" ہو سکتا ہے' انہوں نے اس عمر میں قتل کرنے شروع کر دیئے ہوں گے جب ابھی گنتی سیکھنا شروع بھی نہیں کی تھی۔ انہیں موت کے بعد زندگی پر ایمان نہیں۔ ان سے مل لو تو موت سے پہلے زندگی پر بھی ایمان نہیں رہے گا۔ ان میں ایک خوبی وہ بھی ہے جو کسی سیاست دان میں نہیں ہوتی۔ جس میں ہو وہ سیاست دان نہیں' وہ ہے اپنی رائے کے غلط ہونے کا سر عام اعتراف کرنا۔ وہ بزدل سیاست کے بہادر سیاست دان ہیں۔ کہتے ہیں۔ "میں کسی پارٹی میں نہیں آ سکتا۔ مجھ میں کئی سیاسی پارٹیاں آ سکتی ہیں۔" دشمنی میں وہاں تک چلے جاتے ہیں جہاں تک دشمنی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں۔ "میں جو سوچتا ہوں' وہ کرتا ہوں۔" حالانکہ وہ جو کرتے ہیں اس سے تو یہ نہیں لگتا کہ وہ سوچتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ آپ کی بات سن رہے ہیں یا نہیں' آسان طریقہ ہے۔ اگر آپ ان کا ذکر کر رہے ہیں تو وہ سن رہے ہیں۔ اگر نہیں کر رہے تو وہ بھی نہیں سن رہے۔ سیاست دان تو لوگوں کے مسائل کو وسائل بنا کر جیتتے ہیں اور وسائل کو لوگوں کے لیے مسائل بنا دیتے ہیں۔ مگر ان کا ذریعہ روزگار سیاست نہیں۔ ان کے تو قبیلے کے لوگ کبھی روزگار کی تلاش میں کہیں نہیں گئے۔ روزگار ان کی تلاش میں سوئی کے مقام پر آیا۔ یہ Suiside موصوف کی اجازت کے بغیر Suicide ہے۔ ان کی پسندیدہ شخصیت

ہٹلر ہے۔ مگر یہ بات اس طرح بتاتے ہیں جیسے وہ ہٹلر کی پسندیدہ شخصیت ہوں۔ کہتے ہیں' انھوں نے اپنی زندگی میں خود سے بڑا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ واقعی جو ان سے بڑا نکلا' اسے دیکھا بھی نہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی ذات پر پی ایچ ڈی کرتے ہیں۔

کہتے ہیں سو سنسار کی' ایک سردار کی۔ اگرچہ سردار اتنے سیاست میں نہیں ہوتے' جتنے لطیفوں میں ہوتے ہیں۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ سردار کتنا ہی سیانا کیوں نہ ہو' لوگ پھر بھی اسے سردار جی ہی کہہ کر بلاتے ہیں۔ وہ بلوچ ہی نہیں بے لوچ سردار بھی ہیں۔ سیاست میں اپنے بچوں کے والد کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔

غیر سنجیدگی کا مظاہرہ بڑی سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ کسی افواہ پر یقین نہیں کرتے' جب تک سرکاری طور پر اس کی تردید نہ ہو جائے۔ ان کے کئی محافظ ہیں جن کا دعویٰ ہے جب تک موصوف کی زندگی ہے' ہم انہیں مرنے نہیں دیں گے۔ موصوف بے اختیار اپنے اختیار کی بات کرتے ہیں۔ کسی کی تعریف بھی یوں کرتے ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ کھانوں میں انہیں مرچیں پسند ہیں۔ ان کے کھانے میں مرچیں نہیں ڈالی جاتیں' مرچوں میں کھانا ڈالا جاتا ہے۔ بڑوں میں انہیں چھوٹے پسند ہیں۔ ان کے غسل خانے کے باہر میڈونا کی تصویر دیکھ کر ایماڈنکن نے پوچھا۔ "آپ نے یہ تصویر غسل خانے کے باہر کیوں لگائی؟" کہا۔ "غسل خانے کے اندر گیلی ہو جاتی ہے۔" اس قدر تنہائی پسند کہ قوالی ناپسند ہے کیونکہ اس میں گانے والا تنہا نہیں ہوتا۔ ویسے وہ گانا سنتے ہی نہیں' دیکھتے بھی ہیں۔ گانے والے کو داد یوں دیتے ہیں جیسے تسلی دے رہے ہوں۔ کہتے ہیں بھٹو صاحب میرے کلاس فیلو تھے۔ واقعی بھٹو کا تعلق بھی اسی کلاس سے تھا جس سے ان کا ہے۔ ان کا سیاسی کہنہ سالی کا ذکر کرو تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ کہنہ سالی کہنے پر ناراض تو سالی کو ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں یہ فخر کی بات ہے کہ اے کے بروہی مجھے پڑھاتے رہے' مگر کہتے اس انداز سے ہیں جیسے یہ اے کے بروہی کے لیے فخر کی بات ہو۔

جو شخص کچھ نہیں جانتا' مگر سمجھتا ہے' وہ سب جانتا ہے۔ اس کے لیے سیاست بہترین پیشہ ہے۔ موصوف بھی یہی پیشہ کرتے ہیں۔ ہم نے تو ہر کام صفر سے شروع کیا۔ یہاں تک کہ عمر بھی صفر سے شروع کی' لیکن وہ سردار ہیں اور سرداروں کا صفر بھی بارہ سے شروع ہوتا ہے۔ آپ یہ دعویٰ تو کر سکتے ہیں کہ آپ اس کے دوست ہیں مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ آپ کے دوست ہیں۔ اتنا کم سوتے ہیں کہ پوچھو نیند کب آتی ہے؟ تو کہیں گے۔ "جب سویا ہوا ہوں۔"

خوشامد غور سے سنتے ہیں کہ خوشامد کرنے والا دراصل وہی کچھ کہہ رہا ہوتا ہے جو وہ خود کہنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ اتنا وہ نہیں بولتے جتنا ان کی تصویریں بولتی ہیں۔ ویسے مرد خاموش ہو تو آپ اس کی مکمل تصویر نہیں بنا سکتے اور عورت جب تک خاموش نہ ہو' آپ اس کی مکمل تصویر نہیں بنا سکتے۔

وہ مولوی خولیا کے مریض ہیں۔ مذہبی معاملات پر یوں گفتگو کرتے ہیں جیسے لطیفہ سنا رہے ہوں۔ دین کے بارے میں ان کا نظریہ وہی ہے جو شہنشاہ اکبر کا تھا۔ البتہ ان دونوں حکمرانوں میں یہ فرق ہے کہ شہنشاہ اکبر کے پاس نو رتن تھے اور ان کے پاس No رتن ہیں۔

○○○

• مختصر ترین ہیروئین

کمر جتنی پتلی ہو اتنی ہی دور سے پہلے نظر آتی ہے۔ ایسے ہی مختصر ترین ہیروئین بڑی بڑی تفصیلی ہیروئینوں سے زیادہ نمایاں ہے۔ لوگ پہلی ہی نظر میں اسے پسند کرنے لگتے ہیں جس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ وہ پہلی نظر میں ہی آخر تک نظر آ جاتی ہے قد ایسا کہ ہر کسی کو اس سے جھک کر ملنا پڑتا ہے اور بقول دلدار اسے دیکھ کر لگتا ہے دس کنال کی کوٹھی دس مرلے میں بنائی گئی ہے۔ اس کا قد چار فٹ گیارہ انچ ہے اور انا گیارہ فٹ چار انچ۔

یوں تو ایسی اداکار کہ اس کی ہر ادا کی قیمت کار ہے۔ لیکن اس کی کار کی بھی اپنی ادا ہے۔ یوں ڈرائیونگ کرتی ہے جیسے حادثے کی ریہرسل کر رہی ہو۔ گلبرگ اس کے گھر سے اسٹوڈیو تک چند منٹوں کا راستہ ہے لیکن پھر بھی ٹریفک کانسٹیبل کو ضرور پیچھے لگواتی ہے۔ لیکن میرا دوست "ف" کہتا ہے کہ کانسٹیبل اس کے پیچھے اس لیے نہیں آتا کہ اس نے ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کی ہوتی ہے بلکہ جب یہ اپنی بڑی گاڑی میں گزرتی ہے تو کانسٹیبل پریشان ہو کر یہ جاننے کے لیے اپنی کار اس کی کار کے پیچھے لگا دیتا ہے کہ یہ گاڑی بغیر ڈرائیور کے کیسے چل رہی ہے؟

وہ اس ادھوری بات کی طرح ہے جسے ہر کوئی مکمل کرنا چاہتا ہے۔ وہ بات آنکھوں سے کہہ دیتی ہے جس کے لیے شاعر پورا دیوان لکھ مارتے ہیں۔ تعلق اسی اونچے خاندان سے ہے جس کی زمین بھی چھت سے شروع ہوتی ہے۔

کہتی ہے میں کئی قسم کے رقص جانتی ہوں۔ اسی لیے رقص کر رہی ہو تو لگتا ہے کئی قسم کے رقص کر رہی ہے۔ اس میں نسوانیت اداکار فیصل سے زیادہ اور مردانگی اداکارہ سلمٰی آغا سے زیادہ ہے۔ لباس پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ دیکھنے والے بھی زیادہ اس کے

لباس ہی کو توجہ دیتے ہیں۔
اس کی پسندیدہ بک "چیک بک" ہے۔ ہر زبان میں چھپنے والے تصویری رسالے پڑھ لیتی ہے۔ انگریزی بولتے وقت اسے ذرا دشواری پیش نہیں آتی بس سننے والوں کو پیش آتی ہے۔

ہمارے ہاں عورتیں عمر کے بارے میں اس قدر حساس ہیں کہ میں نے ہمیشہ بڑا آدمی ہی سنا آج تک بڑی عورت نہیں سنا۔ مختصر ترین ہیروئین بھی اگر کسی اداکارہ کو خود سے بڑی سمجھتی ہے تو یقین کر لیں وہ اسے عمر میں بڑی سمجھتی ہے۔
اگرچہ ہمارے ہاں فلم انڈسٹری میں ہیروئین سے اس کے والد کا نام پوچھنا بد اخلاقی سمجھا جاتا ہے پھر بھی کچھ فلمی ادکارائیں اپنے نام کے ساتھ والد کا نام لگاتی ہیں۔ یہ ان میں سے ایک ہے۔ خاوند کا نام اس لیے نہیں لگاتیں کہ خاوند کا کیا وہ تو بدلتا رہتا ہے' والد تو ایک ہی رہتا ہے۔ مختصر ترین ہیروئین کے نام کے پہلے حصے میں اتنی مردانگی ہے جتنی کسی مرد میں زیادہ سے زیادہ ہو سکتی ہے اور نام کا دوسرا حصہ وہ ہے جو کہہ کر آج تک کسی نے کسی فلمی ہیروئین کو نہیں بلایا۔
فلم میں ماں بننے سے اتنا ہی ڈرتی ہے جتنا حقیقت میں جس کی وجہ سے میرا دوست "ف" یہ بتاتا ہے کہ وہ جنت کا اس قدر احترام کرتی ہے اور نہیں چاہتی کہ ایسی مقدس جگہ اس کے پاؤں تلے آئے۔
اکیلی رہ رہ کر تنہائی کی اس قدر عادی ہو گئی ہے کہ کوئی ساتھی مل جائے تو پریشان ہو جاتی ہے۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ پر بھی اکیلی ہی جائے گی حالانکہ ہماری دوسری ہیروئینوں کی روزانہ استعمال کی چیزوں میں ان کی سعادت مند مائیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ساتھ چیزیں اٹھانے کے لیے ایک ملازم بھی رکھتی ہیں کیونکہ ہیروئینوں نے تو اپنا بوجھ بمشکل اٹھا رکھا ہوتا ہے۔
فلم میں اگر ہیرو کے چہرے کی طرف دیکھ کر ڈائیلاگ بول رہی ہو تو لگتا ہے چھت کی طرف دیکھ کر بول رہی ہے۔ سکرین پر پیاری لگتی ہے۔ کہتے ہیں اگر اسے سامنے

ڈائریکٹر نظر نہ آئے تو اور بھی پیاری لگے کیونکہ جس کو دیکھا جائے اس کا حسن بھی دیکھنے والے کے چہرے پر آ جاتا ہے۔ وہ ڈوب کر اپنا کردار ادا کرتی ہے حالانکہ اکثر

ہیروئینوں کو یہ کچھ کردار کرنے کے بعد کرنا چاہیے۔

ہر وقت کسی نہ کسی شوٹنگ میں جتی رہتی ہے اس بے پناہ مصروفیت کا فائدہ یہ ہے کہ اپنے قد کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان نہیں ہوتی۔ اپنے پورے بدن سے دیکھتی ہے اور ہر بار یوں دیکھتی ہے جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ فلموں میں آج کل جیسے رول کر رہی ہے لگتا ہے آئندہ اسے بطور ہیرو کاسٹ کیا جائے گا۔ جس دن شوٹنگ کینسل ہو جائے یوں خوش ہوتی ہے جیسے بچے سکول سے چھٹی پر ہوتے ہیں۔

وہ اپنے فن میں یکتا ہے اور اسے ایسے ہی لوگ پسند ہیں جو اپنے شعبے میں ماہر ہوں اسی لیے اس نے اپنی پہلی شادی اس سے کی جس کا شادیوں کا تجربہ اس کے اس فن میں یکتا ہونے کا "شاہد" تھا۔ بہت ذہین ہے۔ جو کام دوسری عورتیں ایک سال میں سیکھتی ہیں' یہ ایک ماہ میں۔ اسی لیے دوسروں کی زندگی کا ایک سال گزرتا ہے تو اس کا ایک مہینہ۔

ہمارے ہاں فلمی اداکاراؤں کے خاوند ان کے گھر کے فرنیچر کا حصہ لگتے ہیں مگر یہ خود گھر میں بیٹھی ڈیکوریشن پیس لگتی ہے۔ ایسی عورت ہے جس کے پاس بیٹھ کر آپ کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ آپ مرد ہیں جب تک وہ خود نہ بتائے۔ اسے دیکھ کر بندے کو اس سے محبت کم اور شفقت زیادہ ہوتی ہے۔ ایوارڈ دے بھی رہی ہو تو یہی لگتا ہے لے رہی ہے۔ اسٹوڈیو میں یوں آتی ہے جیسے اچھے دل میں برا خیال یعنی خاموشی سے۔

زندگی میں جو دن اچھے بسر کئے انہیں ہی بار بار بسر کرتی رہتی ہے۔ زندگی کے جو دن اچھے نہیں تھے انہیں اپنی عمر میں شامل نہیں کرتی۔ جب غصے میں ہوتی ہے خود کو کمرے میں بند کر لیتی ہے اگر ایسا نہ کرے تو دوسروں کو یہ کچھ کرنا پڑتا ہے جب ڈیپریشن ہو تو لندن چلی جاتی ہے اور جو سب یہاں کیا ہوتا ہے لندن جا کر اس کا نتیجہ نکالتی

ہے۔
شادی کے بعد نئی زندگی شروع ہوتی ہے اور ہماری ہیروئنیں ہر سال نئی زندگی شروع کرتی ہیں۔ وہ بھی اپنے لیے پھر ایک خاوند بیاہ کر لانا چاہتی ہے۔ ایک اسٹوڈیو کے مالک کے بیٹے سے عشق ہو گیا اور پھر اسے شادی کو کہا تو اس نے فوراً کسی سے شادی کر لی۔

صورت ایسی بنائے رکھتی ہے کہ بے اختیار نصیحت کرنے کو دل چاہتا ہے۔ دیکھتی کم اور دکھتی زیادہ ہے۔ اس قدر محتاط کہ جس دن پیاز کھایا ہو فون اٹینڈ نہیں کرتی۔ ہیرو سے اظہار محبت کر رہی ہو تو لگتا ہے اس سے ٹافیاں مانگ رہی ہے جبکہ دوسری ہیروئنیں محبت کر رہی ہوں تو لگتا ہے گھر کا کام کر رہی ہیں۔ اسے نت نئے لباس پہننے کا شوق ہے اسی لیے اس کا گھر لانڈری لگتا ہے۔ وہ جو لباس ایک بار پہن لے بعد میں لباس "فاخرہ" بن جاتا ہے۔
دن رات فلمیں کرتی ہے ذرا آرام نہیں کرتی۔ فلمیں ہی اس کی آخری آرام گاہ ہیں۔ فلموں میں سب سے پہلے اس نے "بھول" کی۔ عام زندگی میں اسے دیکھ کر شک بھی نہیں ہوتا کہ یہ اداکارہ ہے بلکہ فلموں میں بھی اسے دیکھ کر شک نہیں ہوتا کہ وہ اداکاری کر رہی ہے۔

○○○

- راسپوٹین

شکل و صورت ایسی کہ ٹی وی پر کوئی بچہ دیکھ لے تو بھاگ کر اپنی امی سے کہے کہ امی امی دیکھیں امرتسر کتنا کلیئر آ رہا ہے۔ سیلف میڈ آدمی ہے اور اس کی حالت دیکھ کر اس کا یقین بھی ہو جاتا ہے۔ جب دیکھتا ہے اس کی پوری شخصیت آنکھوں میں سمٹ آتی ہے بلکہ جسے دیکھتا ہے اس کی پوری شخصیت بھی آنکھوں میں سمٹ آتی ہے۔ آج کل داڑھی میں منہ چھپائے پھرتا ہے۔ اب تو داڑھی سے اتنا تھوڑا چہرہ بچا ہے کہ یہ جاننے کے لیے کہ وہ خوش ہے یا غصے میں' اسے پوچھنا پڑتا ہے۔ آہستہ آہستہ چل رہا ہو تو لگتا ہے کسی کا تعاقب کر رہا ہو' تیز ہو تو لگتا ہے اس کا تعاقب ہو رہا ہے۔

عمر کے اس حصے میں ہے جہاں آدمی کو اپنی ناک سے آگے نظر نہیں آتا مگر اسے نظر آتا ہی اپنی ناک کے بعد شروع ہوتا ہے۔ چھوٹی سی بات پر پریشان ہو جاتا ہے اور اس وقت تک پریشان رہتا ہے جب تک کوئی بڑی بات نہ ہو جائے۔ اپنی تعریف سے گھبراتا ہے مگر تنقید سے نہیں ڈرتا کیونکہ یہ کام تو تنقید کرنے والے کا ہے۔
زندگی میں معمولی لغزشوں سے غیر معمولی نتائج نکالتا ہے۔ اکثر نتائج پہلے نکال لیتا ہے۔ لغزشیں بعد کے لیے رکھ لیتا ہے۔ بات غیر شعری نہیں ہونے دے گا چاہے غیر شرعی ہو جائے مگر خود اس قدر شرعی ہے کہ مجال ہے بغیر کسی شرعی وجہ کے کبھی نہایا ہو۔ وہ ان لوگوں سے زیادہ مذہبی ہے جو اس سے کم مذہبی ہیں۔
لفظوں ہی کی نہیں اعضاء کی شاعری بھی کرتا ہے۔ اکثر دوسروں کی شادیوں پر ایسا رقص کرتا ہے کہ وہ شادی کم اور عرس زیادہ لگتی ہے جس جس کی شادی پر اس نے رقص کر دیا۔ اس نے پھر کبھی شادی نہیں کرائی۔ رونا آنکھوں کو غسل دینا ہے تا کہ بندہ کسی کو میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے وہ اس کام کو اچھا سمجھتا ہے مگر کرتا یوں ہے جیسے

برا کام کر رہا ہو یعنی چھپ چھپ کر۔ اس کی کتاب "مندر میں محراب" چھپی تو اس قدر پڑھی گئی کہ اس کے مخالفین نے اس کی کاپیاں خرید خرید کر دوسروں کو پڑھوائیں۔

یہ ہندوستان کا سفر نامہ ہے جسے پڑھ کر لگتا ہے اس نے اپنے اندر سفر کیا ہے۔ ایسی صحت افزا باتیں کرتا ہے کہ سننے والا کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو۔ اس کا چہرہ انار کی طرح سرخ ہو جاتا ہے۔ دوران بحث موضوع گرفت میں آئے نہ آئے مخاطب ضرور اس کی گرفت میں ہوتا ہے۔ اس کی تعریف کر دو تو اسے ساری عمر یاد رہے گا اور اگر مخالفت کر دو تو آپ کو ساری عمر یاد رہے گا۔

فقرہ یوں زور لگا کر ادا کرتا ہے جیسے ڈلیور کر رہا ہو۔ اچھے فقرے کے بعد اس کے چہرے پر شرم اور خوشی کی وہی لہر ہوتی ہے جو مشرقی عورت کے چہرے پر زچگی جنم دینے کے بعد ہوتی ہے۔

معاشرے میں مرد کی برتری کا قائل ہے وہ تو عورت کو اس کی نظر سے دیکھتا ہے کہ مرد ہوتی تو کیسی ہوتی۔ نظر اتنی تیز کہ اسے دور سے آتی لڑکی نظر آ جاتی ہے اور جاتی ہوئی تو اور دور تک دکھتی ہے۔

اس کی خوراک اتنی کہ کوئی اس کے سامنے آدھا چرغہ کھا لے تو اسے ہاضمے کی دوا کھانا پڑتی ہے۔ اس کا پیٹ ہمیشہ بھوک سے ہی بھرا رہتا ہے تاہم دوستوں کو اس قدر کھلاتا ہے کہ ان کا دشمن لگتا ہے۔

جس لباس میں سوتا ہے اسی میں کلاس میں چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے' میں نے کلاس روم اور بیڈ روم کا فاصلہ ختم کر دیا ہے۔ اس کی باتیں سن کر ایسا ہی لگتا ہے۔

کہتے ہیں شاعری کرنا بات کرنے کا ہنر نہیں بات چھپانے کا فن ہے۔ وہ یہ فن جانتا ہے۔ وہ ڈکشن اور ڈیکوریشن کا شاعر ہے۔ اس کے پاس بیٹھ کر سب جونیئر سینئر ایک جیسے ہو جاتے ہیں یعنی سب خود کو ایک دوسرے سے سینئر سمجھنے لگتے ہیں۔

تنہائی میں عبادت کرتا ہے ویسے جن دوستوں میں یہ پھرتا ہے ان کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا تنہا ہونا عبادت کرنا ہی ہے۔ عاشق مزاج بندہ ہے لیکن اگر اس

سے پوچھو کہ آج کل کس سے عشق چل رہا ہے تو فوراً گھبرا کر کہے گا کیا مطلب؟ عورت سے اور کس سے؟ بری بات اس طرح کرتا ہے کہ وہ اتنی بری نہیں لگتی' اچھی بھی ایسے ہی کرتا ہے۔

وہ حساب کے سوال کی طرح ہے۔ اگر صحیح ہے تو پھر پورے سو نمبر اور اگر آپ کے ساتھ صحیح نہیں تو پھر آپ کا صفر۔ دوستی یوں کرتا ہے جیسے اس کے علاقے میں لوگ دشمنی کرتے ہیں یعنی پکی اور عمر بھر کی۔ مصیبت کے وقت دوست کی مدد کو یوں فوراً پہنچتا ہے جیسے اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ ویسے اگر کوئی اس کو بچانا چاہے تو اسے دوستوں سے بچا دے۔ دشمنوں سے وہ خود بچ جائے گا۔

○○○

• بم خان

وہ چپ بھی ہوں تو تب بھی لگتا ہے کہ بول رہے ہیں۔ ایک بار بولیں تو کئی بار سنائی دیتے ہیں۔ لہجہ ایسا کہ کانفرنس کو بھی خانفرنس کہتے ہیں۔ پشتو سے اس قدر محبت کہ انگریزی تک پشتو میں بولتے ہیں۔ بولتے وقت کان' لفظ اور غصہ بہت کھاتے ہیں۔ اگر ان کی بات بہت طویل ہو جائے تو سمجھ لیں وہ اپنی بات کا خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔ انہیں اپنی ہر بات پر اس قدر یقین ہوتا ہے کہ خود کو "ولی" کہتے ہیں۔ بات کے اس قدر پکے کہ جو بات آج کہیں گے' بیالیس سال بعد بھی وہی کہیں گے۔ شاید اس لیے آج بھی وہی بات کر رہے ہیں جو بیالیس سال پہلے کیا کرتے تھے۔ وہ تو جو لطیفہ ایک بار سنا دیں' پھر جب بھی لطیفہ سنائیں گے' وہی سنائیں گے۔ ضیاء کے مارشل لاء لگانے پر یہ لطیفہ سناتے کہ ایک شخص گدھے پر چوڑیوں کی گٹھڑی لیے جا رہا تھا۔ ایک سپاہی نے روکا اور ڈنڈا مارتے ہوئے پوچھا۔ "اس میں کیا ہے؟" تو اس شخص نے کہا۔ "اگر آپ نے ایک بار پھر ڈنڈا مارا تو پھر اس میں کچھ نہیں ہے۔" وہ زبان سے سوچتے ہیں۔ اس لیے جب بول رہے ہوں تو سمجھ لیں سوچ رہے ہیں۔ غصے میں بول رہے ہوں تو یہی لگتا ہے فائرنگ کر رہے ہیں۔ سنا ہے وہ غصے میں اپنے علاوہ کسی کی بات نہیں سنتے۔ یہ غلط ہے۔ وہ غصے میں اپنی بھی نہیں سنتے۔

اس خاندان میں آنکھ کھولی' جس نے ابھی تک آنکھ نہیں کھولی۔ جیسے میرا دوست "ف" کہتا ہے' مجھ سے تمیز سے بات کرو میرے سات بھائی ہیں اور ان میں سے ایک کشمیری بھی ہے۔ یہ کہتے ہیں' مجھ سے سیاست کی بات ہوش سے کرو' میرا باپ "گاندھی" بھی رہا ہے۔ پہلے نیشنل عوامی پارٹی کو بیگم نسیم ولی خان سمجھتے' آج کل نسیم ولی خان کو نیشنل عوامی پارٹی سمجھتے ہیں۔ ان کے والد کی اتنی بڑی ناک تھی کہ دھوپ میں انہیں چھتری کی ضرورت نہ پڑتی۔ ناک منہ پر سایہ کئے رکھتی۔ غل خان کی بھی ایسی خوب

ناک ہے کہ وہ ناک کی اوٹ میں چھپ سکتے ہیں۔ ان کی تو چھوٹی انگلی بھی بڑی ہے۔
دونوں باپ بیٹوں میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ یہ کہ باپ عمر میں بڑا تھا۔ ان کے کان دیکھ کر بندہ سوچتا کہ قدرت کتنی فیوچرسٹک ہے۔ اس نے اس وقت ایسے کان بنانے شروع کر دیئے جب ابھی انسان کے ذہن میں عینک بنانے کا خیال تک نہ آیا تھا۔
اس عمر میں ہیں جس میں وگ کے بال بھی سفید ہو جاتے ہیں' لیکن بال سفید ہوئے تو کیا ہوا' عینک تو سیاہ ہے۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں یا اللہ ایسی چشم بینا عطا فرما کہ دیکھنے کے لیے عینک کی ضرورت نہ پڑے۔ ان کی نظر گاندھی آشرم میں لاٹھی لگنے سے خراب ہوئی۔ تب سے پاکستان کو اسی خراب نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ کام جو دل لگا کر کرنے چاہئیں' وہ کام بھی عینک لگا کر کرتے ہیں۔ نہرو جیکٹ پہنتے ہیں' جو اپنی حالت سے واقعی نہرو کی ہی لگتی ہے۔ طویل عرصہ خان قیوم خان اور آشوب چشم میں مبتلا رہے۔ تاہم اب بھی صحت کا پوچھو تو کہیں گے۔ "Fit for Fighting" ہوں۔ ویسے بھی جس پٹھان کا لڑنے کو دل نہ چاہے' یقین کر لیں وہ فٹ نہیں ہے۔ ڈاکٹر کو اپنی آنکھیں دکھا دکھا کر یہ حالت ہو گئی ہے کہ اب تو جو بھی ملے' اسے آنکھیں دکھانے لگتے ہیں۔ یادداشت کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ یادداشتہ لگتی ہے۔ جب کہ نسیم ولی خان کا حافظہ تو اتنا کمزور ہے کہ ان کے اپنے بیٹے بھی تھے' سوتیلے بھی مگر اب ان سے پوچھو کہ سوتیلا کون سا تو کہیں گی "میں بھول گئی ہوں۔"
پاکستان بننے سے پہلے وہ کانگرس کے رکن تھے۔ پاکستان بننے کے بعد کانگرس ان کی رکن ہے۔ گاندھی جی سے بہت متاثر ہیں۔ گاندھی جی کو غریب رہنے کے لیے بہت خرچ کرنا پڑتا۔ ایسے ہی انہیں چپ رہنے کے لیے بہت بولنا پڑتا ہے۔ اپنی پارٹی کو اپنی ذات سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کی پارٹی پر فقرہ کسو تو سمجھتے ہیں کہ ذاتیات پر اتر آئے ہیں۔ ان کی پارٹی میں کوئی دوسرا آ جائے تو اسے یوں دیکھتے ہیں جیسے گھر میں کوئی دوسرا آ گیا ہو۔ وہاں تو شیر باز مزاری بھی شیر ہوتا ہے نہ باز' بس مزارعی ہوتا

ہے۔ کسی کو معاف نہیں کرتے۔ انہوں نے تو کبھی خود کو بھی معاف نہیں کیا۔ کبھی کبھی اپنی پارٹی کو سیر کرانے لاہور لاتے ہیں مگر وہ ان کے واپس چارسدہ پہنچنے سے

پہلے ہی چارسدہ پہنچ چکی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں۔ "میں تا حکم ثانی محب وطن ہوں۔" اپنی سیاسی اہلیت و اہلیہ کی وجہ سے پاکستان میں اہم مقام رکھتے ہیں اور یہ اہم مقام چارسدہ ہے۔ والد سے سیاست سے زیادہ باغبانی کا شوق ورثے میں ملا۔ وہ تو باغ باغ ہونا سے مراد دو باغ ہونا لیتے ہیں۔ ولی باغ میں رہتے ہیں مگر یوں جیسے باغی باغ میں رہنے والے کو ہی کہتے ہیں۔ وہ کسی مہمان کے سامنے چائے کے ساتھ بسکٹ رکھ دیں تو مہمان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یا تو یہ بسکٹ اصلی نہیں یا یہ اصلی "غل خان" نہیں۔ وہ سانپ پر لاٹھی نہیں مارتے' لاٹھی پر سانپ مارتے ہیں۔ تقریر میں ضرب الامثال یوں لگاتے ہیں جیسے امثال کو ضرب لگا رہے ہوں۔ کوئی بات سمجھ نہ آئے تو اس کے لیے نسیم اللغات نہیں' بیگم نسیم کو دیکھتے ہیں۔ ان کی پارٹی کا نصف بہتر ان کی نصف بہتر ہے۔ گفتگو میں "جی" بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اگر وہ فقرے کے آخر میں جی لگائیں تو سمجھ لیں گھر سے باہر گفتگو کر رہے ہیں۔ گھر میں وہ فقرے سے پہلے جی لگاتے ہیں۔

وہ بیگم نسیم ولی خان کا مردانہ روپ ہیں' لیکن وہ بیگم صاحبہ سے بڑے سیاست دان ہیں۔ پندرہ سولہ سال بڑے ہیں۔ انگلینڈ جا کر جم کر لکھتے ہیں' جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہاں اتنی سردی پڑتی ہے کہ بندہ نہ لکھے' پھر بھی جم جاتا ہے۔ اپنے بھائی عبدالغنی خان کی طرح تخلیقی آدمی ہیں۔ وہ تو تاریخ بھی لکھ رہے ہوں تو لگتا ہے تخلیق کر رہے ہیں۔ البتہ ان کی آپ بیتی کم اور اپنے آپ بیتی زیادہ لگتی ہے۔ جیل میں تنہائی اور فرصت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے خدائی خدمتگار تحریک کے دو حصے مکمل کر لیے اور کہا' جونہی پھر تنہائی اور فرصت میسر آئی' کتاب کا آخری حصہ بھی مکمل کر لوں گا۔ اس اعلان کے بعد کسی حکومت نے انہیں جیل نہیں بھیجا۔ یاد رہے خدائی خدمتگار

اتنی مذہبی پارٹی رہی کہ اس کے سربراہ کا انتخاب براہ راست خدا کے ہاتھ میں ہوتا۔ جس کو سربراہ کی کرسی سے اٹھاتا' خدا ہی اٹھاتا۔

لائبریری اچھی جگہ ہے بس وہاں کتابیں نہ ہوں۔ ویسے کتاب سے رشتہ تب شروع نہیں ہوتا' جب آپ کتاب شروع کرتے ہیں بلکہ تب سے شروع ہوتا ہے جب آپ کتاب ختم کرتے ہیں۔ غل خان کتابوں کے پرانے رشتہ دار ہیں۔ چپل اور چپل کباب پسند ہیں۔ بڑھاپے میں اتنے جوان ہیں' پتہ نہیں جوانی میں کتنے بوڑھے رہے ہوں گے۔ انہیں غصہ بہت آتا ہے۔ کبھی تو اس بات پر غصہ آ جاتا ہے کہ مجھے فلاں بات پر غصہ کیوں نہیں آتا ہے۔ غصہ اتنا غضبناک کہ وہ تو اپنے ہی غصے سے ڈر کر کانپنے لگتے ہیں۔

بقول پیر پگاڑا "ایک تو ولی جو ہوتا ہے گرم ہے اور اوپر سے پٹھان یعنی بہت ہی گرم" قابل کو کابل کہتے ہیں۔ بھٹو انہیں اس لیے ناپسند نہیں کہ اس کی وجہ سے انہیں اندر جانا پڑا بلکہ اس وجہ سے کہ بیگم نسیم کو باہر آنا پڑا۔ تب سے بیگم نسیم ولی خان باہر ہیں اور خان صاحب اندر۔ کہتے ہیں "بھٹو دور میں تقریر پر پابندی تھی۔" حالانکہ یہ درست نہیں' تقریر پر کب پابندی تھی' مقرر پر تھی۔ بھارت سے اس کی زبان میں بات کرتے ہیں جبکہ پاکستان سے پشتو میں بات کرتے ہیں۔ ایک بار حکومت نے انہیں بھارت میں پاکستان کا سفیر بنا کر بھیجنا چاہا تو بھارت کی حکومت نے کہا "آپ کسی پاکستانی کو بھیجیں۔"

ارسطو نے کہا' انسان ایک سیاسی جانور ہے۔ پتہ نہیں یہ بات انہوں نے جانوروں سے ملنے کے بعد کہی یا سیاست دانوں سے۔ تاہم غل خان ایسے سیاست دان نہیں۔ ایک سیاست دان کو پتہ چلا کہ غل خان پان کھاتے ہیں نہ سگریٹ پیتے ہیں' شراب سے دلچسپی ہے نہ شباب سے۔ تو اس نے کہا۔ "آپ نے یہ کچھ کرنا ہی نہیں تو پھر سیاست کیوں کر رہے ہیں؟" ترقی پسند نذریات کی وجہ سے چل رہے ہیں۔ قوم پرست ہیں۔ ہر وقت آہ و افغان کرتے رہتے ہیں۔ وہ بیگم نسیم ولی کے مزاجی خدا ہیں۔ ان کا مزاج اس

پٹھان کی طرح ہے جو ہینگ لے کر آیا اور چلا چلا کر کہتا۔ "اینگ لے لو" جو چپ کر کے گزر جاتا' اسے کچھ نہ کہتا۔ اگر کوئی کہہ دیتا کہ مجھے ہینگ نہیں چاہیے تو خان غصے میں آ کر کہتا۔ "خو تم اینگ کیوں نہیں لیتا' ام تمہارے باپ کا نوکر ہے جو تمہارے واسطے اتنی دور سے اینگ لایا ہے۔"

غل خان لوگوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھیں نہ رکھیں' جس رگ پر ہاتھ رکھیں وہ ضرور دکھنے لگتی ہے۔ وہ ان سیاست دانوں میں سے ہیں جن کے پاس ہر حل کے لیے ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ ہے انا۔ سرحد میں پیدا ہی نہیں ہوئے' سیاست کے لحاظ سے بھی ہمیشہ سرحد پر ہی رہتے ہیں۔ پٹھانوں کا تو محبت کرنے کا انداز بھی اپنا ہوتا ہے۔ وہ تو کہتے ہیں۔ "خاناں وہ ہم کو اتنا اچھا لگتا ہے کہ دل چاہتا اسے گولی مار دوں۔" سردی گرمی ہر موسم میں گرم۔ ایک زمانہ تھا وہ لطیفہ بھی سنا رہے ہوتے تو لگتا دھمکی دے رہے ہیں۔ مگر اب یہ حال ہے کہ دھمکی بھی دیں تو لگتا ہے لطیفہ سنا رہے ہیں۔ ہم انہیں لطیفہ تو نہیں کہتے مگر وہ سیاست کے بم خان ہیں۔

○○○

• پکاسو کی بیوی

پاکستان بننے سے قبل سکھوں کے شہر ننکانہ میں ایک لڑکا ہاتھ میں ڈانگ لیے گزرتا تو ہر طرف سے آوازیں آنے لگتیں۔ "بابا ڈانگ' بابا ڈانگ" یہ بچہ ہر وقت ہاتھ میں ڈانگ اس لیے رکھتا کہ اس کے دوھیال والے اس کی ماں سے اچھا سلوک نہ کرتے۔ اسے اپنی امی سے اتنا پیار تھا کہ جب وہ بڑا ہو کر مصور بنا تو تصویر پر اس نے اپنا جو نام لکھا' اس میں بھی امی آتا تھا۔ وہ تھا "رامی" یہ الگ بات ہے کہ تصویر دیکھ کر لوگوں نے نام کو یوں ادا کرنا شروع کیا کہ احتیاطاً رامی کی بجائے رامے لکھنے لگے۔ وہ اداکار جتندر کے ہم عمر اور بچپن کے ساتھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کل رامے پچاس سے اوپر ہیں' جبکہ جتندر پچیس سے اوپر کے۔ ویسے بھی اداکار' بیوی اور کار جب پرانی ہو جائے تو چالیس سے اوپر نہیں جاتی۔ بہرحال ان دونوں دوستوں نے اداکاری کے لیے مختلف فیلڈ چنے اور کامیاب رہے۔

والدہ انہیں بچپن میں جھوٹ بولنے سے منع کرتیں۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ بیٹا بڑا ہو کر سیاست دان بنے گا۔ رامے صاحب جب کسی واقعہ پر حیران ہوں تو انہیں چپ لگ جاتی ہے۔ اپنی پیدائش کے تین سال بعد تک نہ بولے۔ چھوٹے تھے تو کئی سال بعد بولنا آیا۔ بڑے ہوئے تو کئی سال چپ ہونا نہ آیا۔ فلسفے میں داخلہ لیا۔ ہر گتھی سلجھا لی۔ جو گتھی سلجھنے کی بجائے الجھنے لگی' اس سے شادی کر لی۔ ماں اور بیوی نے ان کی شخصیت پر ایسا اثر ڈالا کہ آج بھی وہ پچاس فیصد ماں اور پچاس فیصد بیوی ہیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن پنجاب کی زنانہ آواز' عابدہ حسین پنجاب کی مردانہ آواز اور رامے صاحب پنجاب کی درمیانہ آواز ہیں۔ جو ان کی آواز ایک بار سن لے' پھر وہ انہیں محترم نہیں' محترمی کہہ کر ہی بلاتا ہے۔

سیاست اور محبت میں جو کرتے ہیں' وہ جائز ہوتا ہے۔ صرف وہ ناجائز ہوتا ہے جو دوسرے

کرتے ہیں۔ پہلے سیاست دان کرپٹ ہوتے تھے' آج کل کرپٹ سیاست دان ہو گئے ہیں۔ رامے خود کو اس سیاست کا باغی کہتے ہیں۔ انہیں مل کر باغی سے مراد باغ میں آنے جانے والا ہی لیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں میں مڈل کلاس سے ہوں۔ ہم نے سنا ہے' مڈل کلاس سے تو غلام حیدر وائیں صاحب تھے۔ رامے تو ایم اے ہیں۔ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے مڈل کلاس کی نمائندگی کی ہے تو یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم خود مڈل کلاس کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ مڈل کلاس میں ہم مانیٹر تھے۔

۱۹۵۷ء میں "نصرت" نکالا۔ بعد میں "نصرت" پیپلز پارٹی کا ترجمان بنا۔ اب تو نصرت پیپلز پارٹی کی ترجمان ہیں۔ بھٹو دور میں رسالے "نصرت" پر اپنے نام سے پہلے "طابع" لکھتے مگر اسے "تابع" پڑھتے۔ سولہ ماہ وزیراعلیٰ ہاؤس میں اور سولہ ماہ شاہی قلعے میں قید رہے۔ لوگ ان سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ جب وہ وزیراعلیٰ تھے تو لوگ وزیراعلیٰ ہاؤس کے سامنے جا کر کہتے۔ "وزیراعلیٰ کو رہا کرو" لیکن یہ آج تک یہی سمجھتے ہیں کہ عوام کہتے ہیں۔ "وزیر اعلیٰ رہا کرو" آج بھی نام کے ساتھ وزیر اعلیٰ یوں لکھتے ہیں جیسے ڈاکٹر اپنے نام کے ساتھ ایم بی بی ایس لکھتے ہیں۔

روزنامہ "مساوات" سے نکل کر مساوات پارٹی بنائی۔ دونوں میں یہ فرق تھا کہ روزنامہ "مساوات" کے کارکن زیادہ تھے۔ پارٹی کا اس قدر خیال رکھتے کہ جب کہیں باہر جاتے تو ہمسائیوں کو کہہ کر جاتے کہ اس کا خیال رکھنا' آ کر لے لوں گا۔ ریٹرن ٹکٹ پر سفر کرتے ہیں۔ وہ تو الیکشن میں بھی ریٹرن ٹکٹ پر ہی Suffer کرتے ہیں۔

مصوری فطرت کی عکاس ہوتی ہے۔ جی ہاں' مصور کی فطرت کی۔ پینٹنگ دیکھنے کا اصول یہ ہے' خود نہ بولو' پینٹنگ کو بولنے دو۔ رامے صاحب نے تجریدی مصوری کو بہت توجہ دی۔ ویسے بھی تجریدی مصوری اتنی توجہ مانگتی ہے کہ مصور کا ذرا دھیان ادھر ادھر ہو جائے تو بھول جاتا ہے کہ کیا بنا رہا تھا۔ سکھوں کے شہر میں پیدا ہوئے' مگر اپنی گفتگو سے اس کا پتہ نہیں چلنے دیتے۔ ان کی تصویروں سے پتہ چلتا ہے' بد صورتی کو بڑی خوبصورتی سے پینٹ کرتے ہیں۔ مصوری میں وہ پکاسو کی بیوہ ہیں۔ کسی تصویر کو کپڑے

پہنا دیں تو اس کی طرف یوں دیکھیں گے جیسے کوئی سخی کسی ننگے کو لباس پہنانے کے بعد دیکھتا ہے۔ بچپن میں ٹریس کر کے تصویریں بناتے اور مار کھاتے۔ ہمارے تو ایک جاننے والے مصور نے ٹریس کر کے تصویر بناتے ہوئے بیوی سے مار کھائی کیونکہ وہ ایک ماڈل حسینہ سے تصویر ٹریس کر رہے تھے۔

جہاں بلند بولنا ہو وہاں سرگوشی کریں گے' جہاں سرگوشی کرنا ہو وہاں خاموشی کریں گے۔ انہیں تو ایک آدمی سے بات کرنے کے لیے بھی مائیک چاہیے۔ اس قدر آہستہ بولتے ہیں کہ زور لگا کر سننا پڑتا ہے۔ ان کا چہرہ ایک بار دیکھ لو تو ایک بار ہی یاد رہتا ہے۔ بار بار دیکھو گے تو بار بار بھولے گا۔ انہیں ہر مشکل پسند آتی ہے۔ وہ تو مشکل کو مہ شکل سمجھتے ہیں۔

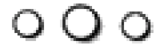
انہوں نے اپنی آواز کبھی بیوی کے قد سے بلند نہیں ہونے دی۔ ان کی پسندیدہ شخصیت ان کی بیوی کا شوہر ہے۔ ہر بیوی کے جذبات کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ اگر انہیں پتہ ہو کہ مجھے آج مرنا ہے تو وہ سب سے پہلے جو کام کریں گے' وہ یہ ہو گا کہ اپنی بیوی کو تعزیتی کارڈ ارسال کریں گے۔ سکول میں ان کی نرم طبیعت' قوت برداشت اور صبر کی وجہ سے ایک بار سکول ٹیچر نے کہا تھا۔ "یہ مستقبل کا مستقل شوہر ہو گا۔" آج کل دنیا کی سپر پاور امریکہ ہے۔ رامے صاحب کی "دنیا" کی سپر پاور بھی آج کل ایک امریکن ہی ہے۔

کہتے ہیں اقتدار کا بھولا شام کو پارٹی میں آ جائے تو بھولا نہیں کہلاتا۔ البتہ اگر وہ رات کو پارٹی میں آئے تو اور بات ہو گی۔ انہیں اگر ڈاکٹر کہے کہ آپ کی صحت کے لیے تبدیلی ضروری ہے تو صبح ایک پارٹی بدل لیں گے۔ کہتے ہیں۔ "میں نے زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ دیکھی ہے' وہ سورج ہے۔" واقعی چڑھتے سورج کو ان سے زیادہ کس نے دیکھا ہو گا۔ استاد تھے تو طبیعت میں شاگردی تھی۔ طبیعت میں استادی آئی تو سیاست میں آ گئے۔ انہیں ہر وقت ایک بندہ چاہیے جس کی تعریف کر سکیں۔ اگر کوئی نہ ملے تو شادی کا سوچنے لگتے ہیں۔ کافی اس قدر پسند ہے کہ صرف وہی چیز لیتے ہیں جو

کافی ہو۔ ہم تو کہتے ہیں مشروبات ہیں ہی دو طرح کے۔ ایک کافی اور دوسرے ناکافی۔

صاحب! جس نے کبھی عورت سے محبت نہیں کی، وہ قابل اعتبار نہیں ہو سکتا اور جس نے عورت ہی سے محبت کی۔ وہ بھی قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ ادب نے ان کا قد بحیثیت سیاست دان کم کیا اور سیاست نے ان کا قد بحیثیت ادیب کم کیا۔ کہتے ہیں، میری تحریروں میں علم و فضل کی کمی نظر آئے تو ادیب سمجھ کر معاف کر دیں۔

محمد حنیف رامے وہ تصویر ہیں جو انہوں نے خود بنائی ہے۔ کبھی انہوں نے اسے ایک سیاست دان وزیراعلیٰ کی شکل دی، کبھی ترقی پسند صحافی کی کبھی "پنجاب کا مقدمہ" لڑنے والے ادیب کی، کبھی مقرر اور کبھی دانشور کا روپ دیا اور کبھی ان سب پر خط تنسیخ پھیر کر ہاتھ میں برش پکڑ کر خود تصویر کی جگہ آ کھڑے ہوئے۔ یہ وہی بابا ڈانگ ہے جو خود تو وہی کا وہی رہا مگر اس کی ڈانگ گھستے گھستے قلم اور برش ہو گئی۔



- افریقہ کا بٹ

جیسے کسی بچے اور سردار جی کے بارے میں یہ پیش گوئی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اگلے لمحے کیا کرے گا ایسے ہی دلدار بھٹی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اگلے لمحے کیا کہے گا۔ کہتے ہیں اسے بولنے کی بیماری ہے حالانکہ وہ چپ ہو تو اس کا یقینی مطلب یہ ہے کہ وہ بیمار ہے۔ دوران گفتگو کسی کی سننا تو درکنار وہ اپنی بھی نہیں سنتا۔

لڑتے وقت دلدار بھٹی سے دلا بھٹی بن جاتا ہے۔ اگر کسی سے زیادتی کرے تو معافی مانگ لیتا ہے۔ اسی لیے کسی سے لڑ پڑے تو اسے دل کھول کر ذلیل کرتا ہے کہ کل معافی تو مانگ ہی لینا ہے۔ چھوٹے منہ کی بڑی سے بڑی بات کو بڑے حوصلے سے برداشت کر جاتا ہے مگر بڑے منہ کی چھوٹی بات پر میں نے اس کو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا ہے۔

دلدار دیکھنے میں ریڈیو کا آدمی لگتا ہے یعنی صرف سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ رنگ ایسا کہ نہا کے آ رہا ہو تو لگتا ہے نہانے جا رہا ہے۔ کہتا ہے اگر افریقہ میں ہوتا تو لوگ مجھے بٹ صاحب کہہ کر بلاتے۔

وہ پیدائشی نیوز کاسٹر ہے یعنی بچپن ہی سے اپنے باپ کے ساتھ اعتماد سے جھوٹ بولتا تھا کہ اس اعتماد سے نیک طینت سچ نہ بولتے ہوں گے شاید اسی لیے وہ اسے وکیل بنانا چاہتے تھے مگر وہ کسی دیوانی عدالت کی بجائے اپنے دیوانوں کی عدالت میں پہنچ گیا۔

عورتیں اسے دلدار' مرد بھٹی اور جنہیں کام ہو وہ بھٹی صاحب کہتے ہیں۔ دلدار عورتوں کو دلدار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے نئے نئے لباس خریدنے کا بہت شوق ہے جس کی وجہ سے میرا دوست "ف" یہ بتاتا ہے کہ وہ نئے نئے لباس آزماتا ہے کہ شاید کوئی اسے اچھا لگے۔ اپنے طور پر بڑا دھلا دھلایا رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کوئی ساتھ ہو تو میلا میلا لگتا ہے۔

وہ برے دنوں کی طرح آتا ہے اور جاتا بھی ایسے ہی ہے یعنی اس کے جانے کے گھنٹہ بعد تک یہی لگتا ہے جیسے ابھی اٹھ کر گیا ہو۔ مخالفین کے ساتھ ہی وہی سلوک کرتا ہے جو مخالفین اس کے ساتھ کرتے ہیں۔

بلا کا تیز ہے جو کام دوسرے ہفتوں میں کرتے ہیں۔ یہ دونوں میں کر لیتا ہے یعنی جتنی غلطیاں دوسرے ہفتے میں کرتے ہیں یہ ایک دن میں کر جاتا ہے۔ گاڑی اس امید پر چلاتا ہے کہ مخالف سمت سے آنے والا خود ہی بچا لے گا حالانکہ ہمارے ہاں مخالف سمت سے آنے والا بھی اسی امید پر ہوتا ہے۔

کسی کو چھوٹا بڑا نہیں سمجھتا اسی لیے اس کے فقروں سے چھوٹے بڑے مساوی طور پر غیر محفوظ ہوتے ہیں۔ زنانہ لباس کی طرح ہے یعنی جو اس کے اندر ہوتا ہے سب پر ظاہر کر دیتا ہے۔

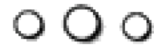
دلدار بھٹی نے بڑے بڑے بدتمیزوں کو مہذب بنایا ہے یعنی وہ اس کے پاس بیٹھے ہوں تو مہذب لگتے ہیں۔ وہ پیٹھ پیچھے برائی نہیں کرتا' یہ کام وہ سامنے کرتا ہے۔ اپنا کسی سے تعارف نہیں کراتا۔ کہتا ہے جو مجھے پہچانتے نہیں ان سے تعارف کروانے کا کیا فائدہ اور جو جانتے ہیں ان سے تعارف کی کیا ضرورت! نتیجہ یہ کہ اب لوگ اسے تعارف کے بغیر ہی برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ اس کا قد ایسا ہے کہ آپ پاکستان کے کسی بھی کونے میں کھڑے ہوں اس کو پتھر مار سکتے ہیں۔

تانک جھانک کا اسے بچپن ہی سے شوق تھا۔ آج کل ٹی وی کی کھڑکی سے لوگوں کے گھروں میں جھاتیاں مارنے لگا ہے۔ کمپیئرنگ یہ جاننے کا فن ہے کہ کب چپ ہونا ہے۔ جسے یہ پتا نہ ہو اسے ٹی وی کمپیئر کہتے ہیں۔ راحت کاظمی کمپیئرنگ کر رہا ہو تو مہمان اس کے مد مقابل ہوتا ہے۔ وہ اردو یوں بولتا ہے جیسے اس پر احسان کر رہا ہو۔ طارق عزیز مائیک پر یوں چلاتا ہے جیسے فٹ پاتھ پر منجن بیچ رہا ہو۔ وہ جانتا ہے سچ کا بول بالا ہوتا ہے اسی لیے بلند آواز میں بولتا ہے اور وہ بھی یوں لگتا ہے لہجے' الفاظ اور تلفظ پر تشدد کر رہا ہو۔ نعیم بخاری اپنی انکساری کے باعث سیٹ کا حصہ لگنے

لگتا ہے۔ یوں بولتا ہے جیسے بخار میں بول رہا ہے۔ مہتاب چنہ چپ ہو تو سنائی دیتی ہے۔ بول رہی ہو تو دکھائی دیتی ہے جبکہ خوش بخت شجاعت تو عورتوں کی طارق عزیز ہے۔

انور مقصود سولہ سنگھار کرکے آتا ہے' بات بعد میں کرتا ہے داد طلب نگاہوں سے سامعین کو پہلے دیکھتا ہے۔ سلمیٰ بیگ بولتی ہوئی لگتی ہے معافیاں مانگ رہی ہے۔ دلدار اردو بولتا ہوا لگتا ہے اردو نہیں بول رہا۔ وہ کمپیئرنگ کم اور مداری زیادہ کرتا ہے۔ اس میں لفظی بازی گری نہیں زندگی کا ہلا گلہ ہے۔ دوسرے لکھا ہوا بولتے ہیں اس کا بولا ہوا لکھا جاتا۔

اس کی اس قدر صلاحیتیں دیکھ کر لگتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے بیک وقت زنانہ اور مردانہ صلاحیتیں بخشی ہیں۔ دلدار بھٹی کی ان صلاحیتوں کا سب سے بڑا دشمن دلدار بھٹی ہے۔ وہ ایک جینئس کمپیئر ہے جسے اس نے مار دیا وہ منفرد کالم نگار بھی ہے جسے اخبار والوں نے مار دیا۔ وہ اعلیٰ درجے کا اداکار ہے جسے پتا نہیں کس نے مارا ہے اور یوں وہ بڑا آدمی بننے سے بال بال بچا ہوا ہے۔



• ڈاکٹر بلھے شاہ

اسے جتنے بلھے شاہ کے شعر یاد ہیں اتنے تو خود بلھے شاہ کو بھی یاد نہ ہوں گے۔ جس سے خوش ہوا اسے بلھے شاہ کا شعر سنائے گا۔ ناراض ہو تو دو سنائے گا۔

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کا پرنسپل ہونا اس کے لیے باعث افتخار ہے۔ طلباء کو ماں کی نظر سے دیکھتا ہے مگر سلوک باپ والا کرتا ہے۔ وہ بھی اسے وہی اہمیت دیتے ہیں جو آج کل کی اولاد باپ کو دیتی ہے۔ طلباء کا محبوب استاد اسی لیے طلباء اس کے وعدے کو محبوب کا وعدہ سمجھتے ہیں۔ طلباء کو دوست سمجھتا ہے اس میں اتنی برائی نہیں' مسئلہ یہ ہے کہ طلباء بھی اسے دوست سمجھتے ہیں۔ کوئی طالب علم اس کے آفس چلا جائے تو اسے بھی چائے پلا کر بھیجے گا اسی لیے اکثر لیڈر قسم کے طلباء کنٹین کی بجائے اس کے آفس میں زیادہ ملتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد لڑکوں میں بیٹھا ان کی عمر کا لگتا ہے اور بوڑھوں میں بیٹھا ہو تو بوڑھے اس کی عمر کے لگنے لگتے ہیں۔ چال پاکستان جیسی اور چال چلن بھی ایسا ہی یعنی حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ۔ لباس ایسا کہ کوئی اور بھی پہنتا تو ویسا ہی لگتا۔ کوٹ پر لگا پھول اتنا تازہ ہوتا ہے کہ لگتا ہے لگا نہیں اگا ہوا ہے۔

بڑے دل کا آدمی ہے مگر میڈیکل میں بڑا دل ہونا بیماری ہے۔ تاہم اتنا اچھا ہے کہ کوئی برا آدمی اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اس قدر ہنستا مسکراتا رہتا ہے کہ شادی شدہ نہیں لگتا مگر اس کی جیب دیکھ لو تو فوراً یقین ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر افتخار کے ہاں سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں آیا۔ کچھ نہ دے سکے تو دعا ضرور دیتا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر کی دعا اور بیوی کی چپ کبھی اچھا شگون نہیں رہا۔ ہمارے ہاں جو ایک بار بڑے ڈاکٹر سے دوائی لے لے پھر ایک سال تک کسی کلینک پر نظر نہیں آتا۔ ہاں ایک سال بعد اس کے پاس اتنے پیسے ہو جاتے ہیں کہ دوبارہ ڈاکٹر کے پاس

جا سکے۔ اس کے پاس بھی اکثر مریض اتنی دیر کے بعد ہی آتے ہیں جس کی وجہ یہ ہوتی ہے وہ ادھار دوائی ہی نہیں اس سے واپسی کا کرایہ بھی لے کر گئے ہوتے ہیں۔

سنا ہے وہ بڑا سخی ہے۔ وہ سخی نہ ہو غنی ضرور ہے کہ سخی کو پیسے جانے کا دکھ نہیں ہوتا اور غنی کو پیسے آنے کی خوشی نہیں ہوتی۔

اس کا ماٹو ہے "زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا" اوروں کو یہی کہہ کر اس نے زندگی کا مقصد حاصل کیا ہے۔

کبھی اتنی اچھی باتیں کرتا ہے کہ یقین نہیں آتا کہ وہ ڈاکٹر ہے اور کبھی ایسی کہ پھر بھی یقین نہیں آتا۔ بڑے سے بڑے مسئلے کا فیصلہ ہاں یا ناں میں کر دے گا۔ جب تک مسئلہ غیر اہم نہ ہو اس پر زیادہ گفتگو نہیں کرتا۔ ایک منٹ بولنا ہو تو پانچ منٹ سوچے گا پانچ منٹ بولنا ہو تو ایک منٹ سوچے گا۔

اس کے دفتر میں کوئی بھی چلا جائے اس کی خاطر کرے گا جیسے انتخابی امیدوار کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ خاطر کبھی الیکشن سے پہلے والی ہو گی اور کبھی بعد والی۔

ہر کاغذ اچھی طرح پڑھ کر اس پر دستخط کرتا ہے۔ ایک بار اس نے بغیر پڑھے ایک کاغذ سائن کیا تھا' وہ تھا "نکاح نامہ" پھر ساری زندگی کبھی ایسا نہیں کیا۔

دشمنوں کے معاملے میں بڑا محتاط ہے۔ دوست بنانے کے لیے کسی کی صلاحیتیں دیکھے نہ دیکھے دشمن بنانے کے لیے ضرور دیکھے گا کیونکہ اس کی یہ ترقی اس کے دشمنوں ہی کی مرہون منت ہے۔ اس نے اپنی تربیت دوستوں کی بجائے دشمنوں سے کرائی۔ وہ اس کی شخصیت ہیں جو خامیاں نکالتے یہ انہیں شخصیت سے نکال دیتا۔ دوستوں کے ساتھ سلوک اپنی توفیق کے مطابق کرتا ہے جبکہ دشمنوں کے ساتھ ان کی توفیق کے مطابق۔ جو اسے دوسروں سے محتاط رہنے کے لیے کہے اس سے محتاط رہنے لگتا ہے۔

اپنے گھر کے علاوہ ہر جگہ مہمان خصوصی ہوتا ہے۔ رائے مانگو تو فیصلہ دے گا اور فیصلہ مانگو تو رائے۔ کلاس روم میں ہر موضوع پر اتنا لیکچر دیتا ہے کہ اس کی ہر بات سمجھ

میں آ رہی ہوتی ہے۔ بس ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کس موضوع پر لیکچر دے رہا ہے۔ جس کے ساتھ تعلقات ہوں وہ سمجھے گا اس کے سب سے اچھے تعلقات میرے ساتھ ہی ہیں جس کا کام نہ کرے وہ سمجھتا ہے اس نے صرف میرا کام نہیں کیا۔

ایک بار ایک طالب علم نے اس کی کار کو ٹھوکر مار دی۔ سرجری کے ایک پروفیسر نے دیکھ لیا اور اس لڑکے کو پکڑ کر ڈاکٹر صاحب کے آفس میں لے آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے طالب علم کو ڈانٹا اور پروفیسر موصوف کو خوش کیا۔ جونہی وہ گیا اس طالب علم کو چائے پلائی اور باتوں سے اسے بھی خوش کر دیا۔ اور ساری زندگی یہی کیا۔ وہ ہر کسی کو خوش رکھنا چاہتا ہے جو ایسے ہی ہے جیسے بندہ بیک وقت ہوائی' بحری اور بری سفر کرنا چاہے۔ اس نے جسے بھی ناخوش کیا خوش کرنے کی کوشش میں کیا۔

وہ ایک آدمی نہیں ایک اجتماع ہے جس میں صوفی' شاعر' آرٹسٹ' مقرر' ڈاکٹر' استاد' سیاستدان' شاگرد' دوست' دشمن' پنجابی' پاکستانی اور پتا نہیں کون کون شامل ہے۔ ایک وقت میں وہ ان سب میں سے ایک ہوتا ہے۔ مگر یہ کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ کس وقت کون ہے؟

وہ آنکھ' دل' زبان اور جوتے کبھی میلے نہیں ہونے دیتا۔ ہر پانچ منٹ بعد صاف کرتا رہتا ہے۔

کہتے ہیں جو موسیقی سنتا ہے وہ ظالم نہیں ہو سکتا۔ واقعی آج کل کی موسیقی سن کر یقین ہو جاتا ہے کہ اسے سننے والا ظالم نہیں مظلوم ہی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر بلھے شاہ کو بھی موسیقی سے لگاؤ ہے۔ جوانی میں آدمی کی سب سے کمزور چیز اس کی قوت سماعت ہوتی ہے۔ اسی لیے نوجوانوں کو گانے سننے کے لیے ٹیپ ریکارڈر فل آواز میں لگانا پڑتی ہے اور موسیقی سنتے وقت ڈاکٹر بلھے شاہ بھی نوجوان لگتا ہے۔ اپنی ساتھی خواتین کے ساتھ اس کا سلوک درمیانہ ہوتا ہے کیونکہ عورتوں سے مردوں والا سلوک کرو تو گھر سے نہ آئیں گے اور اگر ان سے عورتوں جیسا برتاؤ کرو تو بیوی آپ کو گھر نہ آنے دے گی۔

وہ پروفیسر ہے' شاید اسی لیے حیران کرتا رہتا ہے۔ آپ اس کے پاس کوئی کام لے کر جائیں اور آپ کو یقین ہو کہ وہ یہ کام نہیں کر سکتا مگر وہ کام کرکے آپ کو حیران کر دے گا۔ اگلی بار آپ جائیں اور آپ کو یقین ہو کہ وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ اس بار بھی وہ آپ کو حیران کر دے گا۔ اس سے تو ملاقات کرکے نکلو تو لگتا ہے بندہ ڈرامے کی قسط دیکھ کر نکلا ہے۔ اگلی ملاقات میں کیا ہو گا اس میں وہی سسپنس ہوتا ہے جو اگلی قسط میں ہوتا ہے۔

اپنی طبی صلاحیتوں کی وجہ سے اس نے بہت سے آدمیوں کو جنت جانے سے روکا اور اپنی طبعی صلاحیتوں سے بہت سوں کو جنت کی راہ دکھلائی۔

ڈاکٹر ملیحے شاہ مستقبل کا وہ لمحہ ہے جس کے بارے میں آپ حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے مگر ہر شخص اس سے پر امید ضرور ہوتا ہے۔

○○○

• گلابوں والی گلی والی

اس وقت کی بات ہے جب لڑکیاں آج کے زمانے میں سے زیادہ لڑکیاں ہوتی تھیں۔
شعبہ نفسیات پنجاب یونیورسٹی کی طالبہ نیلم کاغذ پر لکھ رہی تھی' اچانک احمد بشیر اس کے

پاس آیا اور کہا "یہ بعد میں لکھ لینا پہلے ذرا شادی کر لو' اور وہ حیران دیکھتی رہی۔
احمد بشیر کو حیران کرنے کی بری عادت ہے یہاں تک کہ لوگ نیلم' سنبل' بشریٰ انصاری اور اسماء وقاص کو اس کی بیٹیاں سمجھتے رہے۔ چاروں ادب و ثقافت میں آئیں تو بیٹا نکلیں۔
نیلم احمد بشیر کے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ جب وہ پیدا ہوئی تو اسے لگا وہ گھر میں نہیں لائبریری میں پیدا ہوئی ہے۔ وہ سب بہنوں سے بڑی تھی اور اب تک بڑی ہے۔ بچپن میں اس سے چھوٹی سی غلطی ہو جاتی تو احمد بشیر کہتا تمہاری یہ جرات چھوٹی سی غلطی تو آج تک ہمارے خاندان میں کسی نے نہیں کی۔ صبح اٹھ کر ناشتہ تیار کرکے ماں کو کہتی کہ اب آپ اٹھ جائیں میں نے آپ کے دانت صاف کر دیئے ہیں۔
شکل و صورت میں ایسی کہ منٹو کو پڑھ رہی ہو تو لگتا ہے کہ بہشتی زیور پڑھ رہی ہے ویسے وہ اتنی معصوم نہیں جتنی شکل سے لگتی ہے' اس سے زیادہ ہے۔ اپنے ہاتھ سے کیئے کام کو اچھا سمجھتی ہے۔ وہ تو اپنے ہاتھ سے ابالے پانی کو دوسروں سے زیادہ گرم سمجھتی ہے۔ بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نہیں نکالتی منہ سے نکالتی ہے۔
بولنے کا اس قدر شوق ہے کہ اس کی بیشتر کہانیاں واحد متکلم میں ہوتی ہیں۔ سوچتی انگریزی میں' بولتی پنجابی اور لکھتی اردو میں ہے جبکہ سمجھتی کسی زبان میں بھی نہیں۔
اس قدر نرم دل کہ ٹی وی ڈرامے میں کسی جاننے والے کو بیمار دیکھ لے تو اس کے گھر عیادت کرنے چلی جائے گی اور اگر کوئی سچ مچ بیمار ہو تو اس قدر پریشان ہو گی

کہ اس کا چہرہ دیکھ کر اپنے بچنے کی امید نہ رہے گی' یادداشت بہت بری ہے آپ پوچھیں گے کیا ہر بات بھول جاتی ہے' جی نہیں! ہر بات یاد رکھتی ہے۔ دوسروں کے دکھ سکھ میں اس قدر شامل ہوتی ہے کہ موچ کسی کے پاؤں میں آتی ہے اور چلا اس سے نہیں جاتا۔

مشہور گلوکارہ بننے کے لئے جو کچھ چاہیے اس کے پاس ہے' گا بھی لیتی ہے' پینٹنگ بھی کرتی ہے' ویسے تو ہر خاتون بنیادی طور پر پینٹر ہوتی ہے لیکن "ف" کہتا ہے کہ یہ ضروری بھی نہیں کچھ خواتین میک اپ نہیں بھی کرتیں۔ اداکاری کا بھی شوق ہے' بشریٰ انصاری اور اسماء وقاص نے تو یہ شوق پورا کرنے کے لئے ٹی وی ڈراموں میں کام کیا اور اس نے شادی کر لی۔ اس لحاظ سے وہ اپنی ذات میں انجمن ہے مگر جنہوں نے اسے دیکھا ہے انجمن کو بھی دیکھا ہے' وہ نہیں مانتے۔

صبح سے گھر نکلتے وقت پہلے گاڑی تک آئے گی پھر اندر واپس چلی جائے گی۔ یوں گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے تیز تیز اندر باہر کے کئی چکر لگائے گی۔ اسے ہی پتہ ہوتا ہے کہ وہ چابیاں تلاش کر رہی ہے' محلے والے سمجھتے ہیں جوگنگ کر رہی ہے۔ کہتے ہیں جس دن نوکرانی پر غصہ آئے تو اسے کچھ کہنے کی بجائے گھر کا سارا کام خود کرنے لگے گی اس حساب تو ہر وقت غصے میں رہتی ہے۔ کہتی ہے میں نے ایک دن نوکرانی کو کہہ دینا ہے میرے سے اب اتنا کام نہیں ہوتا تم کوئی اور مالکن رکھ لو۔ مالی ہر مہینے والد کی وفات کا ------ بہانہ کرکے ایڈوانس اور چھٹی لے کر جاتا ہےاور یہ ہر ماہ سخت دل کرکے فیصلہ کرتی ہے کہ اللہ کرے اب اس کا والد فوت نہ ہو۔ اگر ہو گیا تو اب ایڈوانس اور چھٹی نہیں دوں گی۔

اس کے گھر میں ہر قسم کا ساز و سامان ہے۔ میں نے اکثر سنا ہے والدین نے بیٹی کو جہیز میں بڑا ساز و سامان دیا تا کہ اسے نیا گھر چلانے میں آسانی ہو۔ سامان کی تو سمجھ آ جاتی ہے ساز کیوں دیتے ہیں؟ اس کا پتہ نہیں' بہرحال اس کے پاس تو بڑی اینٹیک

چیزیں ہیں جو اس نے اس وقت خریدیں جب ابھی نئی تھیں۔

پندرہ برس امریکہ میں رہی جہاں اس قدر سردی ہوتی کہ گھنٹوں کار اور گفتگو اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں لگ جاتے تب کہیں جا کر کار اسٹارٹ ہوتی۔ امریکی معاشرہ تو وہ ہے جہاں ایک شادی کی تقریب میں ایک خاتون نے نئی آنے والی مہمان سے پوچھا کہ آپ دولہے کی کون ہیں؟ تو اس نے جواب میں اس سے کہا' اس کی بہن ہوں۔ تو پہلی عورت نے کہا آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی' میں دولہے کی والدہ ہوں۔

پندرہ سال اس معاشرے میں رہنے کے بعد اس کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ دن میں دو بار بھی ملے تو ہر بار یوں ملے گی جیسے پندرہ سال بعد مل رہی ہو۔

کہتی ہے مجھے بچپن ہی سے ادب سے لگاؤ تھا اس لئے سائنس ٹیچر نے کہا مادہ پھیلتا ہے تو اس نے فوراً اٹھ کر تذکیر و تانیث کی غلطی نکال کر کہا مادہ پھیلتی ہے۔ یہی نہیں وہ تو مادہ پرست بھی شادی شدہ کو سمجھتی۔ نیلم عمر کے معاملے میں ان سے بہت کم عمر ہے جو اس سے زیادہ عمر کی ہیں اور ان سے تھوڑی بڑی ہیں جو اس سے بہت کم عمر ہیں۔

دس سال کا بچہ بھی اس سے گھنٹہ گفتگو کر لے تو وہ خود کو چالیس سال اور اسے دس سال کا سمجھنے لگے گا۔ غلطی کرنے کے باوجود اسے پتہ نہیں چلتا کہ اس نے غلطی کی ہے' اسے تو شادی کے کئی سال بعد جا کر پتہ چلا کہ وہ شادی شدہ ہے۔

نیلم پندرہ سال امریکہ میں وہ نامکمل کاغذ ہاتھ میں پکڑے حیران کھڑی دیکھتی رہی۔ بہرحال ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے اس دوران کچھ نہیں کیا ماشاء اللہ تین بچوں کی ماں ہے۔ گذشتہ دو سالوں میں اس نے پندرہ سال پہلے کا خالی کاغذ رنگوں سے بھرا تو اس کا نام "گلابوں والی گلی" رکھا۔ کہتی ہے میں نے علامتی افسانے لکھے ہیں۔ غلط کہتی ہے' ایک بار امتحان میں ممتحن نے "ف" سے پوچھا کہ انور سجاد کے اس علامتی افسانے کا مطلب کیا ہے؟ تو "ف" نے کہا' سر! اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے فیل کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے سنا ہے "گلابوں والی گلی" بڑی ننگی کتاب ہے۔ جب نیلم نے یہ کتاب مجھے دی تو واقعی ننگی تھی، یعنی بغیر ٹائٹل کور کے۔ البتہ اسے پڑھ کر میں خود کو ننگا محسوس کرنے لگا۔ مجھے لگتا ہے کہ نیلم جسے لوگ آج نیلم احمد بشیر کے حوالے سے جانتے ہیں ایک وقت آئے گا کہ احمد بشیر کو لوگ نیلم کے حوالے سے جانیں گے۔

○○○

• حسینہ ایٹم بم

اسے شاید حسینہ ایٹم بم اس لئے کہتے ہیں کہ جو ہیرو اس کے ساتھ ایک گانا فلما لے وہ پھر ہیرو کم اور ہیروشیما زیادہ لگنے لگتا ہے۔ وہ فلم انڈسٹری کے قابل دید مقامات میں سے ایک ہے۔ بچپن ہی سے اس میں اداکارہ بننے کی صلاحیتیں تھیں یعنی دن کا کام رات کو کرتی۔ بارہ سال کی عمر میں ہی اس کی آواز اتنی بدل گئی کہ وہ ناں کہتی تو ہاں لگتا البتہ ہاں کہتی نہ تھی' ہاں کرتی تھی۔

تعلق اس خاندان سے جہاں مائیں بیٹیوں کو اتنا چیک نہیں کرتیں جتنا چیک سمجھتی ہیں۔ اس کی نانی کے دور میں ایک حکمران نے ان کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے تو انہوں نے ان کی پشتوں کو کشتے لگا دیئے۔ اس کی والدہ کی باتیں حکمت بھری ہوتی ہیں یعنی ہر چند فقروں کے بعد معجونوں اور مربوں کا ذکر ہوتا ہے البتہ یہ خود مربے کو مربعے کہتے ہیں۔ عمر کے بارے میں ان کے ہاں کوئی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس کی والدہ سے عمر پوچھو تو کہے گی "تیس کے اوپر ہوں۔" اور واقعی وہ ٹھیک کہتی ہے' اس کی عمر تیس سے اوپر ہے یعنی ستر سال۔ گھر میں حسینہ ایٹم بم کی اپنی والدہ کے ساتھ تصویر ہے' جب اس کی والدہ ابھی دس بارہ سال کی بچی تھی۔ حسینہ ایٹم بم ڈبے کے دودھ پر پلی جس کی وجہ اس کی والدہ یہ بتاتی ہے کہ ڈاکٹر نے کہا تھا "بچی کے منہ میں جو کچھ ڈالو اسے پہلے ابال لو۔" سو اسے فیڈر شروع کروا دیا۔ بچپن میں جب شام کو اسے ٹیوشن پڑھانے والا ٹیچر پوچھتا کہ گیارہ کے بعد کیا آتا ہے تو کہتی "ماسٹر صاحب گیارہ کے بعد کوئی نہیں آتا' بے شک قسم لے لیں۔"

سال میں چند مہینے شادی شدہ رہتی ہے۔ کہتی ہے "میرے تین بچے ہیں' ایک پہلے خاوند سے' ایک تیسرے سے اور ایک میرا اپنا ہے۔" پوچھو کہ جب تیسرا بچہ پیدا ہوا اس

سے کافی عرصہ قبل تمہارا شوہر فوت ہو چکا تھا' کہے گی۔ "وہ فوت ہوا تھا میں تو فوت نہیں ہوئی تھی۔" جو بچی پہلے اسے ماں کہتی اب یہ اسے یوں ملتی ہے جیسے اس کی بہن ہو یوں اس نے اپنے رویے سے اس کی ماں بہن ایک کر دی ہے۔ کہتی ہے کہ پہلا خاوند اس قدر شکی تھا کہ میں نے مری کی پہاڑیوں پر بیٹھ کر اسے تصویر بھیجی اور لکھا میرا سارا دن مری کی پہاڑیوں پر تمہارے بغیر یوں تنہا گزرتا ہے تو وہ بجائے محبت کا جواب محبت سے دیتا' اس نے آگے سے یہ لکھ بھیجا کہ تم تنہا تھی تو پھر یہ تصویر کس نے کھینچی؟ پہلے گھر ایسا تھا کہ اسے پہلو بدلنے کے لئے بھی خاوند کو اٹھانا پڑتا جوں جوں گھر بڑا ہوتا گیا خاوند چھوٹا ہوتا گیا۔ بعد میں گھر اتنا بڑا ہو گیا کہ اسے خاوند سے بات بھی کرنے کے لئے ٹیلی فون استعمال کرنا پڑتا۔ پھر ایک روز وہ اسٹوڈیو جاتے ہوئے نوکروں سے کہہ گئی کہ میری واپسی تک وہ تمام چیزیں جنہیں میں استعمال نہیں کرتی گھر میں نہیں ہونی چاہئیں اور وہ اس کے گھر واپس آنے سے پہلے ہی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

دوسری شادی دو دن ہی چلی' اس کے جاگیردار عاشق نے شادی سے اگلی صبح جب سویرے سویرے اٹھ کر اسے دیکھا کہ بغیر میک اپ کے سوئی ہوئی اٹھ کر اخبار پڑھ رہی تھی کہ اس نے ساس سمجھ کر گفتگو شروع کر دی جو طلاق پر جا کے ختم ہوئی۔ اس نے خاوند کی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے ان میں سے ایک اس کے ماتھے پر بھی تھا۔ کہتی ہے کہ تیسرے خاوند سے پہلی لڑائی کی صلح اس مولوی نے کرائی جو ان کا نکاح پڑھانے آیا تھا۔ ایک بار خاوند نے لڑ کر قسم کھائی کہ مہینہ تمہیں منہ نہ دکھاؤں گا۔ بہت پریشان ہوئی۔ ایک فلساز نے تسلی دیتے ہوئے کہا' پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ چٹکی بجاتے مہینہ گزر جائے گا تو کہنے لگی اسی لئے تو پریشان ہوں۔ کہتی' میں کئی کئی دن اس کے ساتھ باوفا رہتی لیکن پھر بھی وہ شادی کی سالگرہ پر پانچ منٹ کی خاموشی اختیار کرتا۔ چوتھی سالگرہ پر وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

دنیا میں بندہ آتا ہے تو ننگا ہوتا ہے اور جب جاتا ہے سفید لٹھے میں ملبوس ہوتا ہے۔ گویا قیام دنیا کا وقفہ اتنا ہی جتنا ننگے کا لباس پہننا۔ حسینہ ایٹم بم لباس پہنتی ہے جو دیر سے شروع ہو اور جلدی ختم ہو جائے۔ لباس پہنا ہو تو پتہ نہیں چلتا کہ وہ لباس کے اندر ہے اور باہر نکلنا چاہتی ہے یا لباس باہر ہے اور اندر جانا چاہتی ہے۔ بیٹھی ہوئی تصویر لگتی ہے۔ "ف" کہتا ہے "وہ تصویر تو ہے مگر اوور ایکسپوزڈ اور اوور ڈیویلپڈ" اس کا لباس اس قدر تنگ ہوتا ہے کہ پاس کھڑے شخص کا سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔

پشاور کی رہنے والی ہے اور کہتے ہیں پشتو فلموں کو پسند کرتی ہے۔ حالانکہ بھری محفل میں اس سے پشتو فلم کا ذکر کر دیا جائے تو منہ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اپنے علاقے کے مردوں کا اس قدر احترام کرتی ہے کہ ان کی طرف پشت کرکے کھڑی نہیں ہوتی۔

امریکہ میں رہی' ایک صحافی نے پوچھا "وہاں آپ صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے کیا کرتی تھیں۔" کہنے لگی "سب سے پہلے اٹھ کر میں واپس اپنے اپارٹمنٹ میں آتی۔" دوران گفتگو اپنے بارے میں ہم استعمال کرتی ہے۔ پہلی شادی کے وقت سہیلیوں کے درمیان بیٹھی تھی تو مولوی صاحب نے پوچھا "آپ کو فلاں بن فلاں قبول ہے؟" تو شرما کر کہا "ہم کو قبول ہے۔" تو مولوی صاحب نے فوراً ٹوکا "بی بی اپنی بات کریں۔" کسی نے پوچھا "آپ کو سب سے پہلے جس نے پیار کیا' آپ نے اسے کیا کہا؟ بولی "اس کو میں نے کیا کہنا تھا' کیونکہ اس وقت تک تو میں نے ابھی بولنا شروع نہیں کیا تھا۔" جس جسم پر تکیہ تھا اب وہ خود تکیہ لگتا ہے۔ پہلے اس کی گردن صراحی جیسی تھی اب تو یہ خود صراحی لگتی ہے ویسے یہ صراحی بہت سراہی گئی۔ خاندان تو وہ ہے جس میں بیٹی کو ماں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے مگر اسے دیکھ کر لگتا ہے اس نے اپنا بوجھ اتنا اٹھایا نہیں جتنا لٹکایا ہوا ہے۔ اس کا بدن قوسوں سے مل کر بنا ہے مگر ہر قوس کوس کی ہے۔ جلد اتنی پتلی کہ جھکے تو لگتا ابھی جسم کا کوئی حصہ ڈھلک کر نیچے اتر پڑے گا۔ بازو اتنے لمبے کہ فلم میں انگڑائی لے تو سکرین سے باہر نکل

آتے ہیں۔
اس کا گھیر دیکھ کر بندہ گھبرا جاتا ہے مگر پھر بھی گھیر لیتی ہے۔ سلمنگ سنٹر جاتی رہی' جس سے آہستہ آہستہ اس کا لباس سلم ہوتا گیا مگر جسم اب بھی ایسا ہے کہ صرف کھڑے ہونے کے لئے اسے ایک بندے کی جگہ آگے اور ایک ہی کی پیچھے خالی رکھنا پڑتی ہے۔

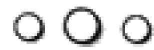
چائے کے ساتھ سکینڈل پسند کرتی ہے کہ اس سے چائے میں چینی ڈالنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ کہتی ہے' جوان وفادار ہونا چاہتا ہے مگر ہو نہیں سکتا اور بوڑھا بے وفا ہونا چاہتا ہے مگر ہو نہیں سکتا۔ یوں وہ بہانے بہانے خود کو جوان ثابت کرتی رہتی ہے۔

اس کی اداسی بھی ایک ادا سی ہوتی ہے۔ پوچھو' محبت کیسے شروع ہوتی ہے تو کہے گی محبت م سے شروع ہوتی ہے۔ کسی نے کہا' میاں بیوی کے جھگڑوں میں ثالث بچے ہوتے ہیں؟ تو کہنے لگی' غلط! میاں بیوی کے جھگڑوں میں ثالث رات ہوتی ہے۔ کہتی ہے' مرد اور عورت کی سوچ ایک جیسی ہوتی ہے' عورت مرد سے سونا مانگتی ہے اور مرد بھی بدلے میں سونا ہی مانگتا ہے۔"

اس قدر بولتی ہے کہ صرف نہیں کہنے میں تین گھنٹے لگا دیتی ہے البتہ ہاں کہنے میں سیکنڈ نہیں لگاتی۔ کہتی ہے' اب میں اتنی عمر کی نہیں رہی جتنی پندرہ سال پہلے تھی' پانچ سال بڑی ہو چکی ہوں۔ صحافیوں سے ناراض رہتی ہے کہ یہ کچھ کا کچھ لکھ دیتے ہیں۔ ایک بار میں نے کہا میرا چہرہ دیکھ کر وقت رک جاتا ہے تو انہوں نے اگلے دن یہ چھاپ دیا کہ میں اپنے چہرے سے چلتا کلاک روک سکتی ہوں۔

ایک دفعہ اس کے کسی پرستار نے سٹوڈیو سے لوٹتے ہوئے اس کا زبردستی ہاتھ پکڑ لیا تو اس نے غصے سے کہا "اگر تم نے آدھ گھنٹے کے اندر اندر میرا ہاتھ نہ چھوڑا تو میں پولیس کو بلا لوں گی۔ ہلکی پھلکی کتابیں پسند کرتی ہے۔ کہتی ہے کتابیں ہلکی پھلکی ہوں تو انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں آسانی رہتی ہے۔ ایک دفعہ "ف"

اسے ملنے گیا تو وہ ننگے پاؤں دروازہ کھولنے آئی اس کے پاؤں ٹھوڑی تک ننگے تھے۔ کہتی ہے اگر کوئی اداکارہ کو لباس کے بغیر دیکھ کر خوش نہ ہو تو یقین کر لیں وہ جیب کترا ہے۔ وہ دنیا کے ہر فرد سے محبت کرنا چاہتی ہے جس میں کوئی برائی نہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ علیحدہ علیحدہ کرنا چاہتی ہے۔ صبح اٹھ کر جب تک میک اپ نہ کر لے خود اپنی شکل نہیں دیکھتی۔ کہتی ہے، مجھے لپ اسٹک لگانے کے بیس طریقے آتے ہیں۔ "ف" نے کہا، ہمیں تو ایک طریقے کا پتہ ہے لپ اسٹک ہونٹوں پر مسلو۔ تو بولی، اکیس! لپ اسٹک لگائے بغیر تو وہ ٹیلی فون پر بات نہیں کرتی۔ ایک بار اس کی والدہ اس قدر بیمار ہوئی کہ بستر پر چادر کی طرح بچھ گئی کسی نے کہا اللہ سے دعا کرو ان کی حالت سے تو لگتا ہے کہ موت کا فرشتہ آیا چاہتا ہے اس نے فوراً متوجہ ہو کر پوچھا "کون آیا چاہتا ہے، ذرا میری لپ اسٹک دینا۔"



• آدھا شیعہ

وہ شخص جس کے گھر والوں کے علاوہ شاید ہی کوئی جانتا ہو کہ منیر احمد قریشی کون ہے؟ اور یہی وہ شخص کہ شاید ہی کوئی گھر ہو جو یہ نہ جانتا ہو کہ منو بھائی کون ہے؟ دیکھنے میں اس کا کچھ بھی اپنا نہیں لگتا' سر کسی بوڑھے کا' عینک کسی بڑھیا کی' چہرہ بھائی کا اور دل دوست کا۔ رنگ ایسا کہ گوروں میں کھڑا ہو تو گورا نہیں لگتا۔ کالوں میں کھڑا ہو تو کالا نہیں لگتا جیسے میں بڑوں میں کھڑا ہوں تو کھڑا نہیں لگتا۔ لوگوں کا قلم زبان کی طرح چلتا ہے' اس کی زبان قلم کی طرح چلتی ہے یعنی فل سٹاپ اور کومے لگاتی ہوئی۔ جس رفتار سے سوچتا ہے اس سے آدھی سے بولتا ہے۔ جیسے کشور ناہید جس رفتار سے بولتی ہے اس سے آدھی سے سوچتی ہے۔ کھانے کا اس قدر شوق ہے کہ دوران گفتگو لفظ کھا جاتا ہے۔ کالم نگاری بولے تو الم نگاری سنائی دے یہی نہیں "لیٹ آئیں گے" کہے تو لگتا ہے "لٹائیں گے" کہا ہے۔

پہلے "دید شنید" کے نام سے کالم لکھتا تھا۔ پر اس سے توبہ کر لی شاید رفیق ڈوگر کا دید شنید پڑھ لیا ہو گا۔ تب سے اپنا "گریبان" تھامے ہوئے ہے۔ اس کے عنوان کالم پر یوں کسے ہوتے ہیں جیسے زنانہ بدن پر لباس۔ مرنے والے کے بارے میں کالم لکھ کر یہ عالم ہو گیا ہے کہ اب کسی زندہ کے بارے میں کالم لکھ دے تو تعزیتی جلسے والی انجمنیں اس شخص کو امید سے دیکھنے لگتی ہیں۔ انتظار حسین کہتا ہے "منو بھائی کا کالم پڑھ کر بے اختیار مرنے کو دل چاہتا ہے۔" یہ ہے بھی ٹھیک' کئی لوگ اس کے کے کالم پر مرتے بھی ہیں۔ بقول جاوید شاہین کسی دوست کی موت پر لکھتا ہے تو لگتا ہے منو بھائی وفات پا گیا ہے۔ اس کے قاری اسی اخبار کو خریدتے ہیں جس میں اس کا کالم ہوتا ہے یوں انہیں ہر ہفتے اخبار بدلنا پڑتا ہے۔ دوسروں کے دکھ میں خود کو اس

قدر انوالو کر لیتا ہے کہ عزت کسی لڑکی کی لٹتی ہے شرم کے مارے گھر سے یہ نہیں نکلتا۔ یہی نہیں شادی کسی دوست کی ہوتی ہے لوگ مبارکباد اسے دے رہے ہوتے ہیں۔

اس کی پہلی سیریز "جزیرہ" اور "جھوک سیال" اتنی پاپولر ہوئیں کہ ان کی وجہ سے کئی ٹی وی سیٹ بکے۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے' اس کی حالیہ سیریز "خاموش" اور "جھیل" کی وجہ سے بھی کئی ٹی وی سیٹ بکے' میں نے خود اپنا ٹی وی بیچا۔

شخصیت ایسی کہ جو اس سے نہیں ملا وہ بھی یہ سمجھتا ہے کہ وہ اسے ملا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ بھی اس کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہے جتنا اس کو ملنے والے۔ اگر آپ اس کے گھر بغیر بتلائے چلے جائیں تو آپ کو دیکھ کر اس قدر حیران اور شرمندہ ہو گا جیسے وہ آپ کے گھر بغیر بتلائے آیا ہو۔ دیکھنے میں لگتا ہے بزرگ لڑکوں میں بیٹھا ہے۔

سننے میں لگتا ہے لڑکا بزرگوں میں بیٹھا ہے۔ آپ ادیبوں شاعروں کے پاس پانچ منٹ بیٹھ جائیں (اگر بیٹھ سکتے ہیں ....) تو ان کی عمر کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھ جاؤ تو اپنی عمر کا پتہ نہیں چلتا۔ کبھی آپ پورا ہفتہ اسے ملیں گے اور وہ ایک بات نہ کرے گا اور کبھی ایک بات کرے گا اور آپ اسے پورا ہفتے نہیں ملیں گے۔

دودھ پیتے بچوں کی طرح رات کو جلد نہیں سوتا بلکہ رات کو اس وقت سوتا ہے جب دوسروں کے اٹھنے کا وقت ہوتا ہے۔ حافظہ ایسا کہ اسے ہمیشہ یاد ہوتا ہے کہ کیا بھولنا ہے؟ دوستوں کی بات پر اس قدر یقین رکھتا ہے کہ اگر کوئی کہے منو بھائی تمہارے پیٹ میں درد ہے تو وہ پیٹ کی بجائے ڈاکٹر کو دیکھے گا۔ تصویر یوں کھنچواتا ہے جیسے مغل شہنشاہ کھنچواتے تھے۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ میں گلاب کی جگہ سگریٹ پکڑے ہوتا ہے۔

منیر احمد قریشی نے سب سے پہلے مشاعرے میں جو شعر پڑھے وہ اس کے اپنے نہیں تھے' شفقت تنویر مرزا کے تھے۔ اب بھی جو پڑھتا ہے اس کے اپنے نہیں ہوتے منو بھائی کے ہوتے ہیں۔ مشاعروں میں ہر بار پہلے والی نظم سناتا ہے اکثر سننے والے بھی پہلے ہی ہوتے ہیں لیکن اسکے باوجود وہ ان کے لئے نئی ہوتی ہے۔ دوستوں کے معاملات میں مع

آلات آ جاتا ہے۔ مشورہ مانگو تو فوراً مشورہ دے دیتا ہے' کچھ اور مانگو تو پھر بھی مشورہ ہی دیتا ہے۔ یاور حیات کہتا ہے "منو بھائی وہ تالہ ہے جسے سب چابیاں لگ جاتی ہیں مگر صرف تالہ ہی کھلتا ہے۔ آج کل "گریبان" میں اس کی تصویر کے ساتھ کوے کی تصویر بھی ہوتی ہے۔ بقول یوسف کامران "منو بھائی نقلی چوکیدار بھی ہے اور کوا بھی۔" چاہے بارہ برس بعد بولے پھر بھی کاں ہی کہے گا لیکن شریف کنجاہی نے کہا ہے "اس کے لب کی بات سب کی بات ہے۔" وہ کچھ تبدیل نہیں کر سکتا پرنسٹن کے سگریٹ پیتا ہے اور دھواں بھی پرنسٹن کا ہی چھوڑتا ہے۔

مخالف کی بات مان لیتا ہے بشرطیکہ وہ صنف مخالف ہو جتنے اعتماد سے وہ بات دوسروں کی بیویوں کو کہہ دیتا ہے اتنے اعتماد سے تو بندہ اپنی بیوی سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس کا نام ایسا ہے کہ اپنی بیوی بھی لے لے تو بیوی نہ رہے اور کوئی غیر لے لے تو غیر نہ رہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں چہرے پر آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ پوچھو تم دوسری عورتوں کو کس نظر سے دیکھتے ہو کہے گا اپنی نظر سے دیکھتا ہوں۔ روحی بانو کو دنیا کی خوبصورت عورت سمجھتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلے نہ چلے کہ وہ خوبصورتی کو کیا سمجھتا ہے' یہ پتہ چل جاتا ہے کہ وہ دنیا کو کیا سمجھتا ہے۔ اس کی پسندیدہ اداکارہ ٹرین ہے جو اس کے ہر ڈرامے کی ہیروئین ہوتی ہے۔ سب اسے مانتے ہیں اگر کوئی عورت کہے کہ میں منو بھائی کو نہیں مانتی تو یاد رہے اس کا اشارہ منو کی طرف نہیں بھائی کی طرف ہو گا۔ اسے ہیر اچھی لگتی ہے مگر اسے ہیر سننے کا کہو تو کہے گا ہیر کا تعلق سننے سے نہیں دیکھنے سے ہے لیکن وہ ہیر کو دیکھ کر رانجھا نہیں بنتا وارث شاہ بن جاتا ہے۔

○○○

• شو بوائے

اس کا دل سیاح کا' دماغ صحافی کا' بولنے میں شاعر اور سننے میں شوہر ہے۔ آواز میں تعلقات کی کھنک' چال میں شہرت کا خمار اور چال چلن میں ویسا ہی جیسا ایک مرد کا' یہ سب ملنے کے بعد ہوتا ہے۔

زمانہ طالب علمی میں ہی اس میں صحافی بننے کی صلاحیتیں اجاگر ہونے لگیں یعنی کھانے کی تقریبات میں ایسا لباس پہن کر جاتا جس کی جیبیں بڑی بڑی ہوتیں۔

مقامی کالج میں اقبالیات پڑھاتا ہے اس کے لیکچر سن کر پتا چلتا ہے کہ علامہ اقبال اپنی تصویروں میں اس قدر پریشان نظر کیوں آتے ہیں۔ آج کل سو فیصد شاعر ننانوے فیصد احمق ہوتا ہے اور یہ ننانوے فیصد عقلمند ہے وہ اصلی شاعر ہے کیونکہ آدمی کی اصل کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ وہ کس بات پر خوش ہوتا ہے اور حسن رضوی صرف مشاعرے کے ذکر پر خوش ہوتا ہے۔ مشاعرہ وہ جنگ ہوتی ہے جس میں لوگ منہ سے گولیاں چلاتے ہیں اور حاضرین کی واہ وا سے چلانے والے کے نشانے کا پتا چلتا ہے اسے روز یہ جنگ اور روزنامہ "جنگ" پسند نہیں۔ ہمارے ہاں شاعری اچھی ہو تو آدمی اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ شاعری اچھی نہ ہو تو لوگ اسے بھول جاتا ہے۔ شاعری اچھی نہ ہو تو لوگ اسے بھول جاتے ہیں مگر وہ خود کو بھولا ہے نہ لوگ اسے بھولے ہیں۔

اس نے اپنی سب سے پہلی نظم ایک مشاعرے میں پڑھی اور سارے سامعین کو ہوٹ کر دیا۔ ایک نظم اپنی تھی۔ دوسرا ترنم بھی اپنا۔ سارا مشاعرہ لوٹ لیا یہاں تک کہ دوسرے شاعروں کے لیے سامعین کے پاس ایک بھی ٹماٹر نہ بچا۔

اس نے ہر شہر میں بچپن گزارا۔ آج کل لاہور میں گزار رہا ہے۔ البتہ جوانی کسی شہر میں نہیں لہر میں گزاری۔ دو تین لڑکیوں سے منگنیاں کیں مگر توڑ دیں شاید وہ شادی پر بضد ہوں گی۔ ہر کام میں منصوبہ بندی کا قائل ہے۔ اس نے شادی سے پہلے ہی

منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔

ولدار بھٹی کے ساتھ مختلف کالجوں میں تقریری مقابلوں کے لیے جاتا اور ولدار اول اور یہ ہمیشہ دو نمبر رہا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ولدار بھٹی اس سے اچھا مقرر تھا اور دوسری وجہ یہ کہ صرف دو ہی مقرر مقابلے کے لیے جاتے۔ کالج میں اس کی ٹولی اجمل نیازی اور انوار اللہ قاضی پر مشتمل تھی۔ جس سے پورا اورینٹل کالج گھبراتا۔ لڑکے ان کے پاس سے ہمیشہ ڈرتے گزرتے کہ کہیں یہ ادھار نہ مانگ لیں۔ شہر میں جہاں شادی ہوتی یہ وہیں ہوتے لڑکے والے سمجھتے یہ لڑکے کے دوست ہیں اور لڑکے والے سمجھتے لڑکی کے یہی نہیں بعد میں تو بات یہاں تک آ پہنچی تھی کہ بھانڈ اور میراثی اس سے آ کر پوچھتے کہ شاہ جی آج کہاں کہاں شادی ہے؟

شروع ہی سے جانتا تھا کہ مسجد جا کر آدمی پاک صاف ہو جاتا ہے اسی لیے اس مقصد کے حصول کے لیے باقاعدگی سے مسجد جایا کرتا تھا۔ اب نہیں جاتا جس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اب تو ماشاء اللہ گھر میں دو دو غسل خانے ہیں۔

بنیادی طور پر استاد ہے' ریڈیو پر خبریں پڑھنا شروع کیں تو یوں لگتا ہے جیسے املا لکھوا رہا ہو۔ پہلے دن کی خبریں تھیں۔ دریائے راوی میں ایک گاڑی گر کر تباہ' پاک بھارت سرحدی جھڑپوں میں دو فوجی زخمی۔ اس نے یہ سب یوں پڑھا۔ دریائے توی میں ایک گاؤں گر کر تباہ' پاک بھارت سرحدی جھاڑیوں میں دو فوجی زخمی۔

اس نے ایک فلم میں بھی کام کیا۔ بہت اہم رول تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہیرو ہیروئین کو زندہ نہ بچا سکتا۔ وہ اس طرح کہ جس کار میں وہ ہیروئین کو بچانے جا رہا تھا اس لیے اس کار میں پٹرول ڈالا تھا۔

کہتے ہیں دونوں قسم کی استریاں اس وقت تک کام کی ہوتی ہیں جب تک گرم ہو سکیں۔

اس کا اجلا اجلا پریس شدہ لباس ایسا ہوتا ہے کہ بے اختیار دونوں استریوں کو داد دینا پڑتی ہے۔ ویسے میاں بیوی ایک ہی صورت میں خوش رہ سکتے ہیں کہ وہ سمجھیں ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔ یہ بھی بھابی کا اتنا خیال رکھتا ہے کہ لگتا ہے وہ اس کی ہونے والی

بیوی ہے۔ گھر میں اس کی وہ تحریریں بہت پسند کی جاتی ہیں جو یہ چیک بک پر لکھتا ہے۔ عورتوں سے زیادہ سے زیادہ یوں ملتا ہے جیسے عرب رخصت ہوتے ہیں۔

لڑائی میں ہمیشہ حق پر ہوتا ہے کیونکہ لڑنے والا ہمیشہ حق پر ہوتا ہے۔ حق ناحق پر تو لڑانے والے ہوتے ہیں وہ اچھا دشمن نہیں اس لیے دشمن دار لوگ اسے دشمن بنانے کی بجائے دوست بنا کر ہی کام چلاتے ہیں۔ دشمن سے ایسی دشمنی رکھتا ہے کہ کسی وقت بھی دوستی ہو سکے۔ دوست سے بھی ایسی ہی دوستی رکھتا ہے۔ جب آپ کو کوئی اچھا دوست نہ ملے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ اچھے دوست نہیں اور حسن کو بڑے اچھے دوست ملے۔ عقلمند وہ ہے جو اپنے دوستوں سے ڈرتا ہے اور بیوقوف جس سے اس کے دوست ڈرتے ہیں۔ حسن رضوی دوستوں سے ڈرتا ہے یہ بات مجھے اس کے ایک دوست نے ڈرتے ڈرتے بتائی۔

اس نے دولت سے صلاحیتیں پیدا نہیں کیں بلکہ صلاحیتوں سے دولت پیدا کی' دیر تک بلکہ دور تک سوچتا ہے۔ سچ بولنا اتنا مشکل نہیں جتنا سچ سننا اور وہ سچ سن لیتا ہے۔ اپنی ہر بات منوا لیتا ہے اس کی تنخواہ روک دو تو وہ اسے بحال کرانے جائے تو جب واپس آئے گا اس میں ہزار روپے کا اضافہ کروا کے آئے گا۔ بہت اچھا افسر ہے کبھی اس کے ماتحت کو اس سے ڈرتے اور گھبراتے نہیں دیکھا۔ صرف وہ گھبرائے ہوتے ہیں جن کا یہ ماتحت ہوتا ہے۔

کہتے ہیں مرد وہی ہے جو مصیبت میں نہ گھبرائے اگرچہ یہ خود کو مرد ثابت کرنے کا بڑا ان سائنٹیفک طریقہ ہے تاہم اس نے پوری جوانی خود کو مرد ثابت کرنے میں ہی گزاری۔ وہ ایک ڈرا ہوا آدمی ہے۔ نڈر خود کو نقصان پہنچاتا ہے اور ڈرا ہوا دوسروں کو۔ مگر اس نے جب بھی کسی پر وار کیا خود کو بچانے کے لیے کیا۔

گروپ فوٹو میں اکثر درمیان میں یوں کھڑا ہوتا ہے جیسے دوسرے اس سے پناہ مانگ رہے ہیں۔ معزز آدمی ہے اس کی خواہش ہوتی ہے ان کے پاس بیٹھے جو معزز ہوں' بلکہ جن کے پاس بیٹھ جائے وہ بھی یہی خواہش کرنے لگتے ہیں۔

اگرچہ اس نے تھوڑے ہی وقت میں بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔ مگر اس کی کارکردگی سے مکمل طور پر نہ وہ خود مطمئن ہے اور نہ شیطان۔

○○○

• پنجاب کا ہیرو

پنجاب' دریا راوی' دریا چناب' دریا ستلج' دریا سندھ اور دریا دلی کی سرزمین ہے۔ یہاں جو آدمی کسی عورت کو شادی سے پہلے بھگا لے اسے مرزا اور جو شادی کے بعد بھگائے اسے رانجھا کہتے ہیں۔ جو یہ کام قصے کہانیوں میں کرے اسے ہیرو اور جو حقیقی زندگی میں کرے' ولن کہلاتا ہے۔ پنجابی کی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس کے پاس جتنے اچھے عاشق ہیں سب مردہ ہیں ہیر رانجھا بھی ان میں سے ہیں۔ کیدو ان کی کہانی کا مرکزی کردار ہے اسے کیدو اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی زندگی کا اصول تھا۔ جو دیکھو سب کو کہہ دو۔

جس نے کسی سے محبت نہیں کی اس کے جاندار ہونے پر شبہ کیا جا سکتا ہے اور جس نے نفرت نہیں کی اس کے انسان ہونے پر کہ نفرت محبت کا سب سے طاقتور روپ ہے۔ پنجاب کی لوک داستانیں پڑھ کر لگتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کی جوانی کا آغاز محبت سے اور اختتام بھی محبت سے ہوتا ہے اور نئی نسل کو اس سے بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے نصاب میں شامل کر دیا جائے۔ بڑھاپے میں آدمی کو اپنا سب کیا کرایا حماقت لگتا ہے اور محبت وہ حماقت ہے جس نے نہیں کی اس سے بڑا احمق روئے زمین پر نہیں۔ یوں ہیر رانجھا احمق نہیں تھے مگر ان کی محبت کو بچانے کے لیے ان سے زیادہ کیدو کی عقل کام آئی۔ وہ چاہتا تھا کہ دونوں ہمیشہ محبت کرتے رہیں اس لیے ان کی شادی نہ ہونے دی۔

کیدو کا چہرہ ایسا خبرناک تھا کہ دیکھتے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ گاؤں میں کیا کیا ہوا ہے؟ اگر یہ نہ بھی پتا چلتا تو یہ ضرور پتا چل جاتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ ساری رات اس لیے جاگتا رہتا کہ کہیں کوئی جاگ تو نہیں رہا اس عمر کا تھا جس عمر کا کوئی شخص جنت میں نہ ہو گا لیکن میرا دوست "ف" کہتا ہے' کیدو بوڑھا نہیں تھا کیونکہ

پنجابی کبھی بوڑھا نہیں ہوتا اور جو بوڑھا ہوتا ہے وہ پنجابی نہیں ہوتا۔ اس قدر نرم دل کہ اس نے کبھی کسی پر ہاتھ نہ اٹھایا۔ زیادہ سے زیادہ انگلی اٹھائی۔ کسی خاتون کو اس وقت تک نہ دیکھتا جب تک اسے اس پر شک نہ ہوتا یوں اس کی نظر صحافی کی دماغ فوجی کا اور دل پلسنیے کا تھا جب کہ حوصلہ اور جسم اس کا اپنا ہی تھا۔ چال شطرنج کے گھوڑے کی طرح اور چال چلن اس کے بادشاہ جیسا۔

جا رہا ہوتا تو لگتا آ رہا ہے اور آ رہا ہوتا تو لگتا ایک شریف آدمی جا رہا ہے۔ صورت ایسی جس نے اسے دیکھا سمجھو اس نے کچھ نہیں دیکھا سیرت ایسی کہ جس کو اس نے دیکھا سمجھو اسے پنجاب نے دیکھ لیا۔ وہ فرشتہ تھا اس کے کام بھی فرشتوں والے تھے یعنی دوسروں کے گناہوں اور برائیوں کا حساب رکھتا۔ وارث شاہ اسے شیطان کہتا ہے' لیکن شیطان بھی تو فرشتہ تھا۔

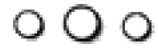
عشق اور لڑائی میں یہ فرق ہے کہ عشق وہ لڑائی ہے جو انسان کے اندر ہوتی ہے۔ ان دونوں لڑائیوں میں سب جائز ہے یوں ہیر اور ہٹلر سب نے جائز کام ہی کیے۔ کہتے ہیں کیدو چوری چوری ہیر رانجھے کو دیکھنے آتا حالانکہ چوری چوری تو ہیر رانجھا ایک دوسرے کو دیکھنے آتے۔ وہ تو سر عام آتا بلکہ ایسے ہی جیسے مغل بادشاہ آتے تھے کہ ان کا چوب دار لاٹھی بجاتا آگے آگے چلتا اور وہ پیچھے پیچھے آتے بس فرق یہ تھا کہ یہ اپنی آمد پر لاٹھی بھی خود ہی بجاتا تھا۔

کیدو نے خدا سے عزت' چوچک نے دولت اور رانجھے نے ہیر مانگی۔ ظاہر ہے آدمی وہی کچھ مانگتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتا۔ حضرت آدم اور حضرت حوا کی محبت نے انہیں جنت سے نکلوایا۔ جب وہ دنیا میں آئے تو ایسے ہی تھے جیسے نئے پیدا ہونے والے بچے ہوتے ہیں یعنی پیدائشی سوٹ میں' آج بھی جب عاشق معشوق ملتے ہیں تو وہ ان معصوم بچوں کی طرح ہونا چاہتے ہیں لیکن رانجھے نے محبت کو محبت نہیں عبادت سمجھا اور عبادت کے لیے ستر ڈھانپنا ضروری ہے۔ جس کو کبھی ایذا نہ پہنچے وہ سمجھ لے کہ

اس میں کوئی خوبی نہیں اور کیدو کو شروع ہی میں ہیر اور اس کی سہیلیوں نے اس کی خوبیاں سے آگاہ کر دیا تھا۔

آج کل کوئی عقلمند رانجھا بننے کی کوشش نہیں کرتا اور کوئی بیوقوف کیدو بننے کی خواہش نہیں کرتا اس کی شخصیت میں خامیاں ڈھونڈنے والے اپنی خامیاں بھی اس میں شامل کر دیتے ہیں خوبیاں ڈھونڈنے والے بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ عقلمند اپنی وجہ سے دوسروں کو قابل رحم بناتا ہے اور بیوقوف اپنی وجہ سے خود کو ایسا بنا دیتا ہے۔ اور وہ سب سے بیوقوف عقلمند تھا جیسے جو کبھی جاہل نہیں رہا وہ عالم نہیں ہو سکتا ایسے ہی جو رانجھا نہیں رہا وہ کیدو نہیں ہو سکتا بلکہ کیدو وہ بوڑھا رانجھا ہوتا ہے جس کے اپنے گھر لڑکی اتنی عمر کی ہو جائے کہ بندہ اسے دیکھ کر جوان ہو سکے۔ کیدو مرض عشق کی دوا تھا مگر ایسی دوا جس کی ڈیٹ Expire ہو چکی ہے۔

میرا دوست "ف" کہتا ہے جیسے دیکھنے میں درد سر پنجابی فلم جیسا ہوتا ہے ایسے ہی اگر آپ جاننا چاہیں کہ دیکھنے میں غیرت کیسی ہوتی ہے تو کیدو دیکھ لیں وہ ٹھیک کہتا ہے کیدو غیرت تو ہے مگر ہے لنگڑی۔



• سٹیل مین

وہ سیاست کے "میاں" ہیں اور اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں۔ اس سے انہوں نے اپنا "لوہا" منوایا ہے۔ وہ پاکستان کے واحد سیاست دان ہیں جن کا نام جو بھی لیتا ہے' انہیں شریف ضرور کہتا ہے۔ مہاتما گاندھی جب تک بولنے نہ لگتے' سیاست دان نہ لگتے۔ یہ بھی جب بولنے نہ لگیں "شریف" کے بیٹے لگتے ہیں' سیاست دان نہیں لگتے۔ چپ ہوں تو لوگوں کو شبہ ہوتا کہ انہیں سیاست کا کچھ پتہ نہیں۔ بولیں تو یہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔ شکل و صورت ایسی کہ جب وہ کچھ بھی نہیں تھے' تب بھی کچھ تھے۔ کالج کے زمانے میں پروفیسر مشکور حسین یاد انہیں کلاس میں کھڑا کر کے کہتے۔ "مسٹر تم ہنس کیوں رہے ہو؟" تو یہ جواب دیتے۔ "سر' میں ہنس تو نہیں رہا۔ میری شکل ہی ایسی ہے۔" اپنے پہلے ہی الیکشن میں اخباروں اور اشتہاروں میں ایسی رنگین تصویریں چھپوائیں کہ انہیں حکومت نہ ملتی تو فلمیں ضرور مل جاتیں۔ اتنے اچھے ماحول میں پرورش پائی کہ ان کے بڑے ہو کر سیاست دان بننے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس گھرانے میں تو پارٹی سے مراد بھی کھانے کی پارٹی لیا جاتا۔ وہ صنعت سے سیاست میں آئے اور سیاست صنعت میں آ گئی۔ ایسی صنعت جس میں لاکھ لگاؤ اور ساکھ کماؤ' ساکھ لگاؤ اور لاکھ بناؤ۔ سیاست کے لیے دولت ماں کا دودھ ہے۔ سمرسٹ ماہم نے کہا۔ "دولت چھٹی حس ہے' لیکن اس کے بغیر آپ دوسری پانچ حسوں کو بھی استعمال نہیں کر سکتے۔" میاں صاحب بڑے سے بڑا کیس بھی "بریف کیس" بنا دیتے ہیں۔ بقول ایماڈنکن "نواز شریف تحریک استقلال میں بینک کی حیثیت رکھتے' ضیاء الحق نے اسے قومیا دیا۔" پہلے "فدا مسلم لیگ" پر فدا رہے' پھر مسلم لیگ ان پر فدا ہو گئی۔ بقول پیر پگاڑا "ضیاء الحق نے مارشل لاء دور میں جو وزیراعلیٰ تخلیق کیے' یہ ان میں سے ایک ہیں۔"

پنجاب میں کبھی ٹوانہ خاندان سیاست میں اہم تھا' پھر ایسے جاگیردار روپے میں "ٹو" آنہ

ہی رہ گئے۔ میاں صاحب صنعت کار ہیں۔ یوں صنعت اور کار پر روانی سے بولتے ہیں۔ بقول ٹائم "وہ خارجہ پالیسی کی بجائے مرسیڈیز کاروں پر زیادہ روانی سے گفتگو کرتے ہیں۔"

خدا نے انہیں بہت کچھ دیا' اور یہ بتانے کے لیے خدا نے انہیں کیا کیا دیا ہے' خدا نے انہیں بہت کچھ دیا ہے' مشیر دیئے۔ یہ سب "اتفاق" کی برکت ہے۔ بھٹو مرحوم نے تو "اتفاق" کو ختم کرنا چاہا اور وہ ملک سے اتفاق ختم کرنے میں کامیاب بھی ہوئے مگر اتفاق سے ضیاء الحق آ گئے۔ تب سے ملک میں ہر طرف "اتفاق" ہی نظر آتا ہے۔ پنجاب کی دوستی' سندھ کی سادگی' سرحد کی دشمنی اور بلوچستانی کی ویرانی مشہور ہے۔ لیکن اگر کوئی سیاست دان کی دوستی کی تعریف کر رہا ہو تو یقین کر لیں کہ وہ میاں صاحب کی تعریف کر رہا ہو گا۔ دوستوں کے ساتھ ملتے ہوئے دوست' تاجروں سے ملتے ہوئے تاجر' بچوں سے ملتے ہوئے بچہ اور حکمرانوں سے ملتے ہوئے حکمران ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہاں تو سکندر مرزا جیسے حکمران بھی گزرے ہیں جو بیوی سے ملتے ہوئے بیوی ہوتے۔

وہ بات کھلے دل' منہ اور جیب سے سنتے ہیں۔ پہلے تقریر یاد کر رہے ہوتے تو لگتا' ان کا امتحان ہے۔ مگر جب وہ تقریر کرتے تو لگتا' امتحان سننے والے کا ہے۔ لکھی تقریر یوں کرتے جیسے فی البدیہہ کر رہے ہیں' یعنی بے ربط۔ اب وہ تقریر یاد کر کے نہیں کرتے' تقریر وہ کرتے ہیں' یاد لوگ کرتے ہیں۔ ان کی انگریزی سمجھنے کے لیے بندے کے لیے اردو جاننا ضروری ہے۔ کہتے ہیں گورنر میاں اظہر صاحب بی اے ہیں' مگر لگتے نہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں بھی رہے۔ جی ہاں' چند گھنٹے وہاں رہے۔ وہ پاکستان کے سب سے مہنگے لیڈر ہیں۔ جلسوں میں اتنا خرچہ آتا ہے کہ ایک ایک لفظ کئی کئی لاکھ کا پڑتا ہے۔ ہمارے بوڑھے سیاست دان تو جوڑ توڑ اور جوڑ درد میں مبتلا رہے ہیں' لیکن میاں صاحب نوجوانی میں مبتلا ہیں۔ بندہ ان کے پاس جس مسئلے کے ساتھ جائے' جب واپس آتا ہے تو وہ مسئلہ نہیں ہوتا۔ اگر مسئلہ وہی ہو تو بندہ وہ نہیں ہوتا۔ وہ مخالفوں کی ہر بات کا جواب ترکی بہ ترکی ہی نہیں دیتے' ترقی بہ ترقی بھی دیتے ہیں۔

رنجیت سنگھ کے بعد پنجاب پر سب سے زیادہ حکومت کرنے والے حکمران ہیں۔ کہتے ہیں' سکھ خاندان ابھی تک اس لیے نہیں بنا سکتے کہ ان کے لیڈر بڑے سکھ ہیں' لیکن میاں صاحب "ان سکھ" سیاست دان ہیں۔ رنجیت سنگھ تو ہر کسی کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتے' یہ تو ہر کسی کے لیے الگ آنکھ رکھتے ہیں۔ اپنی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتے' شاید اسی لیے متاثر کرتے ہیں۔ اپنے دہن اور دھن کے پکے ہیں۔

وزیراعلیٰ پنجاب تھے تو لوگ انہیں لاٹ صاحب نہ کہتے' الاٹ صاحب کہتے۔ وزیراعلیٰ تھے تو پلاٹ یوں دیتے جیسے وزیراعظم بن کر پیلی ٹیکسیاں دیں۔ دوستوں کو دیکھ کر بے اختیار ان کی طرف نہیں لپکتے' بااختیار لپکتے ہیں۔

ہر وہ کام کرتے ہیں جس میں فائدہ ہو۔ وہ تو ہر کسی سے مسکرا کر بھی شاید اس لیے ملتے ہیں کہ انہیں پتہ ہو گا' مسکرانے پر پندرہ مسلز کو کام کرنا پڑتا ہے' جبکہ تیوریاں چڑھانے میں ۶۵ مسلز لگتے ہیں۔ والد صاحب انہیں سخت سزا دینے چاہتے تو کتاب دیتے۔ ان کی پسندیدہ بک چیک بک ہے۔ غلطی کرنا انسان کا کام ہے اور اسے دوسروں کے کھاتے میں ڈالنا سیاست دان کا۔ صفائی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ جس کام کے پیچھے پڑتے' ہاتھ دھو کر پڑتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں' ان کے بارے میں بری رائے رکھیں تو انہیں کبھی نہ ملیں اور اگر آپ چاہتے ہیں' ہمارے بارے میں اچھی رائے رکھیں تو ہمیں کبھی نہ ملیں۔

کرکٹ پسند ہے۔ ہمیں یہ اس لیے پسند ہے کہ اس میں کئی "اوور" ہوتے ہیں۔ کرکٹ میں کوئی "نو بال" کہہ دے تو برا مان جاتے ہیں کہ کھیل میں ذاتیات پر نہیں اترنا چاہیے۔ بچپن میں کرکٹ کھیلتے' محلے کی ٹیمیں ٹاس کرتیں۔ جو جیت جاتی' یہ اس کی طرف سے کھیلتے۔ حالانکہ ہمارے بچپن میں دونوں ٹیمیں ٹاس کرتیں' جو ہار جاتی اسے ہمیں اپنی ٹیم میں شامل کرنا پڑتا۔ عوامی سوٹ انہیں سوٹ کرتا ہے۔ دن میں کئی بار

لباس بدلنے کی عادت ہے۔ یہ تب سے ہے جب ابھی وہ چند ماہ کے تھے۔
وہ پیاس سے مرے جا رہے ہوں' تب بھی ان کے ہونٹ سوکھے نظر نہیں آئیں گے۔

اور اگر ان کے ہونٹ خشک ہیں تو وہ پیاسے نہیں ہیں۔ خوبصورتی میں وہاں تک چلے جاتے ہیں' جہاں تک خوبصورتی جاتی ہے۔ برے کو ہی اس کے گھر تک چھوڑ کر نہیں آتے' اچھے کو بھی اس کے گھر تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ سیاست میں صحت مندانہ رجحان لانے کے لیے صحت کو بہتر بنانے کا رجحان ہے۔ اگرچہ وہ تو اپنے سسرال میں قدم رکھیں تو دوسرا قدم اکھاڑے میں پڑتا ہے۔ ویسے کشتی اور سیاست میں یہی فرق ہے کہ کشتی لڑنے والا اپنے کپڑے خود اتارتا ہے۔ نوجوانی میں وہ دوستوں سے یوں گھل مل جاتے' لگتا مل نہیں رہے گھل رہے ہیں۔

اقتدار نے انہیں پروان چڑھایا۔ اب وہ اقتدار کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ ایسی شخصیت ہیں کہ جس کاندھے پر ہاتھ رکھ دیں' وہ ان کو کاندھا دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بڑے حتمی اور حاتمی فیصلے کرتے ہیں۔ ان کو ساتھ ملا کر حکومت کی' جو مل کر گھوڑا بناتے' تو جو بنتا وہ اونٹ ہوتا۔ انہیں گالی دی جائے تو وہ لوٹاتے نہیں۔ جس کی وجہ پیپلز پارٹی یہ بتاتی ہے کہ بزنس مین ہیں' جو ملے گا واپس نہیں کریں گے۔ مصطفیٰ کھر کے بارے میں پوچھا جائے کہ وہ آج کل پی پی پی میں ہیں یا این پی پی میں؟ تو اکثر جواب ملتا ہے' آج کل بیڈ روم میں ہیں۔ جبکہ میاں صاحب بیڈ روم میں بھی ہوں تو جواب ملتا ہے مسلم لیگ میں ہیں۔

انہوں نے کئی بندوں کو سیاست دان بنایا اور کئی سیاست دانوں کو بندہ بنایا۔ ویسے بھی اقتدار کی کرسی پر چڑھنے کے لیے اپنے سے اوپر والے کے پاؤں کو سر سے اور نیچے والے کے سر کو پاؤں سے ٹھوکر مارنا پڑتی ہے۔ بہرحال میاں صاحب وہ خاص آدمی ہیں' جو کبھی کبھی عام آدمی بن کر وہی محسوس کرتے ہیں جو عام آدمی کبھی کبھی خاص بن کر محسوس کرتا ہے۔

• مسز مسلم لیگ

ہم نے ایک دوست سے پوچھا۔ "جس شخص سے کہا جائے کہ آپ فوراً کچھ کر لیں، آپ کا تختہ الٹا جا رہا ہے اور وہ آگے سے کہے، اچھا سائیں! دیکھا جائے گا۔ آپ ایسے شخص کو کیا کہیں گے؟" تو دوست بولا۔ "میں اسے محمد خان جونیجو کہوں گا۔"

جونیجو صاحب ہمارے ملک کے دوسرے بڑے سیاستدان تھے۔ آپ پوچھیں گے۔ پہلے بڑے سیاست دان کون تھے؟ تو اس کا جواب ہے۔ "باقی سب" جونیجو صاحب کو پہچاننا بڑا آسان ہوتا۔ اگر دو سیاست دان گفتگو کر رہے ہوتے اور ان میں سے ایک بور ہو رہا ہوتا، تو دوسرا محمد خان جونیجو ہوتا۔ وضع قطع ایسی جو اتنی وضع نہ ہوتی جتنی قطع ہوتی۔ دیکھنے میں سیاست سے زیادہ ان کا تعلق محکمہ زکوٰۃ سے لگتا۔ انہوں نے سیاست سے پاک سیاست کی۔ سیاسی قد ایسا کہ انہیں دیکھنے والی کی پگڑی گر پڑتی، مگر یہ پگڑی اکثر آگے کو ہی گرتی۔ وہ سیاست میں شرافت کا نمونہ تھے۔ سیاست میں ایسے نمونے کہاں ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا، آپ کمزور سیاست دان ہیں تو انہوں نے کمزوری دور کرنے کے لیے دودھ گھی شروع کر دیا۔ بچپن ہی سے صحت ایسی تھی کہ پہلی بار جب ڈاکٹر دیکھا تو بمشکل دیکھا کیونکہ زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے نظر کمزور ہو چکی تھی۔

وہ بچپن میں اتنے تیز تھے کہ سکول سے ایک بجے چھٹی ہوتی تو پونے ایک گھر پہنچ جاتے مگر بڑے ہو کر بڑے سست ہو گئے۔ اتنا لیٹ آنے لگے کہ انہیں ریلوے کا وزیر بنا دیا گیا۔ پیر پگاڑا تو انہیں ریلوے بابو کہتے۔ ضیاء الحق نے انہیں وزیراعظم ککی نوکری دی تو وہاں بھی ان کی پوزیشن ہمیشہ انجن کی بجائے ڈبے کی ہی رہی اور آپ جانتے ہیں، جب ڈبے کو انجن کے آگے لگایا جائے تو پھر انجن اسے دھکیلتا ہے، کھینچتا نہیں۔

وہ وزیراعظم تھے تو نئے آنے والے سے ان کا یہ کہہ کر تعارف کرایا جاتا کہ یہ

وزیراعظم صاحب ہیں۔ ان کے وزیراعظم بننے پر پاکستان کا ہر فرد خوش ہوا کہ اگر یہ بن سکتے ہیں تو میں بھی بن سکتا ہوں۔ ہمارے ایک محلے دار نے تو اس ڈر سے سیاست چھوڑ دی کہ اس حساب سے اگلی باری میری ہے۔ اور اگر میں وزیراعظم بن گیا تو اتنا مشہور ہو جاؤں گا کہ صبح دہی لینے نکلوں گا تو شام کو کہیں گھر واپس آ سکوں گا' کیونکہ راستے میں ہر کوئی اپنا مسئلہ لیے بیٹھا ہو گا۔

ہمارے بیشتر سیاست دانوں نے وزیراعظم بننے کی کوشش کی اور ناکام رہے۔ انہوں نے وزیراعظم ہوتے ہوئے وزیراعظم بننے کی کوشش کی اور ناکامیاب رہے۔ ضیاء الحق نے جب انہیں وزیراعظم بنایا تو یہ یوں خوش تھے جیسے سیور ریفل ٹکٹ پر ان کا وزیراعظم کا انعام نکلا ہو۔ پیر پگاڑا صاحب کہتے ہیں۔ "ہم (سندھ) نے پاکستان کو دو وزیراعظم دیئے' ان کی لاشیں ملیں' ہم نے ایک لاش دی تو اسے وزیراعظم بنا دیا۔"

سندھڑی آم کی طرح میٹھی شخصیت محمد خان جونیجو نے ۱۹۳۲ء میں پہلی بار "سندھڑی" میں آنکھ کھولی۔ دوسری بار کب کھولی' پکا پتہ نہیں۔ لندن سے سینٹر کیمبرج اور زراعت میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ لندن انہیں پسند تھا کیونکہ وہاں انگریز اپنا منہ صرف ماؤتھ ٹو ماؤتھ سانس دلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی زبان بھی ناک میں ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو ناک میں دم ہوتا ہے۔ جونیجو صاحب کا بھی منہ کھلا ہوتا تو لوگ سمجھتے' سانس لینے کے لیے کھولا ہو گا یا دوسرے کی بات سننے کے لیے۔ منہ سے الفاظ یوں نکالتے جیسے ریزگاری نکال رہے ہوں' یعنی گن گن کر۔ چلاتے تک سرگوشی میں۔ جس کام کے لیے دوسرے زبان ہلاتے' یہ خود کو ہلاتے۔ جب تک بلند آواز میں نہ بولتے' خود اپنی بات نہ سن سکتے۔ بیک وقت ہاں اور ناں یوں کہتے کہ دونوں کا مطلب ایک ہی ہوتا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو پسینہ سکھانے کے لیے دھوپ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوئی زیادتی کرتا' اسے اتنی جلدی معاف کر دیتے کہ لگتا انہیں پہلے ہی پتہ تھا کہ یہ زیادتی کرے گا۔

وہ پیر پگاڑہ صاحب کی دریافت ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں' وہ ان کی ایجاد ہیں۔ وزیراعظم تھے تو ماتحتوں کے ٹیلیفون بل تک چیک کرتے' ان کے دور میں تو چائے منگوانے کے لیے فائل موو کرانا پڑتی۔ سابق وزیر جسونده سنگھ کی طرح وہ بہت بچت کرتے۔ جسونده سنگھ تو پٹرول یوں بچاتے کہ جس گاڑی میں دفتر آتے' اسے ڈرائیور کو دے کر واپس گھر بھجوا دیتے اور دفتر کے بعد خود پیدل گھر جاتے تا کہ پٹرول کی بچت ہو۔ پہلے جونیجو صاحب کے فیصلے بڑے دانشمندانہ ہوتے' مگر بعد میں انہوں نے خود فیصلے کرنا شروع کر دیئے۔ یہ غلط ہے کہ وہ آج کا کام کل کرتے' وہ تو کل کا کام بھی آج کرتے۔ کبھی دوسروں کی غلطیوں سے فائدہ نہ اٹھایا۔ انہوں نے تو کبھی اپنی غلطیوں سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اگر کسی کام میں جلدی کی تو وہ دیر کرنے میں۔ وہ تو جتنی دیر میں شیو کرتے' اتنی دیر میں شیو پھر اتنی ہی ہو چکی ہوتی۔ وہ بارات میں شامل ہونے کے لیے گھر سے نکلتے تو ولیمے پر پہنچتے۔ ایک بار انہیں صب کی ایک تقریب میں پابندی وقت پر تقریر کرنا تھی' آپ تقریب میں پہنچے اور کہا۔ "گڈ آفٹر نون"

اوجڑی کیمپ جب اجڑی کیمپ بنا تو انہوں نے کہا' اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ واقعی جب یہ واقعہ ہوا' ان کے دونوں ہاتھ ان کی جیب میں تھے۔ ان دنوں انہیں بہت کم نیند آتی' ہر چند روز کے بعد اٹھ پڑتے۔ ضیاء الحق نے جب اسمبلی توڑی تو کسی نے ان سے پوچھا۔ "ایسا آپ کے ذہن میں تھا؟" کہا۔ "میرے ذہن میں تو کچھ نہیں تھا۔" تو سننے والے نے کہا۔ "واقعی ذہن میں کچھ ہوتا تو ایسا کیوں ہوتا۔"

وہ کاہل سہی مگر ان کا ذکر ممتاز کاہلوں میں نہیں ہوتا۔ ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم بننا چاہتے تھے۔ یہ جب وزیراعظم تھے' ذوالفقار علی بھٹو بننا چاہتے تھے۔ بولتے یوں جیسے بھٹو صاحب چپ ہوتے' یعنی دوسروں کو کچھ پتہ نہ ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ بھٹو صاحب جیسی گاڑی اور وہی ڈرائیور ہی نہ رکھا' بلکہ گاڑی کی رفتار بھی وہی رکھی۔ مزاج ایسا تھا کہ جو دروازہ بٹن دبانے سے کھلتا' اس کے کھلنے پر بھی "شکریہ" کہتے۔ صبح چھڑی

لے کر یوں واک کرنے نکلتے کہ لگتا چھڑی کو واک کرانے نکلے ہیں۔ پیر پگاڑہ صاحب کو ملنے جاتے تو جوتا پہلے اتار لیتے۔ انہیں اس بات پر بھی غصہ آتا' جس پر جو غصہ نہ

کرے اس پر غصہ کرنا چاہیے۔ پرائم منسٹر تھے تو ان کے ساتھ P.M. بھی لکھا ہوتا۔ تو لوگ اس سے مراد وقت ہی لیتے۔ ان کا پانچ نکاتی پروگرام نقاہتی پروگرام ثابت ہوا۔ اس قدر محتاط ہوتے کہ احتیاط کرنے میں بھی احتیاط کرتے۔ وہ سیاست میں یکدم پیچھے سے آگے آئے اور اتنا آگے نکل گئے کہ ان کے پیچھے دور دور تک کوئی نہ تھا۔ مسلم لیگ ان کی وہ کمزوری رہی جس میں ان کی طاقت تھی' لیکن جب مسلم لیگ پوری ہوتی' وہ اس کے پورے صدر نہ ہوتے۔ جب وہ اس کے پورے صدر ہوتے تو مسلم لیگ پوری نہ ہوتی۔ لوگ انہیں مسلم لیگ کی بیوہ کہتے' مگر جب وہ نہ رہے تو مسلم لیگ بیوہ ہو گئی۔ ہر جگہ دیر سے پہنچنے والے محمد خان جونیجو نے صرف اللہ کے پاس پہنچنے میں جلدی کی۔

○○○

• ملکہ معظمہ

آپ نے لفظ "بڑا آدمی" اکثر سنا ہے کبھی "بڑی عورت" نہیں سنا ہو گا۔ کیونکہ یہ سننے سے نہیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کتنی بڑی ہے۔ لیکن ملکہ معظمہ وہ عورت ہے جو سننے میں بھی "بڑی عورت" ہے۔ اس میں بچپن ہی سے بڑی عورت بننے کی صلاحیتیں تھیں کیونکہ جس عمر میں دوسری لڑکیاں ہوتی ہیں یہ اس عمر میں بھی عورت تھی، آج بھی ویسی ہے جیسی چالیس سال پہلے تھی۔ اگر آپ کو اس میں کوئی تبدیلی لگتی ہے تو اس کی وجہ یقیناً آپ کی عمر کی تبدیلی ہے۔ دیکھنے میں ان عورتوں سے کم بوڑھی ہے جو اس سے زیادہ بوڑھی ہیں۔ ہالی وڈ میں تو اس سے بڑی عمر کی اداکارئیں بھی اپنے ہیئر اسٹائل کی وجہ سے ہرگز بوڑھی عورت نہیں لگتیں، بوڑھا مرد لگتی ہیں۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے "ملکہ معظمہ کی عمر ہی کیا ہے؟ ابھی پچاس سال پہلے تو وہ صرف پانچ برس کی بے بی تھی۔" یوں بھی وہ مشکل سے چھپن برس کی ہرگز نہیں لگتی، چوّن برس کی لگتی ہے۔

صورت و سیرت میں اپنے آپ پر گئی ہے۔ رنگت ایسی، ذرا نقاب الٹ دے تو اندھیرے کمرے میں پو پھوٹنے لگے اور دیکھنے والے کا دل چاہے کہ پورا دن نکل آئے۔ قد جتنا آپ سمجھتے ہیں اس سے ذرا زیادہ اور وزن جتنا آپ سمجھتے ہیں اس سے ذرا کم۔ چال منٹو کے افسانے کی طرح، چال چلن بھی ویسا ہی۔ بقول "ف" ایک وقت ایسا بھی تھا جب میڈیکل کالجوں کے طلبہ دل کی دھڑکنیں تیز کرنے والے عوامل گنتے تو ان میں اس کا نام بھی ہوتا۔

قصور کے ایک محلے میں پیدا ہوئی جو دودھ دہی اور دھوکا دہی کے لیے مشہور ہے۔ تعلق اس خاندان سے جس سے ہر کوئی تعلق رکھ سکتا ہے۔ جہاں بیٹی کا بوجھ ماں، باپ اور

جوان بھائیوں پر مشتمل ہوتا ہے اور گھروں کی دیواریں نہیں بس دروازے ہوتے ہیں۔
بچپن کھیل کود میں گزرا جس میں کھیل کم اور کود زیادہ تھی۔ پانچ سال کی عمر میں اس نے پہلی بار اسٹیج پر گانا گایا تو سننے والوں نے کہا یا تو جلد مر جائے گی یا پھر یہ کبھی نہیں مرے گی۔

موسیقی فرشتوں کی زبان ہے جس میں ہم اپنی خواہشات دراز کرتے ہیں۔ ملکہ کی تین زبانیں ہیں۔ پہلی دو آنکھوں میں ہیں' وہ گلے سے نہیں پورے جسم سے گاتی ہیں' سنتی بھی ایسے ہی ہیں۔ وہ تو روتی بھی یوں ہے' لگتا ہے آنسو نہیں انترے نکل رہے ہیں۔ گانے کے دوران ساڑھی کا پلو انگلی پر لپیٹتی جاتی ہے۔ گانا فحش ہو تو انگلی پر لپیٹا پلو اتارتی جاتی ہے۔ جو یہ کہے کہ میں نے کبھی ملکہ کی آواز نہیں سنی یا تو وہ جھوٹ بول رہا ہے یا بہرہ ہے۔ دنیا میں خوبصورت عورتوں نے اتنا نہیں گایا جتنا عورتوں نے خوبصورت گایا ہے اور وہ گا رہی ہو تو لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں "سامنے سے ہٹ جاؤ مجھے اس کی آواز دکھائی نہیں دے رہی!" نہ سنو تو بھی سریلی ہے۔
رقص اعضاء کی شاعری اور گلوکاری شاعری کا رقص ہے۔ کہتے ہیں بڑا گلوکار وہ ہوتا ہے جسے گانے کے لیے کہیں تو وہ نہ گائے اور جب چپ ہونے کے لیے کہیں تو چپ نہ ہو۔ پہلے بڑے گلوکار گاتے تو جنگل میں آگ لگ جاتی' اب بھی گانے سے آگ لگ جاتی ہے جو اکثر رشتہ داروں اور دوسرے گلوکاروں کو لگتی ہے۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے "میں ملکہ کو آنکھیں بند کر کے پسند کرتا ہوں۔" حالانکہ اسے آنکھیں بند کر کے تو مہندی حسن کو پسند کرنا چاہیے۔ وہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا گانا سن کر بھی سر دھنتا ہے' میرا بھی دل عطاء اللہ کا گانا سن کر اس کا سر دھننے کو چاہتا ہے۔ کہتے ہیں موسیقی پیدا کرنا ایسے ہی ہے جیسے بچہ پیدا کرنا اور غلام فرید صابری کو گاتا دیکھ کر اس کا یقین بھی ہو جاتا ہے۔
وہ موسیقی کو استادوں سے زیادہ جانتی ہے۔ وہ تو استادوں کو بھی ان سے زیادہ جانتی ہے۔

میرا دوست "ف" کہتا ہے "جس میں میوزک سینس نہیں اسے پولیس میں بھرتی کرا دینا چاہیے اور جس کے پاس سینس کی میوزک نہیں اسے فوج میں بھیج دینا چاہیے۔" موسیقی روح کی غذا ہے' آج کل لوگ نہاتے وقت ضرور گاتے ہیں جس سے لگتا ہے موسیقی روح کا غسل ہے۔

ملکہ خیال ایسی گاتی ہے کہ ایک بار سن لو تو کسی اور کا خیال تک نہ آئے گا۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے ایسے یہ کئی گلوکارئیں اس سے جلتی ہیں۔ عورت کو مرد کے جسم کا جو حصہ سب سے اچھا لگتا ہے وہ کان ہیں ملکہ ہر مرد کے کانوں میں بستی ہے۔ اس نے جتنے گانے گائے ہیں' بچے کو سنانا شروع کریں تو سنتے سنتے اس کے کئی بچے ہو جائیں گے۔

وہ اکیلی کئی عورتوں جتنا کام کرتی ہے۔ اسے میک اپ کرتے دیکھ کر اس کا یقین بھی ہو جاتا ہے۔ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتی' اس لیے جو پریشان ہو اسے نہیں دیکھتی۔ وہ بات بھی منہ پر کہہ دے گی جو کان میں کہی جاتی ہے۔ بندہ اس سے مل کر آئے تو لگتا ہے کئی عورتوں سے مل کر آرہا ہے اور ملنے جائے تو لگتا ہے کئی مردوں سے ملنے جا رہا ہے۔ غصے میں پورا مرد اور پیار میں پوری عورت ہوتی ہے۔ جنہیں نہیں جانتی انہیں یوں دیکھتی ہے جیسے اسے وہ دیکھتے ہیں جو اسے جانتے ہیں۔

فلمی خواتین کی شہرت کی دو وجوہات ہوتی ہیں: "ایک اداکاری اور دوسری کاری ادا۔" یوں بھی فلم انڈسٹری بغیر سکینڈل کے ایسے ہے جیسے مسجد بغیر نمازی کے۔ اداکاراؤں کو فلمی ستارے شاید کہتے ہی اسی لیے ہیں کہ دونوں قسم کے ستاروں کی قدر و قیمت بلکہ جس قدر قیمت ہوتی ہے رات کے اندھیرے میں ہوتی ہے۔ بقول "ف" دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے کا محاورہ بنا ہی اداکاراؤں کے لیے ہے۔ عمر کے علاوہ ان کی ہر چیز بڑی ہوتی ہے۔ اپنی جو عمر بتاتی ہیں اس حساب سے اکثر اپنے والدین کی وفات کے کئی سال بعد پیدا ہوئیں۔ ان کا تلفظ ان کے چال چلن کی طرح ہوتا ہے۔ پیسہ

کو پیشہ کہتی ہیں' وہ تو گھرانہ بھی یوں بولتی ہیں جیسے کہہ رہی ہوں گھر آنا۔ ہر کام اپنی مرضی سے کرتی ہیں' اکثر تو پیدا بھی اپنی مرضی سے ہوئیں' ماں باپ کی مرضی نہیں تھی۔ کہتے ہیں منصوبہ بندی کے بغیر فلمی ہیروئنیں ترقی نہیں کر سکتیں۔ یہاں منصوبہ بندی سے مراد وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ کشش شکل ہو نہ ہو ان سے زیادہ کشش ثقل شاید ہی کسی میں ہو۔ ان کا پاؤں اکثر ایسا ہی رہتا ہے جیسا محاورتاً رہتا ہے۔ ضرورت پڑے تو کچھ بھی کر سکتی ہیں' یہاں تک کہ شریف بھی ہو سکتی ہیں۔ ضرورت کے وقت تو یہ والد کو باپ بنا لیتی ہیں۔ ملکہ چونکہ خاندانی ہے یعنی وہاں سے ہے جہاں سے یہاں کی ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ ہر لحاظ سے مکمل ہیروئن رہی مگر چار شوہر قبل اس نے فلموں میں اداکاری چھوڑ دی' گھر میں کرنے لگی۔ یوں تو کسی اداکارہ کی زندگی میں اس کی غلطیوں کے علاوہ کوئی چیز اوریجنل نہیں ہوتی مگر ملکہ معظمہ نے پوری زندگی اوریجنل گزاری۔

کہتے ہیں عورت گالی دیتی اچھی نہیں لگتی' حالانکہ گالی سے عورت نکال دی جائے تو گالی بھی گالی نہیں رہتی۔ ملکہ معظمہ جس سے ناراض ہو اسے پاس بلا کر گالی دے گی اور جس سے خوش ہو اس کے پاس جا کر گالی دے گی۔ اس سے پوچھو کہ کون کون سے مہینے ہوتے ہیں تو کہے گی "پہلا' دوسرا' تیسرا' چوتھا' پانچواں' چھٹا' ساتواں' آٹھواں اور نواں مہینہ" کبھی رائے نہیں دی ہمیشہ فیصلہ دیا' کئی بار فیصلہ لیا بھی۔ ایک نظر میں پہچان لیتی ہے کہ آدمی اچھا ہے یا برا۔ جسے نہ پہچان سکے اس سے شادی کر لیتی ہے۔ ہر جگہ اسے وی۔آئی۔پی ٹریٹمنٹ ملتی ہے۔ اگر یہ سلوک نہ ہو تو سمجھ جاتی ہے کہ اب وہ اپنے گھر میں ہے۔ گھر میں وہ ملکہ ترنم کی بجائے ملکہ ترحم ہوتی ہے۔

اولاد کو کبھی نصیحت نہیں کی۔ جب بھی کی' اولاد نے کی۔ میک اپ اور زرق برق لباس میں خود کو اس قدر مصنوعی بنائے رکھتی ہے کہ اس سے پیار کرنا مصنوعات کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ پسندیدہ لباس ساڑھی ہے' یہ وہ مشرقی لباس ہے جس میں میٹروں کپڑے

سے وہی کام لیا جاتا ہے جو ہالی وڈ میں ہیرو سے لیا جاتا ہے۔ یعنی خواتین پر لپیٹا جاتا ہے۔ یوں بھی یہ واحد لباس ہے جس میں کسی بھی لمحے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ اس

کو پہن رہے ہیں یا اتار رہے ہیں۔

شوکت حسین رضوی سے بھی اختلافات کی وجہ سے طلاق لی لیکن اب دونوں متفق ہیں کہ ایک صورت تھی جس سے بات کبھی طلاق تک نہ پہنچتی' وہ یہ تھی کہ شادی نہ ہوتی۔

ملکہ اس قدر مرضی چلاتی ہے کہ مرضی مرض کا مونث لگتی ہے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر کار ڈرائیو کرتی ہے۔ اسے دیکھ کر بے اختیار لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ "ف" کہتا ہے۔ نہیں' با اختیار بھی کھنچے چلے آتے ہیں' شیخ برادری سے ہے۔ اس لیے آمدنی کے بارے میں کہتی ہے۔ "پہلے' مہینے کے دو سو ہو جاتے تھے' اب دو ہزار ہو جاتے ہیں۔"

اس کا چہرہ دیکھ کر آپ بے شک یہ نہ کہیں کہ خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے' یہ کہہ سکتے ہیں کہ پلاسٹک سرجن نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ جس سے ناراض ہو وہ پریشان رہتا ہے کہ پتہ نہیں کیا کر دے' جس سے خوش ہو وہ بھی اسی لیے پریشان رہتا ہے۔ اسے ایسے لوگ اچھے نہیں لگتے جو آج یہاں ہیں تو کل پھر یہاں ہیں۔

اس کے بیٹوں سے ان کے والد کا نام پوچھو تو وہ اس کا بتائیں گے اور موصوفہ کے والد سے کوئی ان کے بیٹے کا نام پوچھتا تو وہ بھی اسی کا نام لیتا۔ منٹو نے اسے سرور جہاں لکھا۔ اگر سرور سر کی جمع ہے تو وہ واقعی سرور جہاں ہے۔ راگ کی رگ رگ جانتی ہے اور اس کی رگ رگ میں راگ ہے۔ دیکھنے میں موسیقی یقیناً ملکہ جیسی ہی ہو گی۔

ہر سال اس کی عمر کئی سال بڑھ جاتی ہے۔ آج سے پچاس سال قبل اس کا گانا سن کر کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یا تو یہ جلد مر جائے گی یا پھر کبھی نہیں مرے گی۔

- بیوہ آدمی

لاہور کا وہ شخص جو کسی گھر میں نہیں رہتا اور جہاں رہتا ہے وہیں گھر کر جاتا ہے۔
اسے لوگ اس عمر میں مہاراج کہنے لگے تھے جس میں اگر کسی کے لئے مہا کا لفظ استعمال بھی ہو تو یقین کر لیں وہ مہا سے ہی ہو گا۔ ہر کام اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کیونکہ دائیں ہاتھ میں تو چھڑی ہوتی ہے' جو صرف اس وقت دائیں ہاتھ میں نہیں ہوتی جب بائیں ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مگر لگتا نہیں اس نے چھڑی پکڑ رکھی ہے' لگتا ہے چھڑی نے اسے پکڑ رکھا ہے۔

اس کی آج تک اپنی بیوی سے لڑائی نہیں ہوئی جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ بڑا صلح پسند ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ شادی شدہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں لوگ سب کچھ شادی کے لئے کرتے ہیں' مگر اس نے سب کچھ کیا شادی نہیں کی۔ وہ شادی شدہ مردوں کی نسبت عورت کو زیادہ جانتا ہے اگر نہ جانتا ہوتا تو کب کا شادی کر چکا ہوتا۔
اس سے ملو تو لگتا ہے آپ بیک وقت عورت مرد دونوں سے مل رہے ہیں۔ جبکہ فقیر حسین ساگا سے ملو تو پتہ ہی نہیں چلتا' آپ کس سے مل رہے ہیں ؟ موسیقیت عورت کے جسم میں نہ ہو تو وہ عورت نہیں ہوتی اور اگر مرد کے جسم میں آ جائے تو وہ مرد نہیں ہوتا' مرد ہوتی ہے۔ مہاراج ردھم کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ پان کھا رہے ہوں تو لگتا ہے دانتوں کا رقص ہو رہا ہے۔ خوشی میں سارا جسم ہلا کر بات کرتے ہیں۔ غصے میں بات کرکے جسم ہلاتے ہیں۔ رقص مذکر کیوں ہے؟ اسے رقص کرتا دیکھ لیں تو وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔
کوئی بھی تخلیق کار اپنی تخلیق کے زیادہ نمونے ویسے بناتا ہے جو اس کے نزدیک سب سے بہتر ہوتے ہیں' اور اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ آدمی بنائے ہیں۔ عام آدمی ہی اصل

میں آدمی ہوتا ہے اور خاص آدمی اتنا آدمی نہیں ہوتا جتنا خاص ہوتا ہے۔ مہاراج ایک سرعام سا آدمی ہے' لباس میں دکھاوے کا ہرگز ہرگز شوق نہیں۔ جب کبھی ململ کا

دوپٹہ لپیٹ کر رات برات چہل قدمی اور چہلیں کرتا ہے تو کیا مجال اس کے سوا کسی اور کو پتہ چلے کہ اس نے کچھ پہن رکھا ہے۔ مولویوں کی جو چیز بڑے تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے' وہ ہے پیٹ' بچے اور بیویاں۔ مگر اس سے کوئی پوچھے کتنے بال بچے ہیں تو کہے گا "آگے سے سر صاف ہو گیا' پیچھے سے بچے ہیں۔"

قبائلیوں کی زندگی سے دشمن کو نکال دیا جائے تو ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہتا' اس کی زندگی سے رقص نکال دیا جائے تو کچھ نہیں رہتا۔ رقص اس وقت ہوتا ہے جب ناچنے والے کی بجائے ناچ نظر آئے۔ جوانی میں اسے ہر طرف مور ناچتے نظر آتے۔ مور اب بھی اس کے چاروں طرف ناچتے ہیں مگر وہ اس عمر میں ہے جہاں نظر صرف ان کے پاؤں آتے ہیں۔ اس کے اندر ایک عورت ہے' آدھے آدھے کام وہ اس عورت کو مطمئن کرنے کے لئے کرتا ہے اور باقی آدھے اس عورت کے مطمئن ہونے کی وجہ سے۔ اس نے کبھی نیکی کو نیکی سمجھ کر نہیں کیا' کام سمجھ کر کیا اور اور کام کو کام سمجھ کر نہیں عبادت سمجھ کر کیا۔ لوگ جوتے اتار کر اس کے سامنے جاتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے معاشرے میں ناچنے گانے والوں کو دیکھتے ہی لوگ جوتے اتار لیتے ہیں۔

پہلے لکھنؤ میں نظر آتا۔ اب لکھنؤ اس کے ہاں نظر آتا ہے اور لکھنؤ میں تو ادب آداب کا اس قدر خیال رکھا جاتا ہے کہ بندہ بچوں کے ختنے نہیں کرا سکتا۔ بچہ کہتا ہے "پہلے آپ' حضور پہلے آپ!"

جو دو منٹ اس کے پاس بیٹھ جائے اسے اٹھنے میں سال لگ جاتا ہے اور جو سال پاس بیٹھا ہو دو منٹ میں اٹھ جاتا ہے۔ لہر میں چلے تو دایاں پاؤں وہاں پڑتا ہے جہاں بایاں پڑنا چاہیے اور جہاں بایاں پاؤں پڑنا چاہیے وہاں وہ خود پاؤں پڑ جاتا ہے۔ پاس سرمایہ نہیں سر ہی مایہ ہے۔

کئی خواتین اسے بھائی سمجھتی ہیں اور جب تک مرد میں کوئی کمی نہ ہو' عورت اسے بھائی نہیں کہتی اور جب تک کوئی خامی نہ ہو بھائی نہیں سمجھتی۔ دوسروں کی بیٹیوں اور بچیوں کے ساتھ یوں پیش آتا ہے جیسے اس کی اپنی بیٹیاں اور بچیاں ہوں۔ دوسروں کی بیویوں کے ساتھ بھی ایسے ہی پیش آتا ہے۔ وہ بیگمات جن کے اشاروں پر کئی صاحب ناچتے ہیں' اس کے اشاروں پر ناچتی ہیں۔ انہیں یوں نچواتا ہے کہ آنگن ٹیڑھا کر دیتا ہے۔

سبز لمبا چوغا پہنتا ہے جو بیک وقت ستر پوشی اور فرش پوشی کے کام آتا ہے۔ دوسروں کی حاجت روا کرنے یوں جاتا ہے جیسے حاجت رفع کرنے جا رہا ہو۔ "ف" کہتا ہے "اسے جانوروں سے بڑا پیار ہے کم ازکم میں تو جب بھی اسے ملنے گیا مجھے یہی لگا۔"

ہمیشہ اپنی خوبیوں پر نظر رکھتا ہے کیونکہ اسے پتہ ہے سورج اور اپنی خامیوں پر بندہ زیادہ نظر رکھے تو نظر نہیں رہتی۔

زیورات جمع کرنے اور پہننے کا شوق ہے۔ ایک بار ایک شخص نے اس کی سانسیں اور زیورات چرانے کی کوشش کی مگر مہاراج نے اسے پکڑ کر سزا دینے کے لئے پولیس کے حوالے نہ کیا۔ اپنے پاس رکھا اور اس نے ہمیشہ کے لئے ایسے کاموں سے توبہ کر لی۔

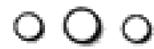
میرا دوست "ف" کہتا ہے "رقص اعضا کی شاعری ہے" حالانکہ وہ رقص کر رہا ہو تو لگتا ہے یہ ایذا کی شاعری ہے۔ اس کے بقول رقص دنوں میں نہیں آتا شاید اس کے خیال میں اس کے لئے راتیں بھی ضروری ہیں۔ بہر حال مہاراج کتھک نے رقص کے لئے دن رات ایک کر دیا۔ کیونکہ کتھک تب مکمل ہوتا ہے جب اس میں "تھک" آئے۔ اس نے ڈراموں میں اداکاری بھی کی۔ بیوی تک کا رول کیا مگر کبھی وہاں بھی شوہر کا کردار نہ کیا' جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ سائیلنٹ رول کی بجائے مکالموں والے کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔

چلتے پھرتے سارے کام پورے کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ نیند بھی اور یہ اسے ہی پتہ

ہوتا ہے کہ وہ چلتا ہوا سو رہا ہے یا سویا ہوا چل رہا ہے۔ کسی جگہ کام جانا ہو تو بھول جائے گا۔ کس جگہ جانا تھا؟ اگر جگہ پر پہنچ جائے تو بھول جائے گا یہاں کام کیا تھا؟ چالیس سال پہلے نیو دہلی مسلم ہوٹل انارکلی میں آیا تھا' سو ابھی تک وہیں بیٹھا سوچ رہا ہے کہ یہاں کیوں آیا تھا؟

کان ایسے کہ اسے مردانہ آواز صاف سنائی نہیں دیتی۔ جو خاتون پہلی ملاقات میں اس سے متاثر نہ ہو سمجھ لیں اس خاتون میں متاثر کرنے والی کوئی بات نہیں۔

اگر آپ چاہیں کہ زندگی میں کوئی مقابلہ نہ ہاریں تو اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی مقابلے میں حصہ ہی نہ لیں۔ مہاراج بھی آج تک رقص کے کسی مقابلے میں نہیں ہارا۔ سب سے اچھا رقاص خاوند ہوتا ہے کہ اسے بیوی کی انگلیوں پر ناچنا پڑتا ہے۔ مہاراج کتھک ساری عمر ناچتا رہا مگر شادی اس لئے نہ کی کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ فلاں کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ اس کی تو رگوں میں بھی خون دوڑتا نہیں' رقص کرتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو پیدا ہونے کے بعد پچاس سال زندہ رہیں تو مرنے کے بعد سو سال تک زندہ رہتے ہیں۔ وہ پاکستان کا واحد رقاص ہے جو ابھی تک واحد ہے۔



- افشی

پہلے افشی کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے حوالے سے پہچانی جاتی تھی جب سے افشا ہوئی ہے' کالج اس کے حوالے سے جانا جانے لگا ہے جب سے اس کی شہرت آوٹ آف کالج ہوئی ہے۔ کالج میں میرے دوست "ف" کے ملاقاتیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ امریکہ اسے حصول علم و اہل علم کی غرض سے آئی ہے۔ صورت و سیرت میں اپنے ماں باپ پر گئی ہے یعنی شکل باپ کی طرح پاکستانی اور شغل ماں کی طرح امریکی۔

انگریزی اس قدر روانی سے بولتی ہے جیسے ہم جھوٹ بولتے ہیں مگر گالی ہمیشہ اردو میں دیتی ہے تا کہ دوسروں کو با آسانی سمجھ آ سکے۔ اردو لکھنے میں فحش غلطیاں کرتی ہے۔ یعنی اس کی غلطیاں دور ہی سے نظر آ جاتی ہیں۔ پورے بدن سے باتیں کرتی ہے اسی لیے وہ بات کر رہی ہو تو دوسرا کہتا ہے یار ذرا سامنے سے ہٹ جاؤ مجھے اس کی آواز صاف دکھائی نہیں دے رہی۔ اس کا سارا بدن دعا ہے یعنی ہر وقت خدا سے کچھ نہ کچھ مانگتا رہتا ہے اسی لیے لوگ اسے افشی کم اور "اف شی" زیادہ کہتے ہیں۔ وہ موسم کے مطابق لباس نہیں بدلتی بلکہ اپنے لباس سے کالج کا موسم بدلتی رہتی ہے۔ جب جین پہن کر آئے تو لگتا ہے اس نے جین نہیں پہنی' جین نے اسے پہن رکھا ہے۔ اس نے کالج میں پردے کو رواج دیا یعنی جب سے وہ آئی ہے تمام لڑکیاں منہ چھپانے لگی ہیں۔ جتنی عمر بتاتی ہے اس حساب سے اس نے پرائمری پیدا ہونے سے پہلے ہی پاس کر لی تھی اور لگتا ہے دس پندرہ سال بعد اسے عمر بتانے کے لیے مڈل بھی پیدا ہونے سے پہلے ہی کرنا ہو گا۔

اس کے خون کا گروپ اے بی پازیٹو (AB+) ہے اور وہ محبت کے معاملے میں بھی اے

بی پانیٹو ہی ہے۔ اس کا رنگ اس جنتی پھل کی طرح ہے جس کی خاطر جد امجد نے خدا کی نافرمانی کی شاید اسی لیے اسے دیکھ کر بھی یہی کچھ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ہجر کی رات جیسے لمبے بال' ایسی ہی زبان۔ چال ایسی کہ دیکھنے والے کی منٹ میں سانس پھول جائے کبھی اکیلی نہیں چلتی اس کے ساتھ ساتھ پورے کالج کے راستے چلنے لگتے ہیں۔

قہقہے کے خلاف ہے۔ کہتی ہے اس سے آواز دور تک جاتی ہے۔ بس مسکراتی ہے۔ وہ بھی ان باتوں پر جن پر لڑکیاں گھبراتی اور عورتیں شرماتی ہیں۔ مسکراتے وقت ہونٹوں کے طول کو اتنا طویل کر دیتی ہے کہ وہ ایک لمبی سرخ لکیر بن جاتے ہیں۔ پورا کالج اس لکیر کا فقیر ہے۔ جب سے اس نے بلیک شیڈ کی لپ اسٹک استعمال کرنا شروع کی ہے۔ کالج گیٹ پر رومال بیچنے والے کی بکری بڑھ گئی ہے وہ غمگین ہو تو لڑکے اپنے آنسو پونچھ رہے ہوتے ہیں اگر خوش ہو تو منہ۔ برسات کے موسم کو برساتھ کا موسم کہتی ہے۔ جب تک ہوسٹل میں رہی لان میں آ کر یوں بیٹھتی کہ باہر سے آنے والا اسے دیکھ کر سمجھنے لگتا کہ وہ غلطی سے گرلز ہوسٹل کے بجائے سوئمنگ پول کی طرف آ گیا ہے۔ اس کی باتیں ایسی میٹھی کہ سننے والے کو ذیابیطس ہو جائے شاید اسی لیے اس کی باتیں سننے والوں کو بھی بار بار وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو اس مرض کے مریض کرتے ہیں۔

اس قدر رجعت پسند کہ ابھی تک بوائے فرینڈ کو کزن کہہ کر اس کا تعارف کرواتی ہے اور اکثر ان کے نام بھول جاتی ہے۔ پھر کار کے نمبروں سے یاد کرتی ہے کہ کون ہے؟ کھیلوں میں کرکٹر اور کھانوں میں ڈائٹنگ پسند ہے۔ اصناف ادب میں صنف نازک

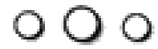
کا ادب پسند ہے یہاں تک کہ عصمت چغتائی کے "لحاف" کے بغیر سو نہیں سکتی۔

کیا مجال کہ کوئی بری بات منہ سے نکالے۔ اس کام کے لیے آنکھوں کو زحمت دیتی ہے۔ ورڈز ورتھ پر مرتی ہے۔ کہتی ہے' وہ بھی اسی کی وجہ سے مرا۔ کسی بھی امتحان

سے نہیں ڈرتی بس اس کے نتیجے سے ڈرتی ہے۔ ہر "کمرۂ امتحان" میں اس کے پاس
سوائے اعتماد کے کچھ نہیں ہوتا۔
اسے سو سے کم تو گنتی بھی نہیں آتی اسی لیے اس کی کار بھی اپنے آپ کی طرح
اس کے قابو میں نہیں رہتی اگر کوئی غلطی سے نیچے آنے سے بچ جائے تو روک کر
اسے ڈانٹے گی لیکن اس قدر رحم دل کہ کوئی زخمی ہو جائے تو اسے بالکل نہیں ڈانٹے
گی بلکہ خاموشی سے چلی جائے گی۔ جس دن کالج کار پارک سے انگریزی گانوں اور اردو
چیخوں کی آوازیں نہ آئیں' سمجھ لیں وہ کالج نہیں آئی۔ اکثر کالج گیٹ کے اندر بائیں
ہاتھ کھڑی ہوتی ہے لیکن میرا دوست "ف" کہتا ہے بالکل غلط' وہ کالج گیٹ کے
دونوں ہاتھ کھڑی ہوتی ہے۔ ثبوت کے طور پر کہتا ہے میں جب بھی کالج میں داخل ہوں
وہ دائیں ہاتھ ہوتی اور چاہے اسی وقت باہر نکلوں تو وہ بائیں ہاتھ کھڑی ہوتی ہے۔
یوں وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے۔ افشی دور سے مغرور' قریب سے بھرپور اور قریب ترین
ہونے پر مشکور ہوتی ہے۔
اس کا خیال ہے کہ تمام موسم اگر سردیوں میں آئیں تو مزہ آ جائے۔ کہتی ہے پاکستان
کے کالجوں میں بڑی گرمی پائی جاتی ہے کالج الیکشن میں ہر (انتخابی) امیدوار اپنے اسٹکر
اسے ضرور لگواتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکیں۔
کلاس میں بہت کم جاتی ہے۔ اکثر جہاں بیٹھی ہو کلاس وہیں آ جاتی ہے بنچ پر یوں بیٹھتی
ہے جیسے Anatomy Surfacy کی کتاب کھلی پڑی ہو۔ ایک دن ہمارا ایک کلاس
فیلو جس نے جسم کیدو کا اور دل رانجھے کا پایا ہے گزرتے گزرتے اس کتاب کا ورق
الٹنے کی کوشش میں الٹا تھپڑ کھا بیٹھا جس بنا پر میرے دوست "ف" نے فتویٰ دے
دیا کہ اف شی شریف لڑکی نہیں کیونکہ ایسی حرکت پر شریف لڑکیاں خود تھپڑ نہیں مارتیں۔
اس واقعے کے بعد لڑکے اسے یوں دیکھتے ہیں جیسے لڑکیاں لڑکوں کو دیکھتی ہیں یعنی چھپ
کر مگر تفصیل سے۔

"ف" کہتا ہے افشی اچھی بیوی ثابت ہو گی جس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ لیڈی ڈاکٹرز ہمیشہ اچھی بیویاں ہوتی ہیں کیونکہ جتنی محنت سے وہ ایم بی بی ایس کرتی ہیں اس سے کہیں زیادہ محنت انہیں شادی کرنے کے لیے کرنا پڑتی ہے۔ اسے خود پر اس قدر اعتماد ہے کہ ہر کسی پر اعتماد کر لیتی ہے اور چیڑ کی لکڑی کی طرح ایک ہی وار میں الف سے لے کر "ی" تک چر جاتی ہے۔ اس میں برائی یہ ہے کہ وہ ہر کسی کو اچھا سمجھتی ہے۔

میرا دوست "ف" کہتا ہے اس میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ سب سے محبت کرتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں۔ یہی خامی اس کی خوبی یہ ہے کیونکہ سر عام اور سب سے محبت تو بچے ہی کرتے ہیں بلکہ ان کے جوان ہونے کا پتا تب چلتا ہے جب وہ یہی کام چھپ کر کسی ایک سے کرنے لگیں۔ افشی سب سے سر عام محبت کرتی ہے۔ وہ ایک بچی ہی تو ہے جسے لڑکوں نے آنکھیں مار مار کر جوان کر دیا ہے۔



- ## ملا نصر الدین

ساری دنیا انہیں پیر سمجھتی ہے مگر وہ خود کو پیر نہیں' جوان سمجھتے ہیں۔ دیکھنے میں سیاست دان نہیں لگتے اور بولنے میں پیر نہیں لگتے۔ قد اتنا ہی بڑا' جتنے لمبے ہاتھ رکھتے ہیں۔ چلتے ہوئے پاؤں یوں احتیاط سے زمین پر رکھتے ہیں کہ کہیں بے احتیاطی سے مریدوں کی آنکھیں نیچے نہ آ جائیں۔ اتنا خود نہیں چلتے' جتنا دماغ چلتا ہے۔ دور سے یہی پتہ چلتا ہے کہ چل رہے ہیں۔ یہ کسی کو پتہ نہیں ہوتا' آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ سیاست میں ان کا وہی مقام ہے جو اردو میں علامتی افسانے کا۔ خاندان کے پہلے صبغۃ اللہ اول کے سر پر پگ باندھی گئی اور وہ پہلے پاگارہ پیر کہلائے۔ یہ بھی اس خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس کی چشم بھی چراغ ہے۔ بچپن ہی سے پردے کے اس قدر حق میں تھے کہ ۱۹۴۴ء میں جب کراچی ریلوے اسٹیشن سے انگلینڈ روانہ ہوئے تو پردے کی وجہ سے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ جا رہے ہیں یا جا رہی ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں یوں پاکستان کو واپس آئے جیسے پاکستان کو واپس لائے ہوں۔ کسی نے کہا۔ "انگلینڈ وہ جگہ ہے جہاں سب سے زیادہ دھند ہوتی ہے۔" کہا۔ "اتنی دھند تھی کہ جگہ نظر ہی نہ آئی۔"

پہلے کالعدم مسلم لیگ کے صدر بنے' پھر مسلم لیگ کے کالعدم صدر بنے' پھر مسلم لیگ بن گئے۔ اس لیے اب دوڑ وہ رہے ہوتے ہیں اور سانس مسلم لیگ کی پھولنے لگتی ہے۔

وہ بڑے پائے کے سیاستدان ہیں' جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں "چھوٹے پائے" کے سیاست دان ہوتے ہی نہیں' حالانکہ چھوٹے پائے مہنگے ہوتے ہیں۔ وہ پاکستانی سیاست کی اقوام متحدہ ہیں اور اقوام متحدہ وہ جگہ ہے جہاں دو چھوٹے ملکوں کا مسئلہ ہو تو مسئلہ غائب ہو جاتا ہے۔ چھوٹی اور بڑی قوم کا مسئلہ ہو تو چھوٹی قوم غائب ہو جاتی ہے اور اگر دو بڑی قوموں کا مسئلہ ہو تو اقوام متحدہ غائب۔

خود کو جی ایچ کیو میں کھڑا کرتے ہیں۔ جی ایچ کیو انہیں اتنا پسند ہے کہ ہمیں تو "جی ایچ کیو" سے مراد "جی حضوری کرنا" لگتا ہے۔ وہ مسلم لیگ کے خادم نہیں' خاوند ہیں اور مسلم لیگ ان کی بیوہ ہے۔ ان کے بیان پڑھ کر لگتا ہے جیسے ان کا تعلق محکمہ بندی سے ہے۔ شاید وہ اس لیے بار بار منصوبہ بندی پر زور دیتے ہیں کہ ابھی سات ماہ بھی نہیں ہوتے اور نئی مسلم لیگ کی ولادت ہو جاتی ہے۔

دوران گفتگو جہاں پتہ چلے کہ دوسرا ان کی بات سمجھ رہا ہے' فوراً بات بدل دیتے ہیں۔ آدھا دن وہ کہتے ہیں جو سننا چاہتے ہیں اور باقی آدھا دن وہ سنتے ہیں جو کہنا چاہتے ہیں۔ فقرہ یوں ادا کرتے ہیں جیسے بل ادا کر رہے ہوں۔ جس موضوع پر دوسرے ہائے ہائے کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ "ہائے" کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ کسی کی بات کی پروا نہیں کرتے' مگر چاہتے ہیں ان کی بات پر واہ کی جائے۔ لوگ ان کو ملنے سے پہلے وضو کرتے ہیں۔ وضو تو دوسرے سیاست دانوں سے ملنے والوں کو بھی کرنا پڑتا ہے مگر ملنے کے بعد۔ جانوروں کی حرکتوں سے بہت محظوظ ہوتے ہیں' اس لیے کسی کی حرکت سے محظوظ ہوں تو بندہ پریشان ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔ ان کے پاس کئی گھوڑے ہیں جو اکثر ریس اور الیکشن جیتتے رہتے ہیں۔ اپنی تعریف سن کر خوش نہیں ہوتے' آخر بندہ چوبیس گھنٹے ایک ہی بات سن کر خوش تو نہیں ہو سکتا۔

مرید اپنی نگاہیں ان کے پاؤں سے اوپر نہیں لے جاتے' اس لیے اگر کوئی مرید کہے کہ میں نے پیر سائیں کو ننگے دیکھا تو مطلب ہو گا' ننگے پاؤں دیکھا۔ پیر صاحب منفرد بات کرتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ پیر صاحب آپ نے ایک جوتا اتارا ہوا ہے تو کہیں گے۔ "نہیں' ہم نے ایک جوتا پہنا ہوا ہے۔" ان کی چائے میں چینی کم ہو تو کہیں گے۔ "اس چینی میں چائے زیادہ ہے۔" وہ جس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں' وہ سر ہاتھ پر رکھ لیتا ہے۔ جب وہ پیر جو گوٹھ سے لاہور آتے ہیں تو پیر جو گوٹھ بھی لاہور آ جاتا ہے۔ ان دنوں لاہور کہاں جاتا ہے؟ اس کا پکا پتہ نہیں۔ مرید انہیں اپنے ہاتھ سے کام نہیں کرنے دیتے۔ اس لیے پیر صاحب کے ہر کام میں کسی اور کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ان سے حور کا مذکر پوچھو تو شاید حر کہیں۔ جی ایم سید کے بقول پیر صاحب جھوٹ نہیں بولتے۔ گویا وہ پیر صاحب کو سیاست دان نہیں مانتے۔ ویسے پیر صاحب کے الیکشن کے نتائج سے تو ہمیشہ یہ لگتا ہے کہ ووٹر ان کا انتخاب نہیں کرتے' یہ ووٹروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ وہ پیر ہیں جو دن میں اتنی بار ماشاء اللہ نہیں کہتے' جتنی بار مارشل لاء کہتے ہیں۔ برتھ ڈے ضرور مناتے ہیں۔ دوسرے سیاست دان شاید اس لیے نہیں مناتے کہ برتھ ڈے تو ڈے کو پیدا ہونے والے ہی منا سکتے ہیں۔

ان کی باتوں میں اتنا وزن ہوتا ہے کہ سننے والا اپنا سر بھاری محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کا ہر فقرہ کئی کئی کلو کا ہوتا ہے۔ فقرے تو دوسرے سیاست دانوں کے بھی کئی کئی کلو کے ہوتے ہیں' جی ہاں کئی کئی کلومیٹر کے۔ دوسرے کے تو بیانوں کی بھی اتنے کالی سرخی نہیں لگتی جتنی کالی سرخی ان کی خاموشی کی ہوتی ہے۔ ستاروں کے علم پر ایسا عبور ہے کہ فلمی ستاروں کی گردش تک کی پس و پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔

بہت اچھے امپائر کئی بار سینچریاں بنائیں۔ فوٹو گرافی کا شوق ہے۔ کہتے ہیں۔ "میں ہمیشہ خوبصورت تصویریں بناتا ہوں۔" حالانکہ وہ خوبصورت کی تصویریں بناتے ہیں۔ مخالفین تک پیر صاحب کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ ان کے سیاسی حریف پرویز علی شاہ یہ نہیں کہتے کہ میں نے متعدد بار پیر صاحب کو ہرایا۔ یہی کہتے ہیں' پیر صاحب نے مجھے ہر بار جتوایا۔ صحافی بھی ان سے سوال کر رہے ہوں تو یہ انہیں یوں دیکھتے ہیں جیسے پیر سوالی کو۔

پیر صاحب کو فرشتے بہت پسند ہیں۔ فرشتوں میں یہی خوبی ہے کہ وہ سوچتے سمجھتے نہیں' بس جو کہا جائے کرتے ہیں۔ پیر صاحب کو زمینی فرشتے الیکشن ہرواتے ہیں' زمین اور آسمانی فرشتوں میں وہی فرق ہے جو زمینی اور آسمانی بجلی میں ہے۔ آسمانی بجلی وہ ہوتی ہے جس کا بل نہیں آتا۔ پیر صاب اس وقت کے تعلیم یافتہ ہیں جب ایک میٹرک پڑھا لکھا آج کے دس میٹرکوں کے برابر ہوتا ہے۔ یہی نہیں' اس زمانے کا تو ایک ان پڑھ آج کے دس ان پڑھوں سے زیادہ ان پڑھ ہوتا تھا۔

پیر صاحب کسی سیاست دان کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ جس کو سنجیدگی سے لیں‘ وہ مذاق بن جاتا ہے۔ وہ اتنے شگفتہ مزاج ہیں کہ ان کے کمرے کے گلدان میں پلاسٹک کے پودوں پر بھی پھول کھلنے لگتے ہیں جبکہ ان کے مرید اور کالعدم وزیراعظم محمد خان جونیجو ایسے تھے کہ ان کے کمرے میں تو پلاسٹک کے پھول بھی مرجھا جاتے۔ پیر صاحب کی چھٹی حس جانے والے حکمرانوں کا بتاتی ہے جبکہ باقی پانچ حسیں آنے والے کا۔ وہ کہتے ہیں۔ ”حکمرانوں کو آئین کی نہیں‘ آئینے کی ضرورت ہے۔“ ٹھیک کہتے ہیں۔ خضاب اور زیڈال بندہ آئین کی مدد سے تو نہیں لگا سکتا۔ ان کی طبیعت میں اتنی مستقل مزاجی نہیں‘ جتنی مستقل مزاحی ہے۔ سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ طریقے سے کہنا مزاح نہیں بلکہ غیر سنجیدہ بات کو سنجیدہ طریقے سے کہنا مزاح ہے۔ سوچتا ہوں اگر سیاست میں سنجیدگی آ گئی تو پیر صاحب کیا کریں گے؟

○○○

• شوہر اعظم

وہ مرزا جٹ کی نسل سے ہیں۔ اس لیے جس خاتون کو بھی دیکھا اسے صاحبہ نہیں صاحباں ہی سمجھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ جب چند گھنٹوں کے لیے فارغ ہوں اور کوئی کام نہ ہو تو شادی کر لیتے ہیں۔ تعلیم تو ان کی اتنی ہی ہے جتنی غلام حیدر وائیں صاحب کی ہے۔ اور وائیں صاحب اتنی دیر زیر تعلیم نہیں رہے' جتنی دیر وزیر تعلیم رہے ہیں۔ بہرحال شوہر اعظم ملک جی ایم غیر سید نے شادیوں پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ ان کی شادی پر تو فوٹو گرافر پولورائیڈ کیمرے استعمال کرتے ہیں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ جب تک تصویریں دھل کر آئیں' یہ نئی شادی کر چکے ہوں۔ وہ اگر کہیں کہ میں کئی سالوں سے پریشان ہوں تو لوگ سالوں سے مراد بھی مدت نہیں' رشتہ لیتے ہیں۔ ساری زندگی نمبر۲ رہے۔ بھٹو دور میں پی پی کے نمبر۲ لیڈر' این پی پی میں شامل ہوئے تو یہاں بھی دو نمبر لیڈر ہی رہے۔ یہاں تک کہ اپنی بیویوں کے بھی نمبر۲ خاوند رہے۔ قوم کا اس قدر غم ہے کہ ۱۹۹۰ء میں انہیں پتہ چلا کہ پاکستان میں ۴۸ لاکھ لڑکیاں شادی کے انتظار میں بیٹھی ہیں تو انہیں اس وقت تک رات کو نیند نہ آئی جب تک انہوں نے اس تعداد میں ایک کی کمی نہ کر دی۔ سیانے کہتے ہیں کہ مطلقہ کی بجائے بیوہ سے شادی کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے کہ وہ مرد کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے مگر جو مرد اس کے بارے میں جانتا ہوتا ہے' وہ زندہ نہیں ہوتا۔ کھر صاحب کو تجربہ کار لوگ اتنے پسند ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس سے شادی کی جسے پہلے شادی کا تجربہ تھا۔ وہ مطلقہ کو ہی اپنے متعلقہ سمجھتے ہیں۔ انہیں تو ڈاکٹر تبدیلی آب و ہوا کا کہے تو سمجھتے ہیں' ڈاکٹر نے تبدیلی آب و حوا کا کہا ہے۔

جی ایم سید فٹوں میں سوچتے اور انچوں میں بولتے ہیں' جبکہ جی ایم غیر سید انچوں میں سوچتے

اور فتوں میں بولتے ہیں۔ ملک جی ایم غیر سید خود کو پورا ملک سمجھتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ کہیں' پورا ملک بھوکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انہوں نے صبح کا ناشتہ نہیں

کیا۔ جہاں تک ملک سے ان کی محبت کی بات ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جو ایک فرانسیسی شاعر نے اپنی محبوبہ سے کہا تھا۔ "میں رات بھر تمہاری جدائی میں جاگتا رہا ہوں اور ساری رات اپنے خوابوں میں صرف اور صرف تمہیں دیکھتا ہوں۔"

ان کا تعلق کھرل قبیلے کی کھر شاخ سے ہے۔ تہمینہ درانی لکھتی ہیں۔ "کھرلوں کا ایک گروہ لاہور سے ملتان جا رہا تھا' راستے میں ملتان کے قریب انہوں نے گنے کے کھیت دیکھے تو انہیں کاٹ کر اپنی جھونپڑیاں بنانے لگے۔ کھیت کے مالک نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟" تو انہوں نے کہا' ہم تو کھرل ہیں۔ کھیت کے مالک نے کہا۔ حرکتوں سے تو تم خر لگتے ہو۔ یوں کھرل کے بعد وہ کھر کہلائے۔" شاید اسی لیے تہمینہ نے جی ایم غیر سید سے شادی کے بعد اپنے نام کے ساتھ بھی کھر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ کھر صاحب بڑے مادہ پرست ہیں۔ یہاں مادہ سے مراد وہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔

جب وہ گورنر تھے تو اکثر فور پیس میں ملبوس نظر آتے۔ کسی نے پوچھا۔ "تھری پیس سوٹ تو سنا ہے' فور پیس سے کیا مراد ہے؟" کہا۔ "تھری پیس تو پہنا ہوتا ہے اور ایک پیس ساتھ ہوتا ہے۔" خاتون کے ساتھ تصویر میں جی ایم غیر سید کو پہچاننا بڑا آسان ہوتا ہے۔ جس نے چادر لی ہو' وہ موصوف ہوں گے۔ فرماتے ہیں' پنجاب کی کسی ماں نے مجھ سے بڑا بیٹا نہیں جنا۔ جبکہ میرا دوست "ف" کہتا ہے' یہ کون سی بڑی بات ہے' میں خود دسویں ماہ کی پیدائش ہوں۔ نواب آف کالا باغ نے کہا تھا کہ جس عہدے کے آخر میں نر آئے جیسے گورنر' کمشنر' ڈپٹی کمشنر وغیرہ' ان سے ڈرو۔ جب کھر صاحب گورنر تھے تو لوگ ڈر کر انہیں شیر نہ کہتے بلکہ چڑیا گھر کے شیر کو بھی ڈر کے کھر کہہ کر بلاتے۔ یہ شیر آدم خور نہیں بلکہ حوا خور ہے۔ پیر پگاڑا سے کسی نے اس شیر کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے۔ "ہم اشرف المخلوقات سے رابطہ رکھتے ہیں' جانوروں سے نہیں۔"

جب گورنر تھے تو ان کی اپنی "ادا" تھی۔ اداکارائیں گورنر ہاؤس میں یوں آتیں جیسے اسٹوڈیو میں آ رہی ہوں۔ یحییٰ خان کے دور میں اداکارہ ترانہ جب یحییٰ خان سے ملنے کے بعد باہر نکلی تو ایوان صدر کے چوکیدار نے انہیں سلیوٹ کیا۔ کسی نے پوچھا' جب وہ آئی تھی تب تو تم نے سلیوٹ نہیں کیا تھا؟ کہا۔ "جب وہ آئی تھی تو صرف ترانہ تھی' جبکہ اب وہ قومی ترانہ ہے۔"

کھر صاحب اگر وزارت عظمیٰ کے امیدوار بھی ہوں تو اس کی وجہ یہی ہو گی کہ اس وزارت میں عظمیٰ بھی ہے۔ ویسے بھی کیا ہوا' اگر وہ وزیراعظم نہ بن سکے' شوہر اعظم تو بن گئے۔ تہمینہ نے جس دن طلاق لی' اس شام انہوں نے کہا' تہمینہ نے میرا گھر برباد کر دیا' عزت کو اخباروں میں اچھالا' الزامات لگائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری آج کی شام برباد کر دی۔ ایک مشہور گلوکارہ کی ذہانت سے متاثر ہو کر اسے شادی کرنے کو کہا۔ وہ واقعی ذہین نکلی' اس نے فوراً کسی اور سے شادی کر لی۔ انہیں انکار اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی مردوں کو اگر کسی عورت کا "انکار" پسند آئے تو یقین کر لیں وہ پروین شاکر ہو گی۔

اقتدار میں تھے تو اپنا چہرہ سرخ رکھنے کے لیے لسی' مکھن' دودھ اور حنیف رامے کی تصویریں استعمال کرتے۔ کوٹ ادو ان کا وہ کوٹ ہے جسے وہ جس کو چاہیں' پہنا دیں۔ پڑھائی سے اتنا شغف ہے' ان کے سامنے رسالہ کہو تو وہ اسے کتاب کی بجائے فوج کا دستہ سمجھیں گے۔ بحیثیت گورنر انہوں نے ثابت کیا کہ وہ نواب آف کالا باغ لیول کے نواب آف سبز باغ ہیں۔

ان کی زندگی کی کہانی ایک فلمی کہانی ہے' جس میں فائٹیں اور بڑھکیں ہی نہیں گانے بھی موجود ہیں۔ پہلے صرف جاگیر دار تھے تو کہتے میری کوٹھی کے آگے سے گاڑی ہٹاؤ۔ گورنر بنے تو کہنے لگے' میری گاڑی کے آگے سے کوٹھی ہٹاؤ۔ اب کہتے ہیں' کوٹھی کے آگے سے میری گاڑی ہٹاؤ۔ مزاج ایسا کہ اپنے دور اقتدار میں اگر کسی آرٹسٹ

کو فائن کہتے تو ان کے موڈ سے اندازہ لگانا پڑتا کہ کہیں آرٹسٹ سے فائن لینا تو نہیں۔ معاملات ایسے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ کاروبار کرنا چاہیں تو پہلے اپنے وکیل سے مشورہ کریں۔ اگر وہ وکیل آپ کو اس کی اجازت دیتا ہے تو پھر آپ کسی اچھے وکیل سے مشورہ کریں۔

دنیا میں جو جھوٹ سب سے زیادہ بولا جاتا ہے' وہ ہے کہ حکومت آپ کے مسئلے حل کرنا چاہتی ہے' لیکن وہ ہر مسئلے کا حل نکال لیتے۔ ان کے دور اقتدار میں کچھ پارٹی ورکرز نے شکایت کی کہ ہمیں جاب نہیں ملتی تو انہوں نے فوراً ایک کمیٹی بنانے کو کہا جو یہ پتہ چلائے کہ انہیں جاب کیوں نہیں ملتی اور ان کو اس کمیٹی میں جاب دے دی۔ کسی بیوقوف کو اپنا نہیں بناتے' ہاں اپنے کو بیوقوف بنا لیتے ہیں۔ سیاست میں ان کا یہ اصول ہے کہ سیاست میں کوئی اصول نہیں ہوتا۔

گورمانی خاندان کو سیاسی طور پر دفن کرنے کے لیے سیاست میں آئے۔ حالانکہ گور تو اس خاندان کے نام میں پہلے ہی تھا۔ بھٹو اقتدار میں تھے تو یہ ان کے دائیں بائیں ہوتے۔ وہ اقتدار میں نہ رہے تو یہ دائیں بائیں ہو گئے۔ پیپلز پارٹی سے ان کو نکالا گیا' مگر پیپلز پارٹی کو ان سے نہ نکالا جا سکا۔ واپس پی پی میں آئے تو انہیں کچھ نہ کہا گیا یعنی صدر کہا گیا نہ سیکرٹری۔ ۱۹۷۷ء کے بعد ملک چھوڑ دیا۔ اگر یہ ملک نہ چھوڑتے تو ملک انہیں نہ چھوڑتا۔ جان کے گلبرتھ کہتا ہے۔ "سیاست دان اتنا اچھا ہوتا ہے' جتنا برا اس کا حافظہ ہوتا ہے۔" ان کا حافظہ تو ایسا ہے کہ ایک صحافی نے بچوں کی تعداد پوچھ لی تو خود جواب دینے کی بجائے اپنی سیکرٹری کی طرف دیکھنے لگے۔

بے نظیر کے سسر حاکم زرداری فرماتے ہیں' کھر بھٹو کا بریف کیس ہی نہیں ان کے گھر کے جوتے بھی اٹھا کر لے جاتے۔ جس کا مطلب تو یہ ہے کہ بھٹو کا گھر ان کے لیے مسجد تھا۔ انہیں دن اچھا نہیں لگتا کہ صبح صبح چڑھ آتا ہے' البتہ رات پسند ہے کہ یہ اندھیرے میں آتی ہے۔ ناپسندیدہ دن ۲۱ جون کہ اس کی رات بڑی چھوٹی ہوتی ہے۔ سگار پی رہے ہوں تو ساری دنیا ان کے لیے ایش ٹرے ہوتی ہے۔ یہ ہیں

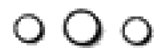
تو مرد آہن مگر آہن کا مسئلہ یہ ہے کہ اسے استعمال نہ کیا جائے تو اسے زنگ لگ جاتا ہے۔ وہ لاکھوں کے مجمع کو کنٹرول کر سکتے ہیں مگر خود کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔

ہر کسی کو غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو غلام نہ بنے' اسے آقا بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں میں کبھی کسی کے آگے نہیں جھکا۔ حالانکہ تہمینہ کہتی ہیں' وہ اپنی بیویوں کے آگے جھکتے۔ ظاہر ہے اتنا لمبا بندہ جھکے بغیر بیوی کے پیٹ میں گھونسا کیسے مار سکتا ہے؟ اچھے ڈرائیور ہیں۔ آج تک جتنے حادثے کئے' سڑک پر نہیں گھر پر کئے۔ گاڑی یوں چلاتے ہیں جیسے گھوڑا دوڑا رہے ہوں۔ اس لیے بریکیں لگاتے وقت اسٹیرنگ یوں کھینچتے ہیں جیسے لگامیں کھینچ رہے ہوں۔ اتنے تیز رفتار کہ جتنی دیر میں آپ کو ایک پل کراس کرتے ہیں' وہ ڈبل کراس کر چکے ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں' مخالفین مجھ سے اتنا ڈرتے ہیں کہ وہ مجھے زخمی کرنے کے لیے بھی میرے گھر پر تب حملہ کرتے ہیں جب انہیں یقین ہو کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ حریف کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ ویسے بھی حریف سیاست دان اگر آپ سے سارے اختلافات ختم کر کے آپ کے ہاں آئے' تو یقین کر لیں کہ وہ آپ کے جنازے پر آ رہا ہے۔ سائنس کہتی ہے' گرمی سے چیزیں پھیلتی ہیں۔ ان کی گورنری کا دور اتنا گرم تھا کہ ان کی تیس ایکڑ زمین پھیل کر کئی گنا ہو گئی۔ کہتے ہیں مجھ سے اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ اگر یہ خوشبو زیادہ ہو جائے تو کپڑے بدل لیتے ہیں۔

مگرمچھ کی کھال کے جوتے تین تین سال چلاتے ہیں۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے کہ یہ تو کوئی زیادہ عرصہ نہیں' یہ کھال تو مگرمچھ تیس تیس سال چلاتے ہیں۔ کہتے ہیں' میں یاراں کا یار ہوں۔ واقعی وہ زیادہ سے زیادہ "یاراں" کا یار ہو سکتے ہیں۔ باراں یا تیراں کے نہیں۔ مصیبت میں جو ان کے کام آئے' اسے نہیں بھولتے۔ خاص کر کے اس وقت جب پھر مصیبت میں ہوں۔ فیصلہ کرنے میں اتنی دیر لگاتے ہیں کہ اب ادھیڑ عمر ہونے کا فیصلہ کرنے کی ادھیڑ بن میں ہی ہیں۔ ان کے کاموں کے حساب سے ان

کی عمر کا اندازہ لگائیں تو اپنے بیٹے کے ہم عمر نکلیں گے۔ اداکارہ نینسی آسٹر نے کہا تھا' میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پچاس سال سے اوپر کی ہرگز نہ ہوں گی۔ سو ایک وقت ایسا آیا' نینسی جو عمر بتاتی' اس حساب سے اس کا بڑا بیٹا چار ماہ بعد پیدا ہوا۔ جی ہاں' نینسی آسٹر کی پیدائش کے چار ماہ بعد۔

عورتیں انہیں ایک شوہر' پی پی ورکرز ایک جوہر' بھٹو صاحب ایک شوفر اور جماعت اسلامی ایک لوفر کے طور پر جانتی ہے۔ انہوں نے اپنا سیاسی سفر کوٹ ادو کے ایک رکن اسمبلی کے طور پر شروع کیا۔ بھٹو کے دست راست بنے۔ پنجاب کے بااختیار گورنر بنے' لیکن پھر وہیں آ گئے جہاں سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا۔ یعنی اب وہ پھر صرف کوٹ ادو کے ایک رکن اسمبلی ہیں۔



• علامہ فی الفور

علامہ فی الفور ان لوگوں میں سے ہیں جو ہر کام جلدی سے کرتے ہیں۔ وہ تو دیر کرنے میں بھی جلدی کرتے ہیں۔ انہوں نے معروف ہونے میں تو چند ماہ ہی لگائے' البتہ غیر معروف ہونے میں کئی سال لگائے ہیں۔ مولانا خواب زادہ علامہ فی الفور بڑی "جھنگ جو" شخصیت ہیں۔ لاہور آ کر لاء کالج کے ہوسٹل میں رہے۔ یہاں لاء ہوسٹل سے مراد سسرال نہیں کہ وہاں بھی مدر ان لاء' فادر ان لاء' سسٹر ان لاء' بلکہ ہر کوئی ان لاء ہی ہوتا ہے۔ وہاں سے نکل کر فیض الحسن صاحب سے "فیض" لیا۔ وہ پیدائشی طور پر بڑے سیاست دان ہیں۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں چھوٹا ادیب' چھوٹا سیاست دان اور چھوٹا اداکار پیدا ہی نہیں ہوتا۔ البتہ وہ پیدائشی طور پر اس لیے بڑے ہیں کہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔

مولانا خواب زادہ علامہ فی الفور اس وقت سوتے ہیں جب اٹھنا ہو۔ جبکہ ہم جیسے تب اٹھتے ہیں جب سونا ہو۔ کسی نے ہم سے پوچھا۔ "سو سو کر تھک نہیں جاتے؟" تو ہم نے کہا۔ "جب تھک جاتے ہیں تو پھر سو جاتے ہیں۔" یہ پتہ کرنا کہ علامہ صاحب سوئے ہوئے یا نہیں' بڑا آسان ہے۔ آپ کو ان کے پاس بیٹھے پانچ منٹ ہو جائیں اور وہ نہ بولیں تو سمجھ لیں' وہ سوئے ہوئے ہیں۔ لوگ تو جاگتے میں کام کرتے ہیں' یہ سوئے ہوئے بھی فارغ نہیں ہوتے۔ خواب ملاحظہ فرما رہے ہوتے ہیں۔ خوابوں کا سلسلہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ گوربا چوف نے ایک بار کسی کو بتایا کہ مجھے بڑی پریشانی ہے۔ رئیسہ گوربا چوف روز سوتے میں یہ خواب دیکھتی ہیں کہ اس کی کسی امریکی سے شادی ہو رہی ہے۔ تو سننے والے نے کہا۔ "اس وقت تک پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' جب تک وہ یہ خواب جاگتے میں نہیں دیکھنے لگتیں۔" علامہ صاحب جاگتے میں خواب دیکھتے ہی نہیں' دکھاتے بھی ہیں۔ فرماتے ہیں' ان کا نام بھی خواب میں رکھا گیا۔ یہی نہیں

انہوں نے تو نام پیدا بھی خواب ہی سے کیا۔
اپنے ہر کام کو الہامی سمجھتے ہیں۔ کچھ کام تو واقعی لگتے بھی ہیں یعنی ان کا تعلق انسانی عقل سے نہیں لگتا۔ علامہ صاحب دنیا کے واحد فرد ہیں جنہیں کوئی درازی عمر کی دعا بھی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ بقول علامہ فی الفور بحوالہ خواب نمبر ------ اللہ تعالیٰ نے میری عمر 63 سال مقرر کی جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑھا کر 66 برس کر دی۔ لیکن میں نے قبول نہ کی اور عرض کیا کہ 63 برس سے زیادہ زندہ رہنا نہیں چاہتا کیونکہ اس طرح عمر کے سلسلے میں سنت نبوی کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوں گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مان کر 63 کر دی۔ ویسے علامہ صاحب نے اس عمر کی حفاظت کے لیے اتنے گارڈز رکھے ہیں کہ لگتا ہے وہ انہیں لوگوں سے نہیں بچا رہے' بلکہ لوگوں کو ان سے بچا رہے ہیں۔ ہمارے ایک صحافی دوست بتاتے ہیں کہ علامہ کی دعا بڑی جلدی قبول ہوتی ہے۔ میں ملنے گیا۔ مدعا بیان کیا تو انہوں نے کہا۔ "جاؤ ------ کھوئی ہوئی رقم مل جائے گی۔" اور ان کی آدھی دعا فوراً قبول ہو گئی کہ میں وہاں سے چلا آیا۔
علامہ صاحب تقریر کر رہے ہوں تو وہ جنہیں اردو بھی نہیں آتی' سمجھ ان کو بھی آ رہی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ نہ بھی بول رہے ہیں تب بھی سننے والوں کو سمجھ آ رہی ہوتی ہے۔ دوران گفتگو ہم نے آج تک کسی کو ان سے اختلاف کرتے نہیں دیکھا' جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ دوران گفتگو وہ کسی اور کو بولنے کا موقع نہیں دیتے۔ ویسے علامہ صاحب جس تیزی سے بولتے ہیں' اس تیزی سے تو ہم سن بھی نہیں سکتے۔ بہت لمبی تقریر کرتے ہیں کیونکہ مختصر تقریر سننے کے لیے آج کل لوگوں کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا ہے۔ ٹی وی کے مذہبی پروگراموں کی کاسٹ میں شامل رہے۔ ایسے مقرر کہ جو انہیں ایک بار سن لے' پھر انہیں مقرر نہیں کہتا' مکرر کہتا ہے۔ ایک بار ٹی وی پر ان کی تقریر نشر ہونا تھی۔ دو تین بار اس کا ٹیلپ چلا۔ اس پروگرام کے پروڈیوسر کو اس تقریر کی تعریف میں اتنے خط ملے کہ وہ پریشان ہو گیا۔ ہم نے پریشانی کی وجہ

پوچھی تو کہنے لگا۔ "سوچتا ہوں عین وقت پر بوجوہ علامہ صاحب کی تقریر ٹیلی کاسٹ نہ کی جا سکی تو اتنے خط آئے۔ اگر تقریر ٹیلی کاسٹ ہو جاتی تو پھر کتنے آتے؟"

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ "انسان زبان کی اوٹ میں چھپ سکتا ہے۔" مگر علامہ صاحب نے زبان خود کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی۔ میرے دوست "ف" کے بقول بندہ خواب زادہ طاہر القادری صاحب کا انٹرویو کرنے جائے تو واپس آ کر اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ تو ڈکٹیشن لے کر آیا ہے۔ وہ اکیلے چار آدمیوں جتنا کام کرتے ہیں۔ آپ ان کو کھانا کھاتے دیکھ لیں تو اس کا یقین بھی آ جائے گا۔ کمزوری محسوس ہو تو گوشت کی کڑاہی منگا لیں گے اور ایک منٹ میں ختم ہو جائے گی۔ آپ سوچتے ہوں گے کمزوری' جی نہیں' کڑاہی۔

وہ دوسروں کے ہاتھوں استعمال نہیں ہوتے' خود اپنے ہاتھوں استعمال ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں مجھے اقتدار پسند نہیں۔ ویسے ان کے طریقہ کار سے واقعی یہی لگتا ہے کہ وہ کبھی اقتدار حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ ڈاکٹر اسرار احمد کہیں کہ مجھے اقتدار پسند نہیں تو بندہ سمجھتا ہے' اپنے بھائی اقتدار احمد کی بات کر رہے ہیں۔ جبکہ علامہ صاحب تو اسی کی خاطر سیاست برد ہوئے۔ پاکستان عوامی تحریک کی بنیاد رکھی جس میں تحریک تو ہے مگر عوام نہیں۔ ۱۹۹۰ء کے ضمنی انتخابات میں ایک امیدوار عوامی تحریک کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش میں تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔ "میرے حساب سے مجھے الیکشن جیتنے کے لیے نو دس ووٹ اور چاہئیں۔" علامہ صاحب کہتے ہیں میرے پاس جو ہو' وہ تقسیم کر دیتا ہوں۔ واقعی ان کے پاس جو ووٹ تھے' انہوں نے وہ تقسیم کر دیئے۔

ان کی تحریک کا نعرہ ہے۔ "جوانیاں لٹائیں گے' انقلاب لائیں گے" مگر کہتے یوں ہیں "جوانیاں لوٹائیں گے' انقلاب لائیں گے" جو اچھا بھلا کسی حکیم کا اشتہار لگتا ہے۔ علامہ صاحب پارٹی کے لیے یتیموں اور بیواؤں سے چندہ نہیں لیتے۔ اس لیے جو انہیں چندہ نہ دے' اسے بیوہ اور یتیم سمجھتے ہیں۔

سیلف میڈ ہیں‘ یہاں تک کہ علامہ اور پروفیسر بھی سیلف میڈ ہیں۔ ڈاکٹر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو علاج کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو خود قابل علاج ہوتے ہیں۔ مولانا خواب زادہ علامہ فی الفور صاحب کے والد صاحب انہیں علاج کرنے والا ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں‘ مگر موصوف کو میڈیکل کالج میں داخلہ نہ مل سکا۔

مولانا وہ مرد ہیں جنہوں نے زنانہ وار لکھا۔ وہ جتنی کتابوں کے خود کو مصنف بتاتے ہیں‘ صرف ان کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک کتاب بن جائے۔ وہ دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لکھتے ہیں۔ کسی نے پوچھا۔ ”آپ اتنا لکھنے کے بعد کیا محسوس کرتے ہیں؟“ تو میرے دوست ”ف“ نے کہا۔ ”اتنا لکھے کے بعد تو بندہ محسوس کر ہی نہیں سکتا۔“ فرماتے ہیں‘ مولانا مودودی کی جتنی تحریریں میں نے پڑھی ہیں‘ اتنی مولانا مودودی نے خود اپنی تحریریں نہ پڑھی ہوں گی۔ علامہ صاحب کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ مقام اپنی ذاتی کوششوں سے حاصل کیا‘ جیسے ہمارا دوست ”ف“ اپنی ذاتی کوششوں سے اس مقام پر ہے کہ وہ اپنے سات بھائیوں میں اکیلا سید ہے۔ علامہ صاحب خود اس فرقے سے ہیں جو فرقہ بندی کے خلاف ہے۔ انہوں نے زندگی میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا۔ اگر کیا ہے تو وہ اپنا نہ ہو گا۔ ہر کام ترتیب سے کرتے ہیں۔ وہ تو بے ترتیبی بھی ترتیب سے کرتے ہیں۔

اگر وہ کہیں کہ مجھے خوبصورت چہرہ دیکھے دیر ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انہیں شیشہ دیکھے گھنٹہ ہو گیا ہے۔ ان کی شخصیت میں انفرادیت ہے۔ یہی انفرادیت انہیں اجتماعیت نہیں لانے دیتی۔

○○○

• ٹی ہاؤس کا سرحدی گاندھی

ٹی ہاؤس کو شاعروں ادیبوں کا دل کہتے ہیں۔ دل میں تو سارے جسم کا گندہ خون اکٹھا ہوتا ہے اور صاف ہو کر نکلتا ہے مگر یہاں جو کچھ جیسا اکٹھا ہوتا ہے ویسا ہی نکلتا ہے۔ ٹی ہاؤس کے سرحدی گاندھی کا یہاں وہی مقام ہے جس مقام پر آ کر وہ روزانہ بیٹھتا ہے لگتا ہے وہ پہلے اپنی "جائے مخصوصہ" پر بیٹھا تھا' ٹی ہاؤس بعد میں اس کے ارد گرد تعمیر کیا گیا ہے۔ اگر اسے آپ یہاں کے علاوہ کسی اور جگہ دیکھیں تو یقین کر لیں ارد گرد کہیں مشاعرہ ہو رہا ہوگا۔ ٹی ہاؤس میں آجتک اس نے کسی کو اپنے خلاف بات کرنے کا موقع نہیں دیا یعنی سب سے پہلے آتا ہے اور سب سے آخر میں جاتا ہے۔

شکل و صورت کسی بڑے شاعر سی لگتی ہے جبکہ شاعری اس کی اپنی ہی لگتی ہے۔ پندرہ بیس سال پہلے بھی وہ اتنا ہی بوڑھا تھا جتنا آج ہے لیکن چند سالوں بعد ایسا ہی ہو جائے گا جیسا پیدا ہوتے وقت تھا۔ یعنی نہ منہ میں دانت نہ سر پر بال۔ چلتے وقت خود ایک قدم اٹھاتا ہے تو ہاتھ میں پکڑا بیگ دو قدم۔ پاؤں زمین پر یوں رکھتا ہے جیسے ہر قدم پر پاؤں سے سگریٹ بجاتا ہوا آ رہا ہے۔ نیت' جیب' دل اور داڑھی مونچھیں ہمیشہ صاف ہوتی ہیں۔ ہونٹوں پر اپنے کالم کی سرخی' آواز میں حکم' الفاظ میں گزارش۔ ہنس رہا ہو تو لگتا ہے مچھلی پانی سے منہ نکال کر سانس لے رہی ہے۔ رنگ ڈھنگ ٹریفک کی اس بتی جیسے جو روکتی ہے نہ جانے دیتی ہے۔ دنیا کی طرح گول سر جس پر بالوں کی بجائے پی کیپ اگی ہوئی ہے۔

سلام لیتے وقت ہاتھ یوں بے دلی سے بڑھاتا ہے جیسے گرفتاری دے رہا ہو۔ بلاؤ تو یوں دیکھے گا جیسے آپ نے کچی نیندرے اٹھا دیا۔ غصے میں اس کا سر یوں ہلنے لگتا ہے جیسے

ابلتے پانی کی کیتلی کا ڈھکنا۔ اپنی بات کو آخری بات سمجھتا ہے۔ دوسرے بھی یہی سمجھتے ہیں کہ آخری بات کر رہا ہے۔ اس کے ارد گرد بیٹھے لوگ یوں چپ ہوتے ہیں جیسے تعزیت کرنے آئے ہوں۔

پڑھنے کا اس قدر شوق ہے کہ ہر نئے لکھنے والے کو کہتا ہے کہ مجھے اپنی تحریریں پڑھا لیا کرو۔ اپنے بارے میں لکھی گئی تحریروں کو اچھا سمجھتا ہے اور کہتا ہے اردو ادب میں بہت کم اچھا لکھا گیا۔

مشاعرے کا سن کر اس کے چہرے پر وہی رونق آ جاتی ہے جو دکانوں پر کلیرنس سیل کے موقع پر۔ وہ بادشاہ تو نہیں بادشاہ گر ضرور ہے مگر شوق بادشاہوں والے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ وہ فوجیں لڑاتے تھے یہ الیکشن لڑاتا ہے۔ پہلی لڑائی میں جان جاتی ہے اس میں عزت جاتی ہے۔

کہتے ہیں، جنس کا قدرتی راستہ بند کر دیا جائے تو یہ پورے بدن کو راستہ بنا لیتی ہے۔ یہی نہیں وہ باتوں اور تحریروں میں بھی آ جاتی ہے لیکن اس نے ناکام زندگی بڑی کامیابی سے گزاری ہے۔ آج بھی عورت کے ذکر پر وہی کچھ کرتا ہے جو عورتیں اس کے ذکر پر کرتی ہیں یعنی چپ ہو جاتا ہے۔

بہت جلد ناراض ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو ناراض پہلے ہو جاتا وجہ ناراضگی بعد میں ڈھونڈتا ہے اس قدر حسن ظن سے کام لیتا ہے کہ تعاقب کرنے والے کو بھی سمجھتا ہے تقلید کر رہا ہے۔ اسے تو دشمن کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ اس کا دوست بن چکا ہوتا ہے۔

ہمیشہ وہ بات کرتا ہے جسے صحیح سمجھتا ہے اس لیے غلط بات کر رہا ہو تو سمجھ لیں صحیح سمجھ کر رہا ہے۔ جتنے سالوں کے بعد اس کی شاعری کی کتاب آئی ہے اس سے لگتا ہے کہ لکھنے میں فی غزل نو مہینے لگے ہوں گے۔

اس نے نظریہ کو نذریہ نہیں بنایا۔ اپنے اصولوں کے مطابق زندگی گزاری۔ ان اصولوں نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ریشم کا ریشہ اپنے خالق کے ساتھ کرتا ہے۔ کٹر

ترقی پسند ہے۔ برابری کا اس قدر قائل ہے کہ اس نے اپنے کالم سے کالم نگار اور رپورٹر کے فرق کو ختم کر دیا۔ کہتے ہیں کسی کو بیوقوف بنانے کا سب سے آسان طریقہ

یہ ہے کہ اسے عقلمند کہنے لگے اور وہ اپنے کالم میں سب کو عقلمند ہی کہتا ہے۔ اپنی گفتگو میں "لکھ دیا" اتنا استعمال کرتا ہے کہ نیا آدمی اسے کاتب سمجھنے لگتا ہے۔ ویسے بھی یہ لکھنے کا دور ہے' اب تو ادب کا صرف ایک ہی ریڈر رہ گیا ہے وہ ہے پروف ریڈر۔

مستقل مزاج ایسا کہ آج بھی وہیں ہے جہاں برسوں پہلے تھا بقول شخص وہ اوکاڑہ کا لینن رہ چکا ہے بلکہ ایک لحاظ سے تو لینن بھی اس سے رہ گیا ہے کہ وہ مر چکا اور یہ ابھی زندہ ہے لیکن اس کی بد قسمتی یہ ہے کہ یہ ہارے ہوئے لشکر کا بہادر سپاہی ہے۔ ظاہر ہے اس کی عزت افزائی تو نہیں ہو سکتی نا۔

○○○

• چن جی

یاور حیات جب پرسوں کی پوٹلیاں لٹکائے ٹی وی اسٹیشن داخل ہوتا ہے تو لگتا ہے کوئی بنجارہ نہ ختم ہونے والے سفر پر ہو۔ دور سے دیکھنے پر اس سے ہمدردی ہوتی ہے اور

اس کا بوجھ ہٹانے کو دل چاہتا ہے مگر اس کے قریب ہوتے ہی اپنے بوجھ اترتے محسوس ہوتے ہیں۔

اس کا قد ایسا کہ بندہ اس سے باتیں کر رہا ہو تو لگتا ہے آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ چال ہماری قومی چال کی طرح یعنی اتنا چلتا نہیں جتنا جگہ جگہ رکا رہتا ہے۔ کہتے ہیں جو سگریٹ پیتا ہے وہ جھوٹ نہیں بولتا اور یاور سگریٹ پیتا ہے۔ دوران گفتگو سگریٹ کو انگوٹھے اور انگشت شہادت میں پکڑ کر اسے یوں دیکھتا رہتا ہے جیسے آپ سے نہیں سگریٹ سے ہم کلام ہو۔ گفتگو کرتا ہوا لگتا ہے ٹی وی مذاکرے میں حصہ لے رہا ہے۔ یعنی کسی کی نہیں سنتا بس اپنی ہی سناتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ بھی انگریزی بولتا ہے جنہیں انگریزی لکھنا پڑھنا تو درکنار انگریزی سننا بھی نہیں آتی لیکن اس سے عجیب بات یہ ہے کہ وہ اس کی بات سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

وہ کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا ہے۔ وہ بات شروع تو دوسروں کے لیے کرتا ہے مگر باتیں کرتا کرتا خود کلامی پر اتر آتا ہے اور اپنے ساتھ گفتگو کرنے لگتا ہے اس گانے والی کی طرح جو ایک مقام پر پہنچ کر گانے میں اس قدر کھو جاتی ہے کہ پھر سامعین سے بالا تر ہو کر اپنے لیے گاتی ہے۔ ڈرامے کے حوالے سے یاور کا میڈیم ڈائیلاگ ہے لیکن اس کا ذاتی میڈیم مونو لاگ ہے۔ وہ اپنے سننے کے لیے باتیں کرتا ہے۔

اس میں اس قدر خود اعتمادی ہے کہ اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اس نے ہر قسم کی

برائی کی ہو گی مگر کسی کی برائی کبھی نہیں کی۔ ٹی وی میں ہوتے ہوئے بھی یاور حیات بڑا پر امن آدمی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وقت اپنے آپ سے جو لڑتا رہتا ہے ٹی وی کے لیے اس کی کوئی چیز اگر قابل اعتراض ہے تو وہ اس کی ذہانت ہے۔

عورتوں کی اس قدر عزت کرتا ہے کہ مشکوک لگتا ہے اسے ہر وہ چیز پسند ہے جس سے پہلے مس آئے۔ چاہے وہ مس کاسٹ ہی ہو۔ اس کا چہرہ اداکار کا‘ کان موسیقار کے‘ نظر شاعر کی‘ زبان صوفی کی‘ دماغ فلسفی کا اور دل طوائف کا ہے۔ مسلمان ہے مگر کافر جسم پسند کرتا ہے۔

اس کی تلاشی لی جائے تو اس کے پرسوں‘ جیبوں اور کمرے سے دوسروں کے وزٹنگ کارڈ ہی نکلیں گے مگر اس کا اپنا وزٹنگ کارڈ نہیں۔ وزٹنگ کارڈ کو یاور حیات کی ضرورت ہو تو ہو یاور کو اس کی ضرورت نہیں اس کی جیبوں میں اتنے قلم ہوتے ہیں کہ لگتا ہے قلم بیچتا بیچتا ٹی وی آ نکلا ہے۔ حالانکہ وہ صحافی کبھی بھی نہیں رہا۔ اسے سونف کھلانے کا بہت شوق ہے جس کی اس قدر اذیت بتائے گا کہ آپ پریشان ہو جائیں گے کہ اتنی دیر سے سونف کے بغیر زندہ کیسے ہیں؟

یاور حیات ڈرامہ نگار بھی ہے۔ اس نے منو بھائی سے لے کر محمد یونس بٹ تک کے کئی ناموں سے ڈرامے لکھے۔ کسی قسم کی پابندی پسند نہیں کرتا‘ چاہے وہ پابندی وقت ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ جس دن وقت پر پہنچ جائے لوگوں کو پریشانی ہونے لگتی ہے کہ اللہ کرے خیر ہو۔ جب یاور اپنے کمرے میں ہو تو ٹی وی کے تمام راستے اس کے کمرے کی طرف جانے لگتے ہیں۔ وہاں اس قدر ٹیلیفون آتے ہیں کہ نیا آدمی سمجھتا ہے وہ غلطی سے ٹیلیفون ایکسچینج میں آ بیٹھا ہے۔

یاور حیات نے اپنے فن سے ناظرین اور ناراضگین کی پوری نسل پروان چڑھائی ہے کہتا ہے پروڈیوسر گھڑی باندھ لے تو وہ کلرک بن جاتا ہے وقت پر آنے والا۔ شاید اسی لیے وہ پروڈیوسر جو گھڑی دیکھ کر ریکارڈنگ کرتے ہیں ان کے پروگرام دیکھنے والے بھی

بار بار گھڑی ہی کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔
یاور کا بڑا نام اس لیے نہیں کہ خدا نے اسے بڑی صلاحیتیں دیں۔ بلکہ اس لیے کہ اس نے یہ صلاحیتیں خود کو منوانے کے لیے صرف نہیں کیں۔ اس کا مقصد متاثر کرنا نہیں شاید اسی لیے متاثر کرتا ہے۔
وہ کھٹر قبیلے کا فرد ہے جس کے لوگ بڑے جاگیردار' جنگجو اور دشمن کو معاف نہ کرنے والے کو معاف نہیں کرتا حالانکہ معاف کر دینے سے سخت انتقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ایک دم مد مقابل کو گھٹیا اور خود کو عالی ظرف ثابت کر دیتے ہیں مگر وہ سزا دیتا ہے' نہ معاف کرتا ہے یہ تو اس کا قد ہے جو اسے دوسروں کے واروں سے بچاتا رہتا ہے۔
خطرناک آدمی ہے' پتا نہیں چلنے دیتا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ مزید خطرناک ہے کیونکہ اسے پتہ ہوتا ہے کہ دوسرا کیا سوچ رہا ہے۔ مجھے اگر کوئی اپنی پسند کا دشمن چننے کے لیے کہے تو میں یاور حیات کا نام لوں گا کیونکہ اچھے دوست تو مل جاتے ہیں مگر اچھا دشمن کہاں ملتا ہے۔ یاور بڑا مخلص دشمن ہے' دشمنی ختم نہیں کرتا شاید اسی لیے دشمن کو ختم نہیں کرتا۔

○○○

• تھانیدار صحافی

دور سے تھانیدار قریب سے صحافی اور گھڑی پاس بیٹھ جائے تو کچھ بھی نہیں لگتا۔ آپ اسے الٹا ہو کر دیکھیں تو بڑا سیدھا سادہ آدمی ہے۔ اسے بچپن ہی سے صحافی بننے کا اس قدر شوق تھا کہ امتحان میں سب سے پہلے وہ سوال حل کرتا جس میں ہوتا کہ فلاں کی تعریف کرو۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق (یاد رہے مصدقہ اس کی مونث نہیں) ہر وقت ہوٹل ہلٹن میں رہتا ہے صرف اس وقت باہر آتا جب کھانا کھانا ہو۔ قمیض کی جیبیں اتنی بڑی کہ پیٹ بھرا ہوا ہو تو پھر بھی کھانے کی تقریبات میں شرکت کر سکتا ہے۔ دکھاوے کا بالکل قائل نہیں۔ اپنے آپ کو اس قدر چھپا کر رکھتا ہے کہ کیا مجال گفتگو اور حرکات سے پتہ چلنے دے کہ وہ پڑھا لکھا ہے۔ ہمارے ہاں صحافیوں کو اگر کچھ آتا ہے تو وہ صرف غصہ ہے۔ اسے یہ بھی نہیں آتا۔ ہنستا ہوا لگتا ہے پنجابی فلم کی ڈبنگ کرا رہا ہے یا کسی نے بے خیالی میں سکوٹر کو کک دے ماری ہے۔ آواز ایسی کہ ٹیلیفون کر رہا ہو تو دوسرا کہتا ہے یا ٹیلیفون بند کر دو تمہاری آواز پہنچ رہی ہے۔

اس نے لطیفوں کی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے' یہ اس کا بڑا حوصلہ ہے کیونکہ اپنے بارے میں سچ لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ لکھتے وقت وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتا یہاں تک کہ اپنا لحاظ بھی نہیں کرتا کہ لوگ کیا کہیں گے کیا لکھا ہے! خود اعتمادی اس قدر کہ ہر موضوع پر غلط رائے دے سکتا ہے۔ "آرٹس نامہ" لکھتا ہے جو اکثر مارشل آرٹس نامہ ہوتا ہے۔ ٹی وی پروگراموں پر تبصرے بھی لکھتا ہے بلکہ تبصرے ہی لکھتا ہے۔ ٹی وی والے اس کے اس قدر خلاف ہیں کہ ان کا بس چلے تو اسے دوبارہ وہی پروگرام دکھائیں۔

سارا دن دوسروں کو حال یوں پوچھتا پھرتا ہے جیسے عیادت کر رہا ہو۔ دن میں دس بار

اس سے ملو تو وہ ہر بار یوں ملے گا جیسے برسوں بعد مل رہا ہے اور برسوں بعد یوں ملے گا جیسے روز ملتا آ رہا ہے۔ ہر کسی کو برابری کی سطح پر ملتا ہے' یہاں تک کہ مانگنے والوں کو بھی برابری کی سطح پر ملتا ہے۔ اندر بیٹھا کسی سے گفتگو کر رہا ہو تو باہر والے سمجھتے ہیں اندر جلسہ ہو رہا ہے۔ سنجیدہ بات کرے تو لگتا ہے جھوٹ بول رہا ہے۔ کوئی بات اچھی لگے تو قہقہہ لگاتا ہے' اگر کوئی بات بری لگے تو پھر بھی قہقہہ لگاتا ہے۔ اسی لیے کبھی پتہ نہیں چلا کون سی بات اسے اچھی لگی کون سے بری۔

وہ ایک کثیر القلت پرچہ بھی نکالتا ہے جس کا مدیر' رائٹر' پروف ریڈر' ہاکر یہاں تک کہ اس کا دفتر بھی وہ خود ہی ہے۔ اس پرچے پر زیادہ سے زیادہ پرچہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ کہتا ہے میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ صحیح کہتا ہے پرچوں میں بھرا بریف کیس اٹھا اٹھا کر اس کے ہاتھ لمبے ہو گئے ہیں۔

خوش مذاق ہے یعنی خود ہی مذاق کرتا ہے اور خود ہی خوش ہوتا ہے۔ باتیں کرتے وقت ہاتھ ملتا رہتا ہے اور ہاتھ ملنے کی رفتار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑکی سے باتیں کر رہا ہے یا لڑکے سے۔

لڑکیوں کو یوں دیکھتا ہے جیسے آنکھوں سے ان کا ایکسرے کر رہا ہو۔ لڑکی دیکھتے ہی اس کا دل بے عزت ہونے کو چاہنے لگتا ہے اگر وہ کسی لڑکی کو آواز دے اور وہ نہ آئے تو سمجھ لیں لڑکی نے اس کی آواز سن لی ہے۔ شادی شدہ عورتوں کے ساتھ یوں Behave کرتا ہے جیسے کسی مس کے ساتھ کرتا ہے یعنی مس بی ہیو کرتا ہے۔ آج تک میں نے ایسی عورت نہیں دیکھی جسے وہ ناپسند کر سکے۔ جیسے ڈاکٹروں کو تندرست آدمی اچھے نہیں لگتے صحافیوں کو نارمل حالات اچھے نہیں لگتے لیکن اسے دوسروں کو نارمل دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ چلو دوسرے تو نارمل ہیں۔

اس کا سکوٹر اس کا ہم راز و ہم آواز ہے۔ سکوٹر ساتھ نہ ہو تو لگتا ہے گھر سے ننگا ہی نکل آیا اور اگر وہ راستے میں خراب نہ ہو تو گھبرا کر دیکھنے لگتا ہے کہیں یہ کسی اور کا تو نہیں۔ اس پر یوں بیٹھتا ہے جیسے گھوڑے پر بیٹھا ہو' اسے بریکوں کی بجائے

پاؤں سے روکتا ہے۔ اسی لیے اگر کہے کہ وہ بریکیں ٹھیک کرانے جا رہا ہے تو سمجھ لیں جوتوں کو تلوے لگوانے جا رہا ہے۔

اپنے سارے کام خود کرتا ہے یہاں تک کہ اپنی تعریف بھی خود ہی کرتا ہے۔ البتہ دوستوں کو سستی شہرت دیتا ہے جو انہیں مہنگی پڑتی ہے۔ زندگی یوں بتا رہا ہے جیسے کسی اور کی ہو۔ اپنے گھر اتنی مدت کے بعد جاتا ہے کہ گھر والے دروازہ کھول کر پوچھتے ہیں' جی! کس سے ملنا ہے؟ خوشحال ہے یعنی حال پر خوش ہے۔ کسی کا برا نہیں سوچتا۔ اگر کسی کا برا کرے تو یقین کر لیں سوچنے والا پیچھے کوئی اور ہے۔

کھیلوں میں اسے ہارنا سب سے اچھا لگتا ہے۔ میرے نزدیک ہارنے والا جیتنے والے سے کہیں زیادہ قابل احترام ہے کہ جیتنے والا دوسرے کو دکھ دیتا ہے جبکہ ہارنے والا دوسرے کو خوشیاں۔ یہ اس کی شخصیت کا وہ روشن پہلو ہے جس کی روشنی میں مجھے دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ کیرم کھیلتا ہے شطرنج اس لیے نہیں کھیلتا کہ اس میں سوچنا پڑتا ہے اور کیرم میں اس کی ساری کوشش مخالف کو جتانے کی ہوتی ہے کیونکہ وہ دوسروں کو خوش دیکھنا چاہتا ہے اپنی جیت پر خوش ہوتے تو میں نے ہر کسی کو دیکھا ہے اپنی ہار پر خوش ہوتے صرف اسی کو دیکھا ہے جو دوسرے کی خاطر ہار سکتا ہے اس سے اچھا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ بڑے مقدر والے ہیں جن کا ایسا دشمن ہے۔

○○○

• سی می

کہتے ہیں بچوں میں بس ایک ہی برائی ہے کہ وہ بچے نہیں رہتے۔ لڑکی بڑی ہو جائے تو والدین کو یہ ڈر لگ جاتا ہے کہ اب وہ اس گھر سے رخصت ہو جائے گی اور لڑکا بڑا ہو تو یہ ڈر کہ اب وہ اس گھر سے رخصت کر دے گا۔ لیکن سیمی وہ بچی تھی جو ہمیشہ بچی رہی اس کے اصل نام کا تو مجھے علم نہیں مگر وہ ہر کسی کو یوں دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو سی می۔

اگر لفظ "محبت" کی تصویر بنائی جائے تو ہوبہو "سی می" جیسی ہو گی۔ وہ چار برس میرے کمرے میں رہی اور مسکراتی رہی۔ مسکراہٹ محبت کا پہلا لفظ اور بچے کی مسکراہٹ اس دنیا کا پہلا سچ ہے۔ گفتگو کا سہارا تو انسان نے جھوٹ بولنے کے لیے لیا اسی لیے بچہ مسکرانا تو پیدا ہوتے ہی سیکھ جاتا ہے مگر اسے بولنا سکھانا پڑتا ہے یوں بھی یہ دنیا کو انتظار نہ رہا اس دن یہ دنیا نہ رہے گی۔ سیمی میرے کمرے میں آنے والے ہر شخص کا مسکرا کر یوں استقبال کرتی جیسے اسی کا انتظار کر رہی ہو آپ کمرے میں جہاں بھی بیٹھتے یہی لگتا کہ آپ ہی کو دیکھ رہی ہے۔ بلکہ ہر کوئی یہی سمجھتا کہ صرف اسے دیکھ رہی ہے۔

اس سے پہلے اس کمرے میں جو اسٹوڈنٹ رہتا تھا اس نے کمرے میں اتنی تصویریں لگا رکھی تھیں کہ کوئی تصویر بھی دوسری تصویر کو دیکھنے نہ دیتی۔ ایسے ہی جیسے قوالی میں بہت سے گانے والے مل کر یوں گاتے ہیں کہ ایک دوسرے کو گانے نہیں دیتے۔

تصویریں ایسی تھیں کہ دیکھنے والے کا دایاں پاؤں وہاں پڑتا جہاں اس کا بایاں پڑنا چاہیے۔

وہ کہتا میں نے کمرے میں یہ تصویریں اس لیے لگائی ہیں کہ سنا ہے جہاں ایسی تصویریں ہوں وہاں فرشتہ نہیں آتا اور جا کر کم از کم یہ تو نہیں بتاتا کہ ہم یہاں کیا کرتے ہیں۔ ان میں اکثر لڑکیوں کی تصویریں زندہ لگتیں' یعنی وہ ایسے ہی دیکھ رہی تھیں جیسے

زندہ لڑکیاں اسے دیکھتی ہیں یعنی بادل نخواستہ۔ ان میں ایک انڈین ایکٹرس کی تصویر تھی۔ جس کا صرف سر پانی سے باہر تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے تالاب پہن رکھا ہو اور وہ ڈبونے والی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ کہتا کمرے میں کسی پاکستانی ہیروئین کی تصویر اس لیے نہیں لگا سکا کہ ہوسٹل کے کمرے چھوٹے ہیں۔

ایک خاتون تصویر میں انگریزی گانا یوں گا رہی تھی کہ دیکھنے والے کے ہاتھ فوراً کانوں تک پہنچ جاتے۔ اس نے ایک مرد کو پہن رکھا تھا۔ صرف وہی حصے نظر آ رہے تھے جہاں مرد نے حصہ نہیں لیا تھا۔ گانا گاتے وقت اس خاتون کے چہرے پر وہی کرب تھا جو ہمارے ہاں سننے والے کے چہروں پر ہوتا ہے۔ میرے دوست "ف" کو انگریزی نہیں آتی مگر اسے انگریزی گانے بہت پسند ہیں۔ کہتا ہے اس کا فائدہ ہے کہ بندہ تمام انگریزی گانوں سے ایک جیسا لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یوں بھی انگریزی گانوں کا یہ فائدہ ہے کہ گانا سمجھ میں آئے نہ آئے گانے والی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ انگلش میوزک اور مشرقی پکے راگوں میں یہ فرق ہے کہ انگلش میوزک بجانے والے خود اچھلتے کودتے ہیں۔ ان کا خون کھول رہا ہوتا ہے۔ جبکہ پکے راگ سنانے والے خود تو آدم سے بیٹھے ہوتے ہیں باقی کام سننے والے کر رہے ہوتے ہیں۔

ایک تصویر میں مرد عورت کو بڑی شیر خوار نظروں سے دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں سے لگتا تھا اس نے آنکھوں میں سرمے کی بجائے لپ اسٹک لگا رکھی ہے دونوں میاں بیوی لگتے مگر "ف" کہتا ہے میاں بیوی ہیں مگر میاں کسی کا ہے اور بیوی کسی اور کی کیونکہ ہمارے ہاں عورت اپنے مرد کو اس وقت اپنے مرد کو اس وقت تک اتنے غور سے نہیں دیکھتی جب تک اس پر شک نہ ہو۔

اس کمرے میں ایک خاتون کی بہت بڑی تصویر بھی تھی جسے "ف" ایک خواتین کی تصویر کہتا۔ وہ برتھ ڈے سوٹ میں تھی یعنی اس کے جسم پر دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لڑکے ان انگریزی تصویریں کو سج کرکے دیکھتے۔ پھر ایک دن ہوسٹل وارڈن

نے اس کمرے میں چھاپا مارا اور لڑکے کو ہوسٹل سے نکال دیا البتہ تصویریں وہیں رہیں پھر جب میری اس کمرے میں الاٹ منٹ ہوئی۔ میں نے یہ تصویریں کمرے سے ذہن میں اتار لیں۔ انہی دنوں میں نے سیمی کو انارکلی میں دیکھا تو مجھے لگا میں نے اسے پہلی بار سے پہلے بھی دیکھا ہے اور یہ تصویر لا کر کمرے میں لگا دی "ف" کہتا ہے اس تصویر کی موجودگی تمہاری عمر کی وجہ سے ہے کہ بڑھاپے میں بچے ہی اچھے لگتے ہیں۔ اس عمر میں تو دل بھی اس عورت پر آتا ہے جو بچوں والی ہو۔ ٹھیک کہتا ہے' بڑھاپا دو عمروں کے فرق کا نام ہے ہم عمر جس عمر کے بھی ہوں جب ملیں گے ان میں کوئی بوڑھا نہ ہو گا۔ سیمی کی موجودگی میں واقعی میرے اندر ایک باپ پیدا ہو گیا تھا۔ سیمی کے ہاتھوں کا رنگ ایسا تھا جیسے دودھ میں شہد ملا ہو اور چہرے کا رنگ ایسا جیسے شہد میں دودھ ملا ہو یوں شرارتی انداز سے مسکراتی جیسے ابھی کھلکھلا کر ہنس دے گی۔ اور آدمی بے اختیار اس کی ہنسی کا انتظار کرنے لگتا۔

میں اسکی تصویر دیکھتا تو مجھے اپنا چہرہ نظر آتا۔ آئینہ دیکھتا تو اس کی تصویر نظر آتی سارا کمرہ اس کے چہرے سے بھرا رہتا یوں بھی بچے تو پاؤں سے لے کر سر تک چہرہ ہی چہرہ ہوتے ہیں۔ میں اس کو مسکراتا ہوا دیکھ کر مسکراتا تو یوں لگتا جیسے اس سے گفتگو ہو گئی ہو۔

ایک روز سیمی مجھ سے دور ہو گئی وہ دوست جس کی غلطی کی وجہ سے یہ تصویر پھٹی تھی اسے میری حالت کا پتا چلا تو اگلے دن کاغذ میں لپٹی ایک تصویر لے کر میرے پاس آیا کہنے لگا' یہ سب میری وجہ سے ہوا سو میں اسی انگریزی ایکٹرس کی تصویر تمہارے لیے خرید کر لایا ہوں۔ بچپن کی تو نہ مل سکی تاہم تمہاری فیورٹ کی تازہ تصویر حاضر ہے' یہ رہی تمہاری سیمی۔ میں نے تصویر دیکھی اس میں ایک عورت سیمی ہی کے کپڑے پہنے کھڑی تھی یعنی صاف لگ رہا تھا اس نے کسی بچے کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ وہ یوں دیکھ رہی تھی جیسے کچھ دیکھ نہیں رہی دکھا رہی ہے میں نے اسے یہ کہہ کر تصویر واپس کر دی کہ میری سیمی تو بچی تھی۔

• سفری شہزادہ

لمبے روٹ پر چلنے والی بسوں پر سفری شہزادہ لکھا ہوتا ہے اور اگر وہ نہ چلتی ہوں تو غیور ڈرائیور اس پر شہزادی لکھ دیتے ہیں۔ شفیق سلیمی بھی سفری شہزادہ ہے۔ اس وقت رکتا ہے جب غزل سنانی ہو۔ بیرون ملک مقیم شادی شدہ شاعر جب واپس گھر آتے ہیں تو آتے ہی ان کا دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ بیوی کو شعر سناتے ہیں اسی لئے شفیق سلیمی سے پوچھو کہ کب آؤ گے؟ تو کہے گا کہ انشاء اللہ اگلی غزل پر۔

کہتا ہے میں "روزی" کی تلاش میں ابو ظہبی گیا۔ مگر اس انداز سے کہتا ہے کہ اچھے خاصے شخص کو بھی "روزی" کے کردار پر شک ہونے لگتا ہے۔ بال بچوں اور بچے بالوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے "میں پاکستان آتا ہی بچوں سے ملنے کے لئے ہوں۔" شاید اسی لئے جب بھی آتا ہے قائم نقوی اور علی اصغر عباس سے ضرور ملتا ہے۔ ہر خاتون کو یوں دیکھتا ہے جیسے اس کی کچھ لگتی ہو جبکہ اجمل نیازی ہر خاتون کو یوں دیکھتا ہے جیسے اس سے کچھ لگتی ہو۔ ابوظہبی میں جب سے بچوں کو پڑھانے لگا ہے' یہ فرق پڑا ہے کہ اب بچوں کو ان کی مائیں سکول چھوڑنے خود آنے لگی ہیں۔

وہ اداکار بھی ہے اس لئے لباس پہننے میں احتیاط برتتا ہے اگر اداکارہ ہوتا تو لباس پہننے سے احتیاط برتتا۔ ایسی ہی ایک اداکارہ نے ڈاکٹر کو کہا کہ انجکشن ایسی جگہ لگائیں کہ کسی کو اس کا نشان نظر نہ آئے تو ڈاکٹر نے کافی دیر سوچ و بچار کے بعد انجکشن چمچ میں ڈال کر اسے دے دیا۔ شفیق سلیمی اچھا اداکار ہے۔ اس نے بغیر کسی ریہرسل کے خاوند کا بہترین رول کیا اور ابھی تک کر رہا ہے۔ جبکہ ہم جیسے تو ابھی تک ریہرسلیں کر رہے ہیں۔ دن میں ایک بار ضرور نہاتا ہے' جس دن کسی شاعر ادیب سے نہ ملے اس دن بھی نہا لیتا ہے۔ اسے تو صفائی اس قدر پسند ہے کہ کالج کے زمانے میں اس

نے ایک ڈرامے میں شاعر کا رول کیا مگر ہر سین میں وکیل صفائی ساتھ رکھا۔

خوش لباس ہے۔ صحافی سوٹ بھی پہنتا ہے۔ یاد رہے صحافی سوٹ وہ ہوتا ہے جس میں جیبیں اتنی بڑی ہوں کہ پیٹ بھرا ہوا تو پھر بھی بندہ کھانے کی تقریبات میں شرکت کرسکے۔ پچھلے دنوں میرے ایک دوست نے صحافی سوٹ سلوایا تو اس میں کوئی جیب نہ تھی۔ اس نے درزی سے وجہ پوچھی تو درزی نے بتایا کہ آپ تو صحافی ہیں آپ نے کونسا کبھی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنا ہوتا ہے۔

شفیق سلیمی سرگوشیوں میں بات کرتا ہے۔ ویسے بھی آپ چاہتے ہیں کہ دوسرا آپ کی بات پر فوراً یقین کر لے تو وہی بات سرگوشی میں کریں دوسرا فوراً یقین کر لے گا اسی لئے جب کوئی جوڑا بیٹھا سرگوشیاں کر رہا ہوتا ہے تو وہ دراصل ملک سے بے یقینی کا خاتمہ کر رہا ہوتا ہے۔

اسے نوکریاں چھوڑنے کا بہت شوق ہے وہ تو اس جگہ نوکری کرتا ہی نہیں جہاں سے چھوڑ نہ سکے۔ شادی پتہ نہیں اس نے کیسے کر لی۔ خالد احمد کے ساتھ مل کر فنانس کمپنی میں بھی کام کیا' اس قدر محنت کی کہ فنانس نہ رہا اور کمپنی رہ گئی۔

شفیق سلیمی دل کا مریض ہے اس لئے ڈاکٹروں نے اسے ورزش کرنے اور عبدالعزیز خالد کی شاعری پڑھنے سے منع کیا ہوا ہے۔ ابوظہبی میں دوستوں کی یوں خاطر کرتا ہے کہ لگتا ہے شفیق سلیمی کے ہاں سے تیل نکلتا ہے۔ یہ ہے بھی ٹھیک دوستوں کی وجہ سے اکثر اس کا تیل نکلتا رہتا ہے۔ اسے خوبصورتی سے پیار ہے جب کسی خوبصورت چہرے کو دیکھنا چاہے تو آئینہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ ہم نے آج تک لوگ اللہ کو پیارے ہوتے ہی دیکھے ہیں خود کو پیارا ہوتے صرف شفیق سلیمی ہی کو دیکھا ہے۔

○○○

• ہیوی ویٹ ہیروئین

ہیوی ویٹ ہیروئین بلا شبہ بڑی سکرین کی سب سے بڑی ہیروئین ہے اتنی بڑی کہ سکرین بعد میں نظر آتی وہ پہلے نظر آ جاتی ہے۔ ڈیل ڈول ایسا کہ بندہ ڈول جائے۔ ایک بار ایک بچہ اسے کافی دیر سے دیکھ رہا تھا تو اس کا باپ تنگ آ کر کہنے لگا' بیٹا جتنی آج دیکھ سکتے ہو دیکھ لو باقی کل آ کر دیکھ لینا۔ وہ آواز کے علاوہ ہر طرح سے بھاری ہے۔

اردو اور پنجابی فلموں کا فرق ان کی ہیروئین سے ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں اردو کی سب سے بڑی ہیروئین بھی اتنی بڑی ہے کہ جب تک اسے کلوز میں نہ دکھایا جائے نظر نہیں آتی جبکہ پنجابی اور پشتو کی ہیروئین کا کلوز لیا جائے تو اس کا کچھ ہی حصہ نظر آتا ہے۔ یہ کون سا حصہ ہے' یہ اس پر منحصر ہے کہ فلم پنجابی ہے یا پشتو۔ ان ہیروئینوں کی سنگل تصویر کھنچوائی جائے تو کھینچنے والا گروپ فوٹو کے پیسے مانگتا ہے۔ تاہم ایسی ہیروئینوں کی وجہ سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ کمزور نظر اور نیت والے آدمی بھی فلمیں دیکھنے لگے ہیں۔

ہماری ہیروئنیں مغرب سے کسی طور کم نہیں۔ وہ دیکھنے میں پھول ہیں' تو یہ پورا گملا' وہ کھانس رہی ہوں تو لگتا ہے ہنس رہی ہیں یہ ہنس رہی ہوں تو لگتا ہے کھانس رہی ہیں۔ لیکن ہیوی ویٹ ہیروئین ہنس رہی ہو تو لگتا ہے ڈانٹ رہی ہے۔ ایسے ہی جیسے شوکت علی گا رہا ہو تو لگتا ہے دھمکیاں دے رہا ہے۔ لیکن ہیوی ویٹ ہیروئین جب مسکرا رہی ہو تو دوسرا یہی سمجھتا ہے بلا رہی ہے۔

پنجابی فلم کا ہیرو بول رہا ہو تو اس کی آواز صاف سننے کے لیے لوگوں کو دور دور ہونا پڑتا ہے لیکن ہیروئین بولے تو قریب آنا پڑتا ہے تا کہ پتہ چل سکے کہ بول رہا ہے یا بول رہی ہے۔

اگر شبنم کی آواز سوز ہے تو ہیوی ویٹ ہیروئین کی آواز ساز۔ شبنم ڈائیلاگ بولتی لگتی ہے حالت نزع میں بیان دے رہی ہے۔ سسکیاں لیتی ہوئی بولتی ہے اگر غمی کا سین ہو تو سسکی کے بعد لفظ ادا کرتی ہے اور اگر خوشی کا سین ہو تو لفظ کے بعد سسکی ادا کرتی ہے جبکہ ہیوی ویٹ ہیروئین ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔ وہ بھی یوں کہ ہنسنے سے ایک منٹ پہلے اس کا جسم ہلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور ہنسنے کے ایک دو منٹ بعد تک ہلتا رہتا ہے۔ البتہ رو رہی ہو تو لگتا ہے پورا محلہ رو رہا ہے۔

اس کا تعلق ایسے گھرانے سے ہے جہاں پیدا ہوتے ہی بچوں کو سب سے پہلے روح کی غذا ملتی ہے۔ دولت اتنی تھی کہ گنتی بھی نوٹوں پر یاد کی۔ اس کے خاندان نے جو شہرت ہیر کو بیاہ کر حاصل کی تھی وہ اس نے بن بیاہے دلوا دی۔ اس کے اداکارہ بننے کی تین وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ فن کی خدمت کرنا چاہتی تھی' دوسری یہ کہ اپنی خدمت کرانا چاہتی تھی اور تیسری یہ کہ ان کے خاندان کی لڑکیاں بڑی ہو کر یہی کچھ کرتی ہیں۔

کوئی عمر پوچھے تو اپنی فلموں کی تعداد بتا کر باتوں میں لگا لیتی ہے۔ خوش مذاق یعنی اپنے مذاق پر بہت خوش ہوتی ہے۔ بزرگوں کی عزت کرتی ہے اس لیے جس کے ساتھ عزت سے پیش آئے اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اسے اپنا بزرگ سمجھ رہی ہے۔

آنکھوں کو شامل کرکے چار زبانیں بولتی ہے۔ اور دنیا کی ہر زبان میں "ہاں" کہہ لیتی ہے۔ گھر میں مادری زبان بولتی ہے۔ فادری اس لیے نہیں کہ ماں کے ہوتے ہوئے باپ کو بولتے ہوئے کب کسی نے سنا ہے۔ مادری زبان صرف اپنوں سے بولتی ہے۔ یہاں تک کہ غیروں کو تو اس زبان میں گالی بھی نہیں دیتی۔

ہماری ہیروئین خوشی غمی ہر دو موقعوں پر گالیاں ہی دیتی ہیں وہ بھی ایسے جیسے ان کی ڈرامائی تشکیل کر رہی ہوں۔ لیکن جیسے فقیر اور انگریزی کی گالی ہمارے ہاں گالی ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اردو کی گالی' گالی کم اور تکیہ کلام زیادہ لگتی ہے اور ملتانی میں گالی دینے

والا تو لگتا ہے گزارش کر رہا ہے۔ ہاں پنجابی میں گالی اتنی ہیوی ہوتی ہے کہ تین چار قتل کروا سکتی ہے۔ اسی لیے وہ غیروں کو پنجابی میں گالی دیتی ہے البتہ کسی کی عزت کرنا ہو تو اردو میں کر لیتی ہے۔

جہاں تک سراپے کا تعلق ہے چھوٹا سا منہ دیکھ کر بندہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے' ٹھینگا دکھاتی ناک' ٹھوڑی بہت تھوڑی' بولتی آنکھیں' سن گن لیتے کان' جو قیمتی زیورات لٹکانے کے خوبصورت ہینگر ہیں' میک اپ میں ظالم' میک اپ کے بغیر مظلوم' رنگ ایسا کہ پاس بیٹھنے والی کو لوگ "گوری" کہنے لگتے ہیں چال ایسی کہ پتہ چل جاتا ہے کہ کہاں سے آئی اور کہاں جا رہی ہے۔ آ رہی ہو تو لگتا ہے دو سمارٹ عورتیں جا رہی ہیں۔ اوقات ملاقاتی ملاقاتی کی اوقات کے مطابق جسے سزا دینا چاہیے اسے ہنس کر دیکھ لیتی ہے اور وہ کئی دن تک سو نہیں سکتا۔

اس کی صحت کا راز کھانے میں نہیں گھرانے میں ہے ان کے گھر جا کر موٹے سے موٹا شخص بھی خود کو پتلا سمجھنے لگتا ہے۔ وہ پینٹ پہن لے تو لگتا ہے دریا کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ لاہور کی آب و ہوا اسے ایسی راس آئی کہ ہر سال اسے وزن کم کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جب تک چپ رہے معزز لگتی ہے' بولنے لگے تو سننے والے خود کو معزز سمجھنے لگتے ہیں۔

فلمی زندگی کا آغاز خوفناک فلم میں دو سین کر کے کیا پھر اردو فلمیں کیں اور ناکام رہی تاہم شباب کیرانوی مرحوم نے ایسا نام ضرور دے دیا جو اس کے پورے رقبے کا احاطہ کر سکے۔ اسٹوڈیو اپنے بزرگ کے ساتھ آتی ہے۔ وہ ساتھ یوں چل رہا ہوتا ہے جیسے اس کی ضمانت کرا کے لایا ہو۔ مذہب سے اس قدر لگاؤ ہے کہ جب بھی باہر گئی عرب ممالک میں ہی گئی۔ ہر وہ نام پسند ہے جو سلطان سے شروع ہو۔

فلموں میں پنجاب کا ائیر کنڈیشن لباس پہنتی ہے۔ رقص کر رہی ہو تو لگتا ہے ورزش کر رہی ہے۔ اداکاری ایسی کہ اس کی ہر اداکاری ثابت ہوتی ہے۔ اس وقت اسٹوڈیو میں اس کے اتنے فین ہیں کہ فلم انڈسٹری فینز انڈسٹری لگتی ہے۔ جس سے پوچھو ہیوی

ویٹ ہیروئین کے بارے میں آپ کا خیال ہے' کہے گا اسی کا خیال ہے۔ وقت کی قدر کرتی ہے' وقت نے بھی اس کی قدر کی ہے خدا اسے مزید بڑھاپے' موٹاپے اور اکلاپے سے بچائے۔

○○○

• ڈاکٹر موت

اگرچہ ڈاکٹر موت اور موت میں بظاہر یہی فرق ہے کہ موت آتی ہے اور ڈاکٹر موت آتا ہے مگر اسے ڈاکٹر موت اس لیے کہتے ہیں کہ جس طرح کسی کو یہ پتہ نہیں موت کب آنی ہے۔ ایسے ہی کوئی نہیں جانتا اس نے کب ڈاکٹر بننا ہے۔ وہ ریاست پٹیالہ کے نواب خاندان سے ہے۔ ریاست ہندوستان میں رہ گئی اب اس کے پاس لے دے کے پٹیالہ ہی بچا۔ اسی لیے وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے پٹیالہ بلاک میں پھرتا رہتا ہے۔ گرتے پڑتے قدموں اور یہی کچھ کرتی پینٹ کو تھامے ادھر ادھر دیکھ رہا ہوتا ہے جیسے ابھی کسی دیوار کی اوٹ میں ہو جائے گا۔

وہ ڈاکٹر انور سجاد کا کلاس فیلو تھا بس انور سجاد ذرا مشہور ہو گیا ورنہ دونوں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ انور سجاد کے افسانے کسی کی سمجھ میں نہیں آتے اور ڈاکٹر موت خود کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کا معاشرے میں وہی کردار ہے جو سرحدی گاندھی کا سیاست میں تھا۔ سرحدی گاندھی باتیں زبان کی ورزش کرنے کے لیے کرتا اسی لیے باتیں سن سن کر لوگوں کو اکثر پسینے آتے رہتے ہیں مگر پنجاب کا یہ عبدالغفار زبان کو صرف چپ رہنے کے لیے استعمال کرتا ہے لیکن جمہوریت کے اس قدر حق میں ہے کہ جس کلاس میں زیادہ لڑکے جا رہے ہوں اسی کلاس میں چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے سیاست شریفوں کا کھیل نہیں شاید اسی لیے کسی کو سیاست دان نہیں مانتا۔

علم حاصل کرنا عبادت ہے شاید اسی لیے آج کل اس کا اجر اس دنیا میں نہیں ملتا۔ ڈاکٹر موت نے پالنے سے پالنے پوسنے کی عمر تک صرف یہی عبادت کی ہے۔ اگرچہ اب وہ عمر کے اس حصے میں ہے جہاں بندہ اپنی عمر بھی بھول جاتا ہے مگر اسے اب بھی پڑھائی کا شوق ہے کہ اس وقت تک کلاس میں بیٹھا رہتا ہے۔ جب تک کوئی بتلا نہ دے کہ لیکچر ختم ہو گیا۔ پچیس سال فائنل ایئر میں رہنے کا ریکارڈ بنا کر وہ پھر فورتھ

ائیر میں آ گیا ہے کیونکہ پہلے پتھالجی کا امتحان فائنل ائیر میں ہوتا تھا اب فورتھ ائیر میں ہونے لگا ہے اسی لیے آج کل دونوں میں سے جو کلاس ملتی ہے "سن" لیتا ہے اور اس انہماک سے جیسے شرفا گانا سنتے ہیں۔ بلکہ کہتے ہیں جس پروفیسر سے ناراض ہوتا ہے اس کی کلاس باقاعدگی سے سننے لگتا ہے۔

ڈاکٹر موت تاریخ کا معمر ترین لڑکا ہے کیونکہ لڑکیاں تو کالج میں آتے ہی خواتین بن جاتی ہیں شاید اسی لیے لکھا ہوتا ہے "کالج برائے خواتین" جبکہ لڑکے کالجوں میں آ کر بھی لڑکے ہی رہتے ہیں اسی لیے ان کو کالجوں کو "بوائز کالج" ہی کہا جاتا ہے۔ اور جب VIVA کے وقت اس کی باری پر چوکیدار کہتا ہے "اگلا لڑکا" اندر جائے تو عبدالغفار کے پیسے پورے ہو جاتے ہیں۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے' وہ اسی فقرے کو سننے کے لیے تو امتحان دیتا ہے۔ ایک بار ممتحن نے اس سے پوچھا اگر تمہارے پاس ایسا مریض آئے جس کے حادثے میں بازو اور ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہوں تو تم کیا کرو گے؟ ڈاکٹر موت نے وقت ضائع کئے بغیر کہا' میں اسے کسی اور ڈاکٹر کے پاس ریفر کر دوں گا۔ اسے پڑھنے کا اس قدر شوق ہے کہ کمرۂ امتحان میں لڑکے لکھ رہے ہوتے ہیں اور یہ پرچہ پڑھ رہا ہوتا ہے۔

اس کا رنگ ایسا کہ ذرا کپڑے پہن لے تو لگتا ہے آج ننگا ہی کالج آ گیا ہے۔ چہرے پر ہمیشہ میل اور عینک اوڑھے رکھتا ہے۔ عینک کے شیشے اتنے موٹے ہوتے ہیں جیسے سردی سے بچنے کے لیے لگا رکھی ہے۔ شخصیت ایسی کہ جس کے پاس آ کر رک جائے وہ جیب سے ٹوٹے پیسے ڈھونڈنے لگتا ہے۔ کچھ کہہ دے تو آدمی حیران ہو جاتا ہے کہ یہ تو بولتا بھی ہے۔ اس کی چال کچھوے کی اور چال چلن خرگوش کا ہے یعنی آہستہ آہستہ چلتا ہے مگر سو سو کر' بلکہ جب تک آپ رک نہ جائیں پتہ نہیں چلتا کہ وہ چل رہا ہے۔

"سیلف میڈ" آدمی ہے یعنی اس نے اپنے آپ کو بگاڑنے میں کسی سے مدد نہیں لی ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کرتا ہے یہاں تک کہ جہاں سے سڑک دو میں تقسیم ہو وہاں کھڑا

ہو کر پہلے فیصلہ کرتا ہے کہ کس طرف کو جانا ہے پھر قدم اٹھاتا ہے اپنی گردن آہستہ آہستہ اس احتیاط سے موڑتا ہے جس احتیاط سے لوگ پرائی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔

اس کے لباس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس جتنے کپڑے ہوتے ہیں اس نے پہن رکھے ہوتے ہیں اور چلتے وقت یوں لگتا ہے جیسے کوئی قد آدم ہینگر پرانے کپڑے لٹکائے پھر رہا ہو۔ ان کپڑوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ مزید میلے نہیں ہو سکتے۔

عبدالغفار اپنے ہم عمروں کو بہت پسند کرتا ہے شاید اسی لیے اس کے کپڑے اور سائیکل بھی اس کے ہم عمروں میں سے ہیں جس طرح بد صورتی عورت کی سب سے بڑی محافظ ہوتی ہے ایسے ہی اس کی سائیکل اپنی بد سیرتی کی وجہ سے "چور پروف" ہے وہ سائیکل پر مصلوب کالج آتا ہے۔ قانون کا اس قدر احترام کرتا ہے کہ سرخ بتی پر فوراً سائیکل کو لٹا کر خود کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ بتی سبز ہوتی ہے تو سائیکل پر دوبارہ سوار ہونے لگتا ہے جب تک وہ دوبارہ سوار ہوتا ہے بتی پھر۔ سرخ ہو چکی ہوتی ہے یوں بھی اسے سرک رنگ سے بہت بڑا پیار ہے (سرخ رنگ سب کو اچھا لگتا ہے بشرطیکہ نوٹ کا ہو)

کالج میں ہمیشہ ایک تھیلا کاندھے پر لٹکائے رکھتا ہے جس کی وجہ سے میرا دوست "ف" یہ بتاتا ہے کہ اس کے گھر تھیلا لٹکانے کی اور جگہ نہیں۔ تھیلے میں ایک کنگھی اور اس کی اپنی لکھی ہوئی کتابیں ہیں یعنی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی جو اس قدر سیاہ ہیں کہ کتابیں کم اور کرتوتیں زیادہ لگتی ہیں۔ کنگھی اس قدر ضعیف ہے کہ شاید ہی اس کے منہ میں کوئی دانت ہو۔

پان کھا کھا کر دانتوں کی یہ حالت ہے کہ آپ انہیں دانتوں کے علاوہ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اونچا سنتا ہے نہ بولتا ہے بس اونچا سمجھتا ہے' ہر کام اپنی مرضی سے کرتا ہے یعنی جس بات پر مرضی ہنس دے جس پر مرضی برا منا لے۔ بعض اوقات اس بات پر ناراض ہو کر اٹھ جاتا ہے کہ آپ اس کی بات پر ہنسے نہیں اور کبھی اس پر کہ

آپ اس کی بات پر ہنسے کیوں؟
لڑکیوں کو اسی نظر سے دیکھتا ہے جس سے وہ اسے دیکھتی ہیں یعنی بادل نخواستہ۔ عورت کا ذکر کرو تو چپ ہو جاتا ہے اس چپ کے پیچھے کتنی عورتوں کی باتیں ہیں کسی کو نہیں بتاتا مگر میرا دوست "ف" کہتا ہے میں شرط لگا سکتا ہوں وہ کسی عورت کے تعاون کے بغیر اس حالت کو نہیں پہنچ سکتا۔ وہ نشہ بھی کرتا ہے بلکہ نشہ ہی کرتا ہے مگر ایسا وضع دار کہ چاہے دو دن سے نشہ نہ کیا ہو پر کیا مجال کسی کو پتہ چلنے دے کہ اس نے نشہ نہیں کیا۔ باتیں کر رہا ہو تو صرف اسے ہی پتہ ہوتا ہے کہ وہ باتیں کر رہا ہے باقی سمجھتے ہیں چیونگم کھا رہا ہے۔
ڈاکٹر موت ترقی پسند ہے' ظاہر ہے ترقی کو پسند ہی کر سکتا ہے۔ ایک زمانے میں ریگل چوک میں ترقی پسندوں کے پوسٹر بھی بانٹا کرتا تھا مگر دکھاوے کا قائل نہ تھا۔ ساری ساری رات پوسٹر لیے کھڑا رہتا جونہی کوئی آدمی نظر آتا وہ فوراً چھپ جاتا کہ کہیں کوئی اسے پوسٹر بانٹتا نہ دیکھ لے۔ وہ کسی کو آرڈر نہیں دے سکتا اسی لیے کنٹین پر بیٹھا ہوا پاس والے کو کہے گا ذرا چائے کا آرڈر تو دینا۔ سگریٹ خود خرید کر نہیں پیتا' کہتا ہے خود خرید کر پینے سے یہ زیادہ نقصان دہ ہوتے ہیں۔
جس طرح اہل امریکہ نے آزادی کے مجسمے کو ایک جزیرے میں قید کر رکھا ہے ایسے ہی عبدالغفار علم کا وہ مجسمہ ہے جس کو چھو کر ہزاروں اہل علم تو گزرے ہیں مگر علم چھو کر نہیں گزرا۔ وہ وہیں ہے جہاں پچیس سال پہلے تھا۔ یہی اس کا اعزاز ہے۔ کہتے ہیں ڈاکٹر بننا اس کی ضد ہے لیکن مجھے تو لگتا ہے ڈاکٹر نہ بننا اس کی ضد ہے۔

○○○

• عباس ... تا ... بش

عباس تابش کو عباس تا بش کہنا ایسا ہی ہے جیسے عباس تا "آسمان" کہنا۔ پھر بش کے پاس امریکہ ہی نہیں ذاتی باربرا بھی ہے اور عباس کے پاس تو ذاتی باربر بھی نہیں بلکہ یہ تو باربر سے ایک شیو کرا لے تو وہ تین کے پیسے مانگتا ہے۔

دور سے ہر کوئی خوبصورت لگتا ہے یہاں تک کہ اپنی بیوی بھی اچھی لگتی ہے اور جب وہ پاس ہوتی ہے تو بندے کو لگتا ہے کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن عباس دور سے یوں لگتا ہے جیسے سیدھا قبل مسیح سے آپ ہی کو ملنے آ رہا ہے۔ ادھر ادھر یوں دیکھتا ہے جیسے آپ کو بھاگنے کا موقع دے رہا ہو مگر جوں جوں قریب آتا ہے' آتا ہی ہے جاتا نہیں۔ اس کی عمر کیا ہے؟ حالانکہ وہ تو عین بچپن میں بوڑھا ہو گیا تھا۔ دیکھنے میں اس عمر کا لگتا ہے جس میں سب سے آسان کام شعر کہنا ہے مگر عباس نے نوجوانوں کے لئے شعر کہنا اتنا مشکل کر دیا ہے جتنی اس نے مشکلیں سہی ہیں۔ اب تو مشکلیں سہہ سہہ کر یہ حالت ہو گئی ہے کہ دوست اسے خوش کرنے کے لئے لطیفہ نہیں سناتے اپنی مشکل سناتے ہیں۔

بیٹھا ہوا ہو تو لگتا ہے جیسے اس نے کبھی کوئی حرکت ہی نہیں کی' البتہ چلنے لگے تو یقین نہیں آتا کہ رکاوٹ کے بغیر رک بھی سکے گا۔ یوں چلتا ہے جیسے ظفر اقبال صاحب کا دماغ چلتا ہے۔

عباس خواتین کے پردے کے اس قدر حق میں ہے کہ عورتوں سے باتیں بھی پردے میں ہی کرنا چاہتا ہے۔ عورتوں کے پاس یوں بیٹھا ہوتا ہے جیسے اعتکاف بیٹھا ہو۔ اتنا ٹھنڈا ہے کہ سخت گرمیوں میں بھی لڑکیوں کو کمبل لے کر اس کے پاس بیٹھنا پڑتا ہے۔

بہرحال اس کا اب یہ فائدہ ہوا ہے کہ جو پہلے گرمیوں میں مری جاتی تھیں اب اس پر مری جا رہی ہیں۔ ویسے وہ بڑا کامیاب خاوند ثابت ہو گا کیونکہ جو خالد احمد کے ساتھ

گزارا کر سکتا ہے وہ ہر قسم کی بیوی کے ساتھ رہ سکتا ہے۔

عباس کا رنگ ایسا ہے کہ نہا کے آ رہا ہو تو لگتا ہے نہانے جا رہا ہے جبکہ یادداشت ایسی کہ غسل خانے کا دروازہ کھول کر بھول جاتا ہے کہ وہ آ رہا ہے یا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو غسل خانے میں بھی جا کر بھول جاتا ہے کہ وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے؟ اور غزل کہہ کر لوٹ آتا ہے۔ آپ کی باتیں سن کر یوں سر ہلاتا ہے جیسے جو بات آپ نے اس کے کان میں ڈالی اسے سر میں مکس کر رہا ہے۔ جب کسی پسند کے بندے سے کلام کرنا چاہے تو خود کلامی کرنے لگتا ہے۔

جسے دشمن نہ بنانا چاہے اسے گہرا دوست نہیں بناتا البتہ دوستوں دشمنوں سب کے ساتھ پیار سے ملتا ہے' اس لئے پتہ نہیں چلتا کہ کس ملنے والے کو دوست سمجھ رہا ہے اور کسے دشمن۔ دوستوں کا اس قدر خیال رکھتا ہے کہ اگر کبھی بیمار ہو جائے تو گھر گھر جا کر ان سے عیادت کرواتا ہے۔ ہر چیز کا حساب غزلوں سے کرتا ہے' ایک دن کسی نے کہا آج مہینے کی پچیس تاریخ ہے؟ اپنی غزلیں گن کر کہنے لگا یہ تو چوبیس ہیں آج پچیس تاریخ کیسے ہو سکتی ہے۔

اسے ملنے کے بعد بھی بندے کی اس سے آدھی ملاقات ہی ہوتی ہے کیونکہ وہ آدھا آپ کے پاس بیٹھا ہوتا ہے اور اس کا نصف کہیں اور ہوتا ہے۔ ابھی تک تو اس کی نصف بہتر بھی کہیں اور ہی ہے۔ انگریزی سے اس قدر لگاؤ ہے کہ اس نے جتنی بار بی اے کا امتحان دیا انگریزی میں پرچہ ضرور دیا۔ کالج میں کلاس فیلوز کے ساتھ یوں پھرتا کہ لگتا بچوں کی فیس معاف کروانے آیا ہے۔ خوش خوراک ہے یعنی خوراک دیکھ کر خوش ہوتا ہے لمبا فاصلہ پیدل طے کرتا ہے اگر زیادہ قریب جانا ہو تو رکشہ لے لیتا ہے۔

وہ بڑا حساس ہے۔ دوسروں سے اکثر اسے ہمدردی ہو جاتی ہے اور اس کے لئے دوسرے کا مصیبت میں مبتلا ہونا ضروری نہیں۔ بس خوبصورت ہونا ضروری ہے اسے دنیا کا ہر خوبصورت انسان مظلوم نظر آتا ہے اور وہ عباس کے پاس بیٹھا ہوا ہو تو واقعی لگنے بھی

لگتا ہے۔

عباس اپنی نسل کے شاعروں میں سب سے آگے ہے مگر وہ وقت دور نہیں جب اس کا پیٹ اس سے بھی آگے نکل جائے گا۔ کہتا ہے اس میں غزلیں ہیں' غزلیں! اگر یہ سچ ہے تو یہ پہلی تخلیق ہے جو مہینوں کی بجائے منٹوں میں یہاں سے نکلتی ہے۔ عباس گا بھی لیتا ہے مگر اس کے گانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دوسرے کو سنائی نہیں دیتا۔ اتنے درد سے گاتا ہے کہ سننے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اسے درد ہو رہا ہے۔

عباس کی دوسری کتاب کا نام "آسمان" ہے جو مجھے اس لئے پسند ہے کہ آسمان کا رنگ بلیو ہوتا ہے اور سنا ہے کہ فلم اور قلم بلیو ہی زیادہ چلتی ہے۔ جہاں تک عباس تا ... بش کی بات ہے تو میں نے دونوں کے نام اس لئے اکٹھے نہیں کئے کہ لوگوں کی عباس کے بارے میں بھی وہی رائے ہے جو بش کے بارے میں ہے بلکہ اس لئے کہ صدر بش "نیو ورلڈ آرڈر" دے رہا ہے تو عباس کی اردو شاعری "نیو ورڈ آرڈر"

○○○

- لا......ہور

نام مردانہ' چال زنانہ اور چال چلن زنانہ۔ لاہور مجھے ہمیشہ ایک تماش بین عورت ہی لگا جو ہندوؤں کے گھر میں پیدا ہوئی تو انھوں نے سمجھا پیدا ہوا ہے اور اس کا نام لاہور رکھا' حالانکہ نام میں کیا رکھا ہے۔ کام دیکھنے چاہئیں' میانوالی ہی کو دیکھ لیں پورے شہر میں نام کے علاوہ شاید ہی کوئی زنانہ چیز ملے۔

میرا دوست "ف" کہتا ہے لاہور بہت معمر ہے۔ جس کی وجہ اس کا ہندو ہونا بتاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بقول ہندو مذہب سب سے پرانا ہے۔ یہ تو اس وقت بھی تھا جب انسان نے کپڑے پہننے بھی شروع نہیں کئے تھے۔ ٹھیک کہتا ہے' ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کو دیکھ لو تو یقین ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں نے اسے باندی بنا کر رکھا۔ شہنشاہ اکبر نے اسے اپنے حرم میں لیا تو اسے چار دیواری کی چادر اوڑھا دی جو انگریزوں نے آ کر اتار دی اور اسے ایسا ہی کر دیا جیسے اپنی بیویوں کو کئے رکھتے ہیں۔ چادر اتری تو وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ اس کا پیٹ پھولنے لگا اور پھول پھول کر بس پھیلاؤ ہی رہ گیا۔

سکھوں نے اسے باندی سے بیسوا بنا دیا۔ سکھ شاہی میں یہ بھی سکھ ہو گئی۔ اور یہ بات کوئی نووارد آنکھیں بند کرکے صرف سونگھ کر بتا دیتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ اگر کوئی صاف ستھرا نظر آتا تو دور سے پتا چل جاتا کہ یہ اجنبی ہے۔ سکھ حکمرانوں نے اسے ایک آنکھ سے دیکھا اور نیت وہی رکھی جو کسی کو ایک آنکھ بند کرکے دیکھنے والے کی ہوتی ہے۔ سکھوں کے دور میں یہاں طوائفوں کا راج تھا اور مسلمانوں کے دور میں طوائف الملوکی۔

حملہ آوروں نے اس تماش بین کو بیوی کی بجائے بیوہ ہی بنایا۔ وہ اس سے وقتی حسن تو چھین لیتے مگر حسن ادا نہ چھین سکے۔ اکثر شہر دیکھ کر لگتا ہے اصل شہر کوئی اور تھا یہ تو بس اس کا شہرہ ہے۔ جیسے دہلی کے مرنے کے بعد اب اس کی پوتی اسی نام

سے وہاں بستی ہے مگر یہ کبھی نہ مری بس زخمی ہوئی یہ اصلی ہے۔

لاہور منجمد موسیقی ہے۔ دیکھنے میں تماشبین' دکھنے میں تماشا۔ اس کا غصہ مردانہ ہے یعنی اس کا اظہار ہاتھ اور زبان سے کرتی ہے۔ مگر خوشی زنانہ کہ اس کا اظہار پورے بدن سے کرتی ہے۔ وہ جنت ہے نہ جنہم کیونکہ جنت اور جنہم تو دراصل دو قید خانے ہیں۔ ایک میں آدمی مسرتوں کی قید میں ہے اور دوسرے میں مصیبتوں کی۔ مگر لاہور تو بس لاہور ہے۔ لاہور کے مشرق' مغرب' شمال اور جنوب میں بھی لاہور ہی واقع ہے۔ جو لاہور میں نہیں رہا اس نے آدھی زندگی ضائع کر دی اور جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے پوری۔

لاہور زندہ دلی کا نام ہے مگر اس کا دل اتنا چھوٹا ہے کہ جو اس میں داخل ہو جائے وہ یہاں سے نکل نہیں سکتا۔ اور اتنا بڑا کہ ہر آدمی اس میں باآسانی داخل ہو سکتا ہے۔ یہ لباس بدلتی ہے تو موسم بدل جاتا ہے۔ اگر کوئی ململ کا کرتہ پہن کر آئس کریم کھا رہا ہو تو سمجھ لیں کہ موسم گرما آ گیا اور اگر کوئی سوٹ پہنے دستانے اور کنٹوپ چڑھائے آئس کریم کھا رہا ہو تو سمجھ لیں سرما آ گیا۔ ویسے یہاں کے لوگ گرما اور سرما سے مراد اکثر پھل ہی لیتے ہیں۔ بارش میں یوں نہاتی ہے کہ دیکھنے والے بھیگ جاتے ہیں کیونکہ جب تک اس کے بدن پر بوند نہ پڑے یہ بارش کا یقین نہیں کرتی اور جب تک بارش کسی بدن پر نہ پڑے اسے یقین نہیں آتا کہ وہ لاہور پہنچی ہے یا نہیں۔ شادی شدوں کے لیے اس کا ہر مہینہ دسمبر کا مہینہ ہوتا ہے۔ اور کنواروں کے لیے ہر ماہ اپریل سے شروع ہوتا ہے۔

وہ ایک طوائف ہے اسی لیے جو اس گلی میں آیا اس کا گلہ ہی آیا' جو بیٹھ گیا اسے اٹھانے کے لیے خود اللہ آیا۔ یہ وہ داشتہ ہے جو یادداشت بھی چھین لیتی ہے۔

لاہور میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں لیکن یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ دوسرے شہروں سے اس کا فاصلہ کم اور یہاں سے ان کا فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ یہ دور سے نظر آتی ہے مگر یہاں سے دور دور تک نظر نہیں آتا۔ لوگوں کو اتنی خوشی خود خوش

ہو کر نہیں ہوتی جتنی اسے خوشی دیکھ کر ہوتی ہے۔ اسی لیے لوگ دور دور سے اسے خوش دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ جب ناخوش ہو تو خود ہی دور دور تک دکھائی دیتی ہے۔

کبھی بڈھے دریا میں وضو کیا کرتی تھی۔ اب استنجا کرتی ہے۔ علماء کی صحبت میں رہی تو جہلاء نے بھی اس سے صحبت کی۔ داتا صاحب جیسے اولیاء کی بدولت اللہ نے اسے آنکھ کا آنسو اور دل کا درد دیا۔ اس کے جسم کے کچھ حصوں کو یہ بھی پتا ہوتا ہے کہ آئندہ چوبیں گھنٹوں میں کیا ہو گا۔ اور بعض علماء کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ پچھلے چوبیں گھنٹوں میں کیا ہو گا۔

بچوں کو حال جوانوں کو مستقبل اور بوڑھوں کو ماضی نظر آتی ہے۔ کھانے کے معاملے میں پکی مسلمان ہے۔ یعنی ہر کھانا یوں کھاتی ہے جیسے آخری کھانا کھا رہی ہو۔ جب سہاگن تھی اس کے بازوؤں میں دروازوں کی صورت درجن بھر چوڑیاں تھیں۔ اب تو بس ان چوڑیوں کے بازو پر نشان ہی باقی ہیں۔ اب تو اس کے جسم کی اپنی خوشبو بھی نہیں رہی۔ وہ بھی ان مردوں کی ہے جو اسے وقفے وقفے سے مردانگی دکھاتے رہے۔

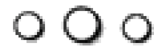
میرا دوست "ف" کہتا ہے، مغلوں کے دور میں لوگ لاہور میں آ کر رہنے لگے۔ میں نے کہا، یہاں تو اس سے پہلے بھی لوگ موجود تھے۔ تو کہا، ٹھیک ہے مگر انہیں یہ نہیں پتا تھا کہ لاہور میں رہتے ہیں۔ ویسے تو آج بھی اکثر لوگ لاہور میں نہیں رہتے، اپنے بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ جو ایسے ہی ہے، بندہ ماں کا دودھ فیڈر میں ڈال کر پیئے۔

نئے دور نے اسے اس قدر خوفزدہ کر دیا ہے کہ کئی دہائیوں سے وہ مسلسل جاگ رہی ہے۔ زندہ دل ہے اسی لیے زندہ ہے۔ ہر چیز میں خوشی کا پہلو ڈھونڈ لیتی ہے۔ وہ تو اخبار میں قتل اور ڈاکے کی خبریں پڑھ کر بھی خوش ہوتی ہے۔ وجہ پوچھو تو کہے گی دیکھیں آج کل کے مقابلے میں کم ڈاکے پڑے قتل بھی کم ہوئے، ہے ناں خوشی کی بات! پھر اس خوشی پر جشن منائے گی۔ اب اس قدر موٹی ہو گئی ہے کہ لگتا ہے اس

کے جسم کا ہر حصہ الگ جسم ہے مگر جب خوشی سے ناچتی سڑکوں پر آتی ہے تو پھر اسے ایک جسم بن جاتی ہے۔ ہجوم اس کا چہرہ ہے۔ جس نے دیکھنا ہو خوشی دیکھنے میں کیسی ہوتی ہے' وہ لاہور دیکھ لے۔

اس کی وہ انڈسٹریز جن کے مال کی بنا پر یہ ملک میں اور بیرون ملک مشہور ہے' ان میں فلم انڈسٹری نمایاں ہے۔

لاہور درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں تاریخ کی کتابوں میں دفن ہیں۔ کچھ تو بادشاہی مسجد' شالامار باغ' شاہی قلعہ اور مینار پاکستان کی صورت زمین پر نکلی ہوئی ہیں مگر اس کے باسی ان پرندوں کی طرح نہیں ہیں جو آئے اور اپنی اپنی بولی سنا کر اڑ گئے۔ اس کے باسی تو اس پر پھولوں' پھلوں اور کانٹوں کی طرح اگے ہوئے ہیں۔ شہر وہ جگہ ہوتی ہے۔ جہاں بہت سے لوگ مل کر اکٹھے رہتے ہیں۔ لیکن لاہور وہ شہر ہے جہاں بہت سے اکیلے مل کر رہتے ہیں۔



- آدھا مرد

کئی برس پہلے کی بات ہے' ایک لڑکی غم سے نڈھال سوجی آنکھوں کے ساتھ مال روڈ پر چلا چلا کر کہہ رہی تھی "عزت لوٹنے والے درندوں کو موت کی سزا دی جائے۔" کسی نے پوچھا یہ وہ لڑکی ہے جس کی عزت لوٹی گئی۔ دوسرے نے کہا' نہیں! یہ تو پروین عاطف ہے۔

پروین عاطف پوری پروین ہے نہ پورا عاطف۔ جب لڑکی تھی تو دو لڑکیوں کے برابر تھی اور اب آدھا مرد ہے۔ یوں بھی ہمارے ہاں ایک عورت آدھے مرد کے برابر ہوتی ہے۔

مردوں کے ساتھ مردوں کی طرح ملتی ہے۔ اس پر ہمیں اتنا اعتراض نہیں' مسئلہ یہ بھی ہے کہ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح ملتی ہے۔

وہ دیکھنے میں پروین عاطف کی ملازمہ لگتی ہے۔ سفر نامہ' افسانہ نگار' مقرر' سوشل ورکر' خواتین ہاکی ٹیم کی روح رواں' یہی نہیں اس کا ایک قدم ترقی پسند خواتین کی تحریک بھی ہے۔ یوں وہ بڑی کشش پایہ شخصیت ہے' محقق بھی ہے۔ ہر کام کے لئے باقاعدہ تحقیق کرتی ہے۔ اسے تو یہ جاننے کے لئے کہ اس کے کس ہاتھ میں گاڑی کی چابیاں ہیں باقاعدہ تحقیق کرنا پڑتی ہے۔

عمر کے مقابلے میں پہلے مجھ سے پچیس سال بڑی تھی' اب صرف بارہ سال بڑی ہے۔

جوانی میں اپنے کالج کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی اس سے اندازہ کریں کہ ان دنوں لڑکیوں کو پڑھانے کا کس قدر کم رواج تھا۔ بہرحال جوانی میں اتنی پرکشش تھی کہ جو بھی ان کے گھر رشتے کے لئے لڑکا دیکھنے آتا اسے فوراً پسند کر لیتا۔ ساری زندگی دوسروں کے بارے میں سوچتی رہی' اپنے بارے میں سوچنے کا موقع نہ ملا۔ سو اپنے بارے میں جو کیا بغیر سوچے سمجھے کیا۔ اسے مٹر گوشت اور مٹر گشت بہت پسند ہے۔

دیکھنے میں سپورٹ وومین یعنی دیکھ کر اس کی سپورٹ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ عورت

اتنا دنیا کو نہیں دیکھتی جتنا دنیا اسے دیکھتی ہے مگر اس نے بڑی دنیا دیکھی' ظلم کو روکنے کا حوصلہ رکھتی ہے اگر کوئی طیارہ بغداد پر حملہ کرنے لگتا ہے تو یہ اس کا راستہ روکنے کے لئے مال روڈ کی ناکہ بندی کر دیتی ہے۔

محبت میں محبوبہ نہیں ملازمہ بن جاتی ہے۔ کہو پیاس لگی ہے تو پورا سمندر کٹورے میں بھر لائے گی' یہی نہیں پورا سمندر پلا کے بھی چھوڑے گی۔ اس نے حمید اختر' مسرت نذیر اور کئی لوگوں کی شادیاں کروائیں' لیکن مشورے ہمیشہ لڑکوں کو دیتی' لڑکیوں کو اس لئے نہ دیتی کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ لڑکیوں کی شادیاں ہو جائیں۔

حافظہ اپنے بھائی احمد بشیر کی طرح۔ ایک بار مسز احمد بشیر نے گھر بدلنا تھا اس نے نئے گھر کا ایڈریس لکھ کر احمد بشیر کی جیب میں ڈال دیا اور کہا کہ شام تک شفٹنگ ہو چکی ہو گی۔ احمد بشیر نے دفتر آ کر جیب میں یہ ایڈریس دیکھا تو ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ میری جیب میں کس کا پتہ ہے؟ شام کو واپس پرانے گھر آیا تو پتہ چلا کہ سامان تو نئے گھر میں شفٹ ہو چکا ہے۔ پوچھتے پچھاتے ایک گلی میں گیا وہاں بچیاں کھیل رہی تھیں ان سے پوچھا تمہیں پتہ ہے کہ نئے کرائے دار احمد بشیر کس گھر میں آئے ہیں تو بچوں نے کہا' اس گلی میں چوتھا مکان ہے ابو!-----

کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتی' اس لئے بہت کم آئینہ دیکھتی ہے۔ جب لکھتی ہے تو دوسروں کو دکھا دکھا کر کہتی ہے "میری پہلی پہلی کوشش ہے بات بھی بنی ہے یا نہیں۔" پہلے بچے کی پیدائش پر بھی یہی کہا۔ سوچتے سوچتے بھول جاتی ہے کیا سوچ رہی تھی۔

گھر میں اس قدر خوشحالی ہے کہ ہر کسی کے لئے علیحدہ علیحدہ کمرے' ہر چیز الگ بلکہ اس کے تو ہر پاؤں کے جوتے الگ الگ ہوتے ہیں۔ چلتی ہوئی لگتی ہے نیند میں چل رہی ہے بلکہ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ نیند بھی ساتھ چل رہی ہے۔ مردوں کی توجہ سے نروس نہیں ہوتی' بے توجہگی سے ہوتی ہے۔ تنقید برداشت نہیں کرسکتی' نقاد برداشت کرلیتی ہے۔ اس کی تحریر کے بارے میں سب سے بری رائے اگر کسی کی ہے تو وہ

اس کی اپنی ہو گی۔ پوچھو' آپ دائیں بازو کی لکھنے والی ہیں یا بائیں بازو کی۔ تو کہے گی' میں تو دائیں بازو سے ہی لکھتی ہوں۔ اللہ نے اسے معمولی کام کرنے کے لئے غیر

معمولی صلاحیتیں دی ہیں اور غیر معمولی کام کرنے کے لئے معمولی صلاحیتیں دی ہیں۔

کوئی نقصان ہو جائے تو غلطی ہمیشہ اپنی نکالے گی وہ پیدل چلتی ہوئی کسی کار سے ٹکرا جائے تو گھر آ کر افسوس کرے گی کہ میں نے کار کو سائیڈ کیوں ماری؟ سمجھتی ہے کہ دو بیوقوف مل کر ایک عقلمند بن سکتا ہے۔ حالانکہ دو بیوقوف ایک بیوقوف سے زیادہ بیوقوف ہوتے ہیں۔ ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھتی ہے۔ گھر میں اگر کسی کا پرس نہ ملے تو وہ نوکرانی سے کہے گی "دیکھنا' پروین عاطف کے کاندھے پر نہ لٹکا ہو۔"

اپنی تحریروں کو سنبھال کر نہیں رکھتی۔ چاہتی ہے کہ تحریریں اسے سنبھال کر رکھیں۔ کام اس قدر انہماک سے کرتی ہے کہ ارد گرد بھول جاتی ہے کبھی کبھی تو اس قدر مصروف ہوتی ہے کہ یہ بھی بھول جاتی کہ وہ کیا کر رہی ہے؟

گھر میں کوئی اور بیمار ہو تو پھر بھی باہر سے آنے والے اکثر اسی کی عیادت کرنے لگتے ہیں۔ چار بچے پیدا کئے' شاید اسے پتہ چل گیا ہو گا کہ دنیا میں پیدا ہونے والا ہر پانچواں بچہ چینی ہوتا ہے اور چینی بچے خوبصورت نہیں ہوتے۔ جوانی میں اکثر اسے سر درد رہتا۔ ڈاکٹر اس کے سر کا معائنہ کرتے مگر انہیں وہاں کچھ نہ ملتا۔ جس بات کا پتہ ہو وہ تو سب عورتوں کو بتا ہی دیتی ہے اسے جس بات کا نہ بھی پتہ ہو یہ وہ بھی سب کو بتا دیتی ہے۔

بچوں کو اپنا دوست اور دوستوں کو اپنا بچہ سمجھتی ہے۔ ایک دن کہنے لگی "عورتوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" میں نے کہا "جو عورتوں کی مردوں کے بارے میں ہے۔" تو کہنے لگی "مجھے پہلے دن ہی پتہ تھا کہ تمہاری عورتوں کے بارے میں اچھی رائے نہیں ہے۔"

پچھلے دنوں مال روڈ پر ایک عورت جو بولنے سے پہلے کانپتی اور بولتی تو سننے والے کانپ اٹھتے' چولہا پھٹنے سے مرنے والی نوبیاہتا لڑکی کے سسرال کے خلاف احتجاج کر رہی تھی۔

کسی نے پوچھا "یہ عورت اس لڑکی ماں ہے؟"
دوسرے نے کہا۔ "نہیں! یہ پروین عاطف ہے۔"

○○○

• بابائے عشق

مشہور زنانہ اظہر جاوید کو دور سے دیکھا جائے تو اس کی جو چیز سب سے پہلے نظر آتی ہے وہ اس کی ناک ہے۔ وہ بھی ایسی کہ تصویر بناتے وقت ناک فوکس کی جائے تو چہرہ آوٹ آف فوکس ہو جائے۔

اظہر جاوید کا قد بدلتا رہتا ہے کیونکہ وہ دوسروں کو اپنی سطح پر لانے کی بجائے خود ان کی سطح پر آ جاتا ہے اسی لیے اچھوں میں بیٹھا ہو تو اچھا اور بروں میں بہت برا لگتا ہے۔

اگرچہ اس کے بال سیاہ برقعے اتار کر سفید کفن پہن رہے ہیں پر اسے اب بھی سیاہ برقعے ہی پسند ہیں۔ اس کے سفید بال کم ہی لوگوں نے دیکھے ہیں کیونکہ یہ بال اسی وقت نظر آتے ہیں جب اس کا کوئی دوست تکلیف میں ہو ورنہ وہ ہر وقت ان پر بے فکری کا رنگ چڑھائے رہتا ہے یوں بھی بال سفید ہیں تو کیا ہوا' دل کو دیکھنا چاہیے۔

اس قدر خوش اخلاق ہے کہ مردوں تک سے ہنس کر باتیں کرتا ہے۔ مخلوط محفلوں کے ہمیشہ نصف بہتر میں پایا جاتا ہے۔ رکھ رکھاؤ کا اس قدر قائل کہ بیس برس قبل جسے لڑکی سمجھ کر عید کارڈ بھیجتا تھا آج بھی اسے لڑکی سمجھ کر ہی یہ سب کچھ کرتا ہے۔

جب اظہر جاوید اکیلا ہو یعنی اس کے ساتھ کوئی مرد ہو تو یوں تپاک سے ملے گا جیسے آخری بار مل رہا ہو' ملنے والا ہم عمر ہو گا تو اس احترام سے ملے گا کہ دوسرے کو یقین ہو جائے گا کہ اس نے مجھے کوئی اور سمجھا ہے۔ اگر کم عمر ہو گا تو اس سے یوں محبت سے ملے گا کہ وہ سمجھنے لگا کہ اس نے مجھے کچھ اور سمجھا ہے لیکن اگر ساتھ کوئی خاتون ہو گی تو السلام علیکم یوں کہے گا جیسے خدا حافظ کہہ رہا ہو۔

اسے سیڑھیاں چڑھنے کا اس قدر شوق ہے کہ ہمیشہ ایسی جگہ دفتر بنایا جہاں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا پڑے لاہور میں اس کا دفتر اکثر لاہور کی نسبت "سرگودھا" کے زیادہ قریب

ہوتا ہے۔
آج کل ہر کوئی دوسرے کو سناتا ہے کسی کی کون سنتا ہے؟ مگر اظہر جاوید کو دوسروں کی سننے کا اس قدر شوق ہے کہ شام ہوتے ہی کہنے لگتا ہے "آج کس کو سنا جائے؟"

عاشق مجاز آدمی ہے گفتار میں ترنم اور کردار میں ملکہ ترنم ہے اس نے "تخلیق" کے زور پر کئی شاعرات پیدا کیں جن میں اکثر بڑی ہو چکی ہیں مگر صرف عمر میں۔ اردو ادب کے لیے اس نے جتنا عملی کام کیا کئی آدمی مل کر نہیں کر سکتے یعنی جتنے عشق اس نے کئے اکیلے بندے کا کام نہیں۔ جتنے لمبے وہ عشق کرتا ہے اتنی لمبی تو لوگ دشمنیاں نہیں کرتے۔ عورتوں کے کام آنا اعزاز سمجھتا ہے اسی لیے کسی نہ کسی خاتون کا اعزازی مدیر ہوتا ہے۔
پاکستان کے بوڑھے بڑے باکردار ہوتے ہیں ان کے ہاں قول و فعل کا تضاد نہیں' یعنی جتنے بوڑھے باہر سے نظر آتے ہیں اتنے ہی اندر سے ہوتے ہیں اور گھڑی پاس بیٹھ جاؤ تو آدمی خود کو بھی بوڑھا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اظہر جاوید دیکھنے میں تو ادھیڑ عمر ہے مگر پاس بیٹھ جاؤ تو وہی حالت ہوتی ہے جو پہلی بار منٹو کے افسانے پڑھنے کے بعد ہوتی ہے۔ خود بھی اپنے آپ کو جوان سمجھتا ہے اسی لیے آج بھی وہی کپڑے پہنے ہوتا ہے جو جوانی میں پہنا کرتا تھا۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے' میں پورے ادب سے کہتا ہوں ایسا جوان بوڑھا ادب میں تو کیا پورے پاکستان میں بغیر ادب کے بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ ٹھیک کہتا ہے کم از کم میں نے آج تک کوئی بوڑھا پیدا ہوتا نہیں دیکھا۔
اکثر دوسروں کے کام کرتا ہے مثلاً تصویر میں بڑا گھبرایا گھبرایا لگتا ہے حالانکہ یہ کام تو دیکھنے والے کا ہے۔ صحت کا اس قدر خیال رکھتا ہے کہ ہر وقت حکیم ولی الرحمٰن ناصر کو ساتھ رکھتا ہے جس سے حکیم صاحب کی ادبی اور غیر ادبی صحت بہتر ہو گئی ہے اسے لڑنا بہت پسند ہے اسی لیے کوئی ادبی مسئلہ چھیڑ کر دوسروں کو لڑا دیتا ہے تاکہ انہیں پسند کر سکے۔

سیاست میں بھی پاؤں رکھتا ہے جو اکثر پھسل جاتا ہے "امروز" کی سیڑھیوں سے ایسا پھسلا کہ ابھی تک نہیں سنبھل سکا لیکن نگاہ آج بھی اس قدر بلند کہ ہمیشہ عینک کے اوپر سے دیکھتا ہے۔ وہ انصاف کے در کی طرح ہر کسی پر نہیں کھلتا اگر کوئی اس کا اصل دیکھنا چاہے تو قہقہوں کی بکل مار لیتا ہے۔ بات شروع کرتا ہے تو لگتا ہے دوسرے کی پسند کی کر رہا ہے مگر جب ختم کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے اپنی پسند کی کر گیا۔ اس کی صحت ایسی کہ عبدالعزیز خالد کے ایک شعر سے سانس پھولنے لگے۔ صحت ایسی کہ مزید خراب ہونے کا اندیشہ نہیں۔ مصیبت کے وقت دوسروں کے کام آتا ہے اسی لیے اسے وہی دوست رکھتے ہیں جنہیں کوئی نہ کوئی کام ہو۔

بحیثیت شاعر اس کا قد دوسروں کا قد بڑھانے میں صرف ہوا۔ ہجر و وصال اس کی شاعری کے دو رخ ہیں اس نے اپنی شاعری میں جن خواہشات کا اظہار کیا ان میں سے ایک بھی پوری ہو جائے تو اسے حدود آرڈیننس کے تحت دھر لیا جائے۔

لگتا ہے اس نے دنیا عورت کی نظر سے دیکھی ہے شاید اسی لیے اس میں وفا اور محبت ہم سے زیادہ ہے۔ بقول میرے دوست "ف" میں بقائمی ہوش و ہوس کہتا ہوں اب عشق کا موسم نہیں رہا، بس موسمی عاشق رہ گئے ہیں اور اظہر جاوید اس "پت جھڑ" کا آخری پتا ہے۔

مجھے اظہر جاوید پر رشک آتا ہے کہ کوئی اس کا احترام نہیں کرتا۔ میں بھی اس کا احترام نہیں کرتا۔ وہ ایسا ہے بھی نہیں کہ احترام کی چھڑی سے اسے فاصلے پر رکھا جائے اس کے تو قریب ہونے کا دل چاہتا ہے۔ اس سے محبت کرنے کو دل چاہتا ہے۔

○○○

• ادیبوں کا ہیڈ ماسٹر

ہیڈ ماسٹر وہ ہوتا ہے جو ماسٹروں کے سر پر سوار رہے اور وہ ادیبوں کا ہیڈ ماسٹر ہے۔ اپنے پاس ہمیشہ ایک رجسٹر رکھتا ہے جس میں شاعروں' ادیبوں کی سالانہ پیداوار کا حساب بمعہ کتاب اور ایڈریس درج ہوتا ہے چونکہ حافظہ کمزور ہے۔ تین چار سے زیادہ شاعروں کو یاد نہیں رکھ سکتا اس لیے صرف شاعرات کو ہی یاد رکھتا ہے۔

رنگ ایسا صاف کہ اس پر پڑی گرد دور سے نظر آ جاتی ہے ناک ایسی کہ اس پر ہاتھ پھیرنے میں اتنا ہی وقت لگتا ہے جتنا سارے منہ پر یہی کچھ کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں جہاں کنگھی پھیرا کرتا تھا آج کل رومال پھیرتا ہے۔ سر اور منہ نے حد بندی ختم کر رکھی ہے اس لیے پتہ نہیں چلتا منہ کہاں ختم ہوا اور سر کہاں سے شروع ہو گیا۔ لیکن وہ دوسروں کی بات سنتے وقت لگاتا ہے کیونکہ اس نے بس ایک بار یہ ہی دیکھنا ہوتا ہے کہ بولنے والا کون ہے؟

بھول جانا اس کی ضرورت ہی نہیں عادت بھی ہے۔ کسی موضوع پر گفتگو کرتے وقت مخاطب کا نام بھول جائے گا کہ کس موضوع پر گفتگو کر رہا تھا اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اس نے ڈاکٹر سے بھی اپنے مرض نسیان کا علاج کرایا۔ تین مہینے کے علاج کے بعد ڈاکٹر صاحبان ایک دن آئے اور انھوں نے پوچھا جی سر اب تو نہیں بھولتے آپ۔ موصوف نے فرمایا' بالکل نہیں مگر آپ کون ہیں اور یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ البتہ جس کسی نے اس کے زیادتی کی ہو اسے ہرگز نہیں بھولتا اس لیے اگر کسی کو فوراً پہچان لے تو وہ گھبرا کر پوچھتا ہے' میں نے کیا کیا ہے؟

اپنی سائیکل پر سوار سڑکوں پر یوں پھرتا ہے جیسے کسی کی تلاش میں ہو حالانکہ اسے دیکھ کر لگتا ہے اس کی اپنی تلاش ہو رہی ہو گی۔ ایک صحافی نے تو اس کی حالت دیکھ کر یہاں تک چھاپ دیا تھا کہ وہ سائیکل پر ساری دنیا کا چکر لگا کر آیا ہے۔ سائیکل اس

کی شریک حیات ہے۔ ایک بار کسی دفتر میں گیا اور سائیکل گیٹ پر کھڑی کرکے اندر جانے لگا تو چوکیدار نے کہا' اسے جا کر اسٹینڈ پر کھڑی کریں۔ موصوف نے کہا کہ یہ جو گیٹ پر ایک سائیکل کھڑی ہے۔ چوکیدار نے کہا یہ تو کوئی پاگل کھڑی کر گیا ہے اس دن سے وہ بھی وہیں سائیکل کھڑی کر رہا ہے۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگا' پاگل ہوں کوئی بیوقوف نہیں ہوں۔

اس قدر سخی ہے کہ اس نے پورے ملک میں حلقہ ارباب ذوق بلکہ ہلکا ارباب ذوق کی شاخیں تقسیم کیں یہی اس نے تو حلقہ ارباب ذوق بھی تقسیم کر دیا۔ سارا دن سائیکل پر گھومتا رہتا ہے جہاں کوئی ادیب نظر آیا اتر کر اسے ارباب ذوق کا پروگرام دیا اور کسی دوسرے کی تلاش میں نکل پڑا۔ اسے جتنی فکر حلقے کی ہے اتنی اپنی نہیں اسی لیے دوسروں کو بھی زیادہ فکر حلقے کی ہی ہے۔ اجلاس میں حاضرین کی تعداد کم ہو تو پریشانی سے نہیں بیٹھتا۔ اگر زیادہ ہو تو خوشی سے۔ حلقے کے اجلاس کے دوران اس انداز سے سگریٹ پی رہا ہوتا ہے جیسے حلقہ نہیں اڈہ چلا رہا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کو اپنی اولاد سمجھتا ہے اور اس کی اولاد اسے حلقہ ارباب ذوق سمجھتی ہے۔

ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے کچھ نہ بھی کر رہا ہو تو پھر بھی یہی سمجھتا ہے کہ میں کچھ کر رہا ہوں اس کے قول و فعل میں تضاد نہیں یعنی حرکتیں بھی ویسی ہی کرتا ہے جیسی باتیں۔ کسی جگہ پر چند منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھتا وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ پر چلا جائے گا اگر نہ اٹھے تو دوسرے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اس قدر محنتی ورکر ہے کہ اس کے پاس سوچنے کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا۔ کہتا ہے میں دنیا کا مصروف ترین آدمی ہوں۔ میں تو باتھ روم کے لیے بمشکل دو منٹ نکالتا ہوں اس کی حالت سے لگتا ہے کہ وہ صحیح کہتا ہے۔ کبھی کبھی دوڑنے کے لیے چند منٹ نکال لیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دوڑتا ہوا پاس سے گزر جائے تو لوگ گھبرا کر اپنا سامان چیک کرنے لگتے ہیں۔ اس قدر جلدی میں ہوتا ہے کہ معافی پہلے مانگ جائے گا غلطی بعد میں آ

کر کرے گا۔ اپنے پاس رومال ضرور رکھتا ہے حالانکہ اس کی اس سے زیادہ ضرورت اس کے ملنے والوں کو ہوتی ہے۔
فلٹر کے بغیر سگریٹ نہیں پیتا۔ یعنی سگریٹ پیئے تو ساتھ فلٹر ضرور پیئے گا۔ کشمیری خاندان

سے تعلق رکھتا ہے اسی لیے جو کام زبان سے ہو سکے اسے بھی ہاتھ سے کرتا ہے۔
صرف اچھی بات سنتا ہے یعنی وہی بات جو اس کے لیے اچھی ہو۔ انگریزوں سے اس قدر نفرت کہ مجال ہے ساری زندگی کبھی صحیح انگریزی بولی یا لکھی ہو۔ حب الوطنی اس قدرکہ امرتسر کو بھی اپنا علاقہ سمجھتا ہے۔ سمجھتا ہی نہیں گفتگو سے ثابت بھی کرتا ہے۔
بڑا بت شکن ہے یعنی اسے دیکھتے ہی بتوں کے ماتھے پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ بڑے بڑے ادیب اس کے سامنے نہیں ٹھہرتے بلکہ تیزی کے ساتھ پاس سے گزر جاتے ہیں۔
نثری نظم کے لیے اس نے جتنی محنت کی ہے اتنی اپنے لیے نہ کی ہو گی اگرچہ نثری نظم کا مستقبل وہی ہو سکتا ہے جو بیک وقت زنانہ مردانہ صلاحیتیں رکھنے والے فرد کا۔ لیکن کہتے ہیں نثری نظم کی یہ خوبی ہے کہ اسے مشاعرے میں نہیں پڑھا جا سکتا اور شاعر اس محنت سے بچ جاتا ہے جو اسے مشاعرہ حاصل کرنے کے لیے کرنا پڑتی ہے۔
لوگ تو خواتین کے اس قدر خلاف ہیں' کہتے ہیں چور کو نہیں چور کی ماں کو مارو۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ وہ عورت ہے۔ لیکن وہ عورتوں کو ہمیشہ مرد سے بالا تر سمجھتا ہے۔ وہ مرد ادیبوں کو خواتین رائٹرز سے بہت کمتر اور گھٹیا خیال کرتا ہے اور آدمی اس سے ایک ہی ملاقات میں اس بات پر متفق ہو جاتا ہے۔
بہترین سرجن وہ ہوتا ہے جو جتنا ہو سکے مریض کو سرجری سے دور رکھے اور بہترین ادیب وہ جس سے ادب زیادہ سے زیادہ بچا رہے اسی لیے میرا دوست "ف" کہتا ہے کہ اردو میرا احسان عمر بھر نہیں بھول سکتی۔ وہ احسان یہ ہے کہ اس نے کچھ نہیں لکھا۔ لیکن ہمارے ادیبوں کے ہیڈ ماسٹر نے پوری زندگی ادب کے لیے وقف کر دی ہے اسی لیے وہ سگریٹ بھی پی رہا ہو تو پتہ نہیں چلتا اپنے لیے پی رہا ہے یا اردو ادب

کے لیے۔ ویسے وہ ادب برائے ادب کا قائل ہے۔ مطلب یہ کہ اس کا ادب کرتا ہے جو اس کا ادب کرتے ہیں یعنی کسی کا ادب نہیں کرتا۔ دن کے چوبیں گھنٹوں سے بارہ گھنٹے پانی پاپنے اور باقی بارہ گھنٹے پسینہ پونچھنے میں صرف کرتا ہے لیکن آخر الذکر کام کا وقت اسے کم ہی ملتا ہے۔ یہ کام اس کی گفتگو سننے والے کر رہے ہوتے ہیں۔ کہتا ہے میں نے خود سے اچھی گفتگو کرتے کسی کو نہیں سنا۔ ٹھیک کہتا ہے اس نے کبھی کسی دوسرے کو گفتگو کرتے سنا ہی نہیں بغیر تعارف کے کسی سے بات نہیں کرتے اور تعارف کے بعد کسی کی سنتا نہیں۔

آنسو آنکھ کا لباس ہے جس آنکھ میں آنسو نہ ہوں وہ ننگی ہو جاتی ہے۔ کمر ننگی ہو جائے تو مرزا زندہ نہیں بچتا آنکھ ننگی ہو جائے تو صاحباں مر جاتی ہے مگر اس نے اپنے اندر صاحباں مرنے نہیں دی۔ معمولی معمولی بات پر غیر معمولی روتا ہے پھر روتے اچانک یوں چپ ہو جاتا ہے جیسے بھول گیا ہو کہ کیا کر رہا تھا۔



- مسٹر "میں اور آپ"

محمد سلیم طاہر کا اردو ٹی وی پروگرام "میں اور آپ" جسے آپ پنجابی میں "تو تو میں میں" کہہ لیں، اپنی مثال آپ ہے۔ یہی نہیں محمد سلیم طاہر کا یہ بھی ریکارڈ ہے کہ وہ پی ٹی وی کا سب سے معمر بچہ ہے اسی لیے بڑی عمر کی عورتوں کے پاس زیادہ خوش رہتا ہے۔

حلیہ ایسا کہ دو تین سال اور نائی سے اس کے تعلقات ایسے رہے تو اجمل نیازی لگنے لگے گا۔ وہ آج بھی کلاس روم سے بھاگا اسٹوڈنٹ لگتا ہے حالانکہ اسے ایکس اسٹوڈنٹ ہوئے اتنی دیر ہو گئی ہے کہ اب تو آپ اسے ڈبل ایکس سٹوڈنٹ کہہ سکتے ہیں۔
چال ایسی کہ لگتا ہے کوئی عورت مردانہ چال چلنے کی کوشش کر رہی ہے۔
ٹی وی اسٹیشن کے باہر اس قدر خلوص اور محبت سے ملتا ہے کہ دوسرے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اسے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔ ٹی وی اسٹیشن اپنے کمرے میں کم اور اپنے آپ میں زیادہ رہتا ہے حالانکہ اکثر پروڈیوسر کمرے میں زیادہ اور اپنے آپ میں کم رہتے ہیں۔
اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا ہے یعنی آپ ایک شعر سنائیں تو وہ پوری نظم سنائے گا لیکن اتنے اچھے طریقے سے سناتا ہے کہ اتنے اچھے طریقے سے وہ چپ بھی نہیں رہ سکتا۔ جس موقع پر دوسرے ملازمین کو کھری کھری سناتے ہیں یہ اس موقع پر بھی انہیں اپنی نظم ہی سناتا ہے۔ جب بھی عورتوں سے ملتا ہے شعر ہی سناتا ہے اسی لیے وہ اسے مرد کم اور شاعر زیادہ سمجھتی ہیں۔
بے تکلف دوستوں سے گفتگو کرتے وقت گالیوں کا استعمال کرتا ہے اور گالی کی گہرائی سے پتہ چلتا ہے دوسرا اس کا کتنا گہرا دوست ہے۔ اگر کسی دوست کے ساتھ عزت

سے پیش آئے تو اسے شک ہونے لگتا ہے کہ اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔
بہت اچھا مقرر ہے اسی لیے گفتگو کم اور تقریر زیادہ کرتا ہے۔ میں نے کسی لڑکی کو اس سے زیادہ باتیں کرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اس کی باتیں سنتے ہی دیکھا ہے۔ کوئی اس سے زیادتی کر جائے تو خاموش ہو جاتا ہے شاید اسی لیے اپنی شاعری کی تعریف بڑی خاموشی سے سنتا ہے۔
وہ اس قدر حساس ہے کہ اس بات پر بھی پریشان ہو جاتا ہے جسے دوسرے بات ہی نہیں سمجھتے دوستوں کے معاملے میں بڑا محتاط ہے یعنی کوشش کرتا ہے وہ اس سے بہتر نہ ہوں اسی لیے مجھے بھی اپنا دوست کہتا ہے۔
وہ نیک آدمی نہیں کیونکہ وہ سرعام نیکی نہیں کرتا۔ جانتا ہے انسان خطا کا پتلا ہے اسی لیے سارا دن اپنے آپ کو انسان ثابت کرنے میں لگا رہتا ہے بڑے سوچ سمجھ کر غلط فیصلے کرتا ہے دوسروں کے فائدے کے لیے اتنی دوڑ دھوپ کرتا ہے کہ انہیں شک ہونے لگتا ہے کہ یہ اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟
دوسروں کو خوش کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتا ہے جن سے وہ ناراض ہو جاتے ہیں اکثر کاموں میں اس وجہ سے تاخیر کر دیتا ہے کہ کہیں تاخیر نہ ہو جائے۔ کسی کو بددعا نہیں دیتا کیونکہ جسے بد دعا دیتا وہ ترقی کر جاتا ہے کسی پر احسان بھی یوں کرتا ہے جیسے اپنے آپ پر کر رہا ہے۔ اس کی نظمیں منی سکرٹ کی طرح ہیں۔ اتنی تفصیلی کہ موضوع کو Cover کر سکیں اور اتنی مختصر کہ لوگوں کو ملنے نہ دیں۔
اس قدر چالاک ہے کہ اسے پتہ ہے وہ چالاک نہیں حالانکہ ہمارے ہاں لوگ اس قدر احمق ہیں کہ خود کو چالاک سمجھتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر خوش ہو ہو کر اس کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ بڑی خوشی مل جائے تو پریشان ہو جاتا ہے۔
محمد سلیم طاہر اس قدر بزدل ہے کہ کوئی اس پر وار نہیں کر سکتا۔ اکثر اپنی بزدلی چھپانے کی کوشش میں بہادری کر جاتا ہے اور پھر ڈرتا رہتا ہے کہ یہ میں نے کیا کر دیا۔

اسے اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے اسی لیے وہ دوسروں کے درمیان رہتا ہے مگر پھر بھی اکیلا ہے۔

○○○

- شہید اردو

اس سے میری ہمیشہ ایسے ہی ملاقات ہوتی ہے جیسے موت ہوتی ہے یعنی اچانک۔ وہ جس سے خوش ہو اسے دن میں ایک بار ضرور ملنے آتا ہے۔ جس سے ناراض ہو اسے ایک بار سے زیادہ ملنے لگتا ہے۔ اگر کوئی اچھے طریقے سے پیش آئے تو اس وقت تک اس کا پیچھا کرتا ہے جب تک وہ طریقے سے پیش نہ آئے۔ آتا ہوا اچھا اور جاتا ہوا بہت اچھا لگتا ہے۔

دیکھنے میں ایسا ہی ہے جیسے ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ چہرے پر نظر کی عینک لگی ہو تو لگتا ہے عینک نہیں نظر لگی ہوئی ہے۔ دور کی نظر ایسی کہ عینک کے بغیر دور تک سوچ بھی نہیں سکتا۔ لیکن بقول اس کے اللہ کی کرم فرمائی کے ساتھ مجھ کو بھی کافی حسن مردانہ دیا گیا ہے یعنی سرخ و سفید رنگت، اکہرا بدن، سنہرے بال، غلافی آنکھیں، لانبے ہاتھ پاؤں اور ہاتھ کی انگلیاں پتلی، کتابی چہرہ، ستواں ناک، پتلے سرخ ہونٹ، میٹھے لہجے والی زبان وغیرہ وغیرہ۔ پھر بھی طبیعت نہایت سادہ مخلص ہمدرد ملنسار اور سچے دل سے ہر چرند پرند، انسان اور فرشتے وغیرہ سے محبت کرنے والی عطا کی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک مجھے عوام کی اکثریت انگریز یا پٹھان کا بچہ سمجھتی تھی۔ شاید اسی لیے وہ اپنی برتھ ڈے پر انگریزوں اور پٹھانوں کو مبارکباد دیتا ہے۔

پورے ایشیا کو اپنا گھر سمجھتا ہے اور گھر کو پورا ایشیا۔ بہت مشہور ہے۔ آپ اس کی گلی میں کسی سے پوچھ لیں، سب جانتے ہیں افتخار ایشیا کون ہے۔ بقول عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری، افتخار ایشیا مجاہد اردو وغیرہ وغیرہ جیسے دانا بلکہ دانے بہت کم تعداد میں ہیں۔ کہتا ہے، میرے سولہ محبوب ہیں۔ اس کی حالت دیکھ کر تصدیق ہو جاتی ہے۔ جو اسے ایک بار مل جائے بھول نہیں سکتا۔ بھولنے کے لیے اس سے بار بار ملنا ضروری ہے۔

وقت کا اس قدر پابند کہ تقریبات میں عین اس وقت پہنچے گا جب کھانا شروع ہونے لگے۔ دوران کھانا پلیٹ اور پیٹ کے درمیان کوئی آئے تو مجاہدانہ انداز میں اسے پرے کر دے گا۔ پلیٹ ہمیشہ ہاتھ میں رکھے گا۔ ایک بار اس نے میز پر رکھ دی تو تقریب کے شرکا پلیٹ کو ڈونگا سمجھ کر اس سے بوٹیاں لینے لگے۔ اکثر محبوب کے حسن کو تشبیہ بھی کھانے والی چیزوں سے دیتا ہے۔ جیسے اس کا لہجہ رس ملائی جیسا میٹھا ہے۔ یہی نہیں وہ تو محبوب کو دیکھتا بھی یوں ہے جیسے کھانے والی چیز کو دیکھ رہا ہو۔

خود کو گلوکار بھی کہتا ہے۔ اس کے جاننے والے اس کی غلو کاری سے بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ خاص کرکے اس وقت جب وہ داد لینے کے لیے رکتا ہے۔ لفظوں کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جو لوگ اس کے ساتھ کرتے ہیں۔ لہجہ ایسا کہ پھول کہے تو لگتا ہے' فول کہہ رہا ہے۔ بولتا ہوا لگتا ہے لفظوں کے غرارے کر رہا ہے۔

پیدائشی ڈاکٹر ہے' یعنی ڈاکٹری کے بارے میں اس کا اتنا ہی علم ہے جتنا پیدائش کے وقت تھا۔ بچپن ہی سے اس کو بڑا بننے کی خواہش تھی۔ اب تو ماشاء اللہ بڑا ہو گیا ہے۔ پچاس سے اوپر کا ہے۔

ہر جگہ کو مسجد ہی سمجھتا ہے۔ یعنی اپنے جوتے سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں مسجد میں جوتے آگے رکھیں تو نماز نہیں ہوتی' پیچھے رکھیں تو جوتے نہیں ہوتے۔

محبت کے بارے میں ہمیشہ اس کا یہ نظریہ رہا کہ جس کے ساتھ عشق و محبت کرو اسی سے شادی کرو اور اس کی کبھی اپنے محبوب سے شادی نہ ہو سکی۔ جس کی شاید وجہ یہ ہو کہ اس کے محبوبوں کا بھی یہ نظریہ ہو۔ کہتا ہے کوشش کی جائے تو بندہ ہر لڑکی سے عشق کر سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے بشرطیکہ یہ کوشش لڑکی کی ہو۔ کو ایجوکیشن کو بھی کوہ مری کی طرح تفریحی مقام سمجھتا ہے۔

سائیکل چلاتے ہوئے ملکی مسائل پر سوچ بچار کرتا ہے۔ اور سائیکل کی رفتار سے پتہ چلتا ہے وہ کس تیزی سے سوچ بچار کر رہاہے۔ ہر کام کا نتیجہ الٹ ہونے لگے اور حکومت ڈولتی نظر آئے تو اتر کر سائیکل کا ہینڈل سیدھا کر لیتا ہے۔ اور ملکی حالات نارمل ہو

جاتے ہیں۔ ہر وقت ملک اور قوم کی خدمت کے لیے تیار رہتا ہے۔ واسکٹ ساتھ رکھتا ہے۔ کہتا ہے' واسکٹ کے بغیر پاکستان کا سربراہ مملکت ذرا نہیں جچتا۔ کالجوں میں داخلوں کے بارے میں کہتا ہے مجھے وزیر داخلہ بنا دیا جائے میں سارے مسئلے حل کر دوں گا۔

نام فضل الرحمٰن ہے جس کا آسان اردو ترجمہ ہے' یا اللہ فضل۔ لوگوں سے اس قدر پیار کرتا ہے کہ ہر شخص اس کا محبوب ہے یعنی اس کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جو اردو شاعری میں محبوب عاشق سے کرتا ہے۔ وہ تحت اللفظ' ترنم' مجاہدانہ اور پتہ نہیں کن کن انداز میں بولتا ہے۔ اور اندازے سے سنتا ہے۔

جتنی محنت سے اس نے اپنی کتابوں کے دیباچے لکھوائے ہیں اتنی محنت شاید ہی کسی نے کی ہو۔ دیباچہ نگار گھنٹوں اس سے انتظار کرواتے اور جتنی دیر میں دیباچہ لکھ کر لاتے ہیں' یہ بیٹھے بیٹھے نیا ناولٹ لکھ لیتا۔ بہرحال اس کی کتابوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ جلد ختم ہو جاتی ہیں۔

اس کی کتاب "زندگی" پڑھ کر عطاء نے اس کا نام شرمندگی رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ حالانکہ اس کا نام زندگی ہی ٹھیک ہے کیونکہ یہ زندگی کی ہی طرح ہے یعنی بغیر کسی پلاٹ کے اور بے اختیار اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ اس نے لکھنے کے بعد اس کا نام زندگی مجموعہ افسانہ ہائے رکھا۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے اگر پڑھنے کے بعد رکھتا تو مجموعے کا نام زندگی مجموعہ افسانہ ہائے ہائے ہوتا۔

کہتا ہے میں نے بچپن ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی تحریریں پڑھ کر ایسا ہی لگتا ہے۔ دنیا کا وہ کام بھی کر لیتا ہے جو پوری دنیا میں کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یعنی اپنا لکھا ہوا پڑھ لیتا ہے۔ وہ تو کاتب کے انتخاب میں بھی احتیاط کرتا ہے کہ کاتب ایسا ہو کہ اس کا لکھا ہر ایرا غیرا نہ پڑھ سکے۔

اس نے اردو ادب کا جمود سے نکالنے کے لیے بڑا متحرک ہو کر لکھا۔ سائیکل چلاتے ہوئے' گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس میں' ویگن میں' ہر مشکل سے جگہ پر اس نے مجاہدانہ انداز

سے لکھا۔ اگر وہ یہی مشقت کرتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب وہ مجاہد اردو سے شہید اردو ہو جائے گا۔

○○○

• پیار کا شہر

احمد ندیم قاسمی نام پڑھ کر لگتا ہے تین آدمی ہیں کام دیکھ کر بھی ایسا ہی لگتا ہے۔
عمر وہ جس میں بندہ مولا سے زیادہ مورخ سے ڈرتا ہے کہ مولا تو صرف مستقبل بدل سکتا ہے جبکہ مورخ تو ماضی بھی بدل سکتا ہے شکل و صورت ایسی کہ اگر مجھے کوئی یقین دلائے کہ پچھتر سال کی عمر میں میں بھی ایسا لگوں گا تو میں ابھی پچھتر سال کا ہونے کے لیے تیار ہوں کیونکہ جوانی کی خوبصورتی آپ کو فطرت کا عطیہ ہے اور بڑھاپے کی خوبصورتی آپ کا فطرت کو۔ چہرے پر بچپن کا ٹریڈ مارک یعنی زخم کا نشان یہی نہیں چہرے پر بچپن بھی ہے وہ پچیس سال کی عمر میں پچاس برس کے ہو گئے اور پچاس برسوں سے پچیس سال کے ہیں۔
دوسروں کے دکھ سکھ میں اس قدر شریک ہوتے ہیں کہ بیوی کسی کی فوت ہوتی ہے تسلیاں انہیں دینا پڑتی ہیں۔ جتنی محبت انہیں انسانوں سے ہے اگر اس کا دسواں حصہ خدا سے ہوتی تو اولیاء میں سے ہوتے اور اس کا سواں حصہ افسروں سے ہوتی تو رؤسا میں سے ہوتے۔
جو بھی انہیں پہلی بار ملتا ہے اسے افسوس ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کیوں نہیں ملا۔ ملاقاتی کے ساتھ یوں پیش آتے ہیں جیسے وہ نہیں یہ احمد ندیم قاسمی کو ملنے آئے ہیں۔ طوائف' ویگن اور ان کے رسالے "فنون" کا دروازہ ہر وقت ہر کسی کے لیے کھلا رہتا ہے۔ وہاں آنے والوں کی مسلسل لطیفوں اور باتوں سے یوں مدارت کرتے ہیں جیسے وہ اجازت لے کر نہیں 'ٹکٹ لے کر آئے ہوں۔
دنیا میں اللہ والے کام کئے یعنی عورت سے جب بھی رشتہ بنایا' ہمیشہ وہ رشتہ بنایا جو خدا خود بنا کر بھیجتا ہے۔ مذہب سے اس قدر لگاوء کہ آج تک کسی کافر پر دل نہیں آیا' لیکن ہم ان سے زیادہ مذہبی ہیں کہ جب کسی کافر بدن کو دیکھا فوراً اسے چار کلمے

پڑھانے کا سوچنے لگے یہی نہیں ہم تو جوتی تک پسند کرنے کے لیے شوز سٹور کی بجائے مسجد جاتے ہیں۔

دوران گفتگو دائیں بازو کا اس قدر استعمال کرتے ہیں جتنا جماعت اسلامی والے درمیان گفتگو۔ غصے کے اس قدر تیز ہیں کہ آپ کی جس بات پر انہیں غصہ آتا ہے وہ بات ابھی پوری نہیں ہوتی ان کا غصہ پہلے پورا ہو چکا ہوتا ہے۔ محبت میں پہل کرتے ہیں مگر نفرت میں آخر نہیں کرتے۔

بحیثیت انسان وہ ان شاعروں' ادیبوں سے بھی بڑے ہیں جنہیں وہ خود سے بڑا کہتے ہیں۔ یوں بھی اگر آپکو کسی مکمل انسان کی خوبیاں تلاش کرنا ہیں تو نبیوں' ولیوں کے بعد صرف بچے ہی ملیں گے۔ البتہ اگر کسی مکمل انسان کی خامیاں تلاش کرنا ہیں تو کہیں جانے کی ضرورت نہیں' ماشاء اللہ آپ خود مکمل انسان ہیں۔

بچوں کے ساتھ اتنی جلدی دوستی کر لیتے ہیں جتنی جلدی بچے بڑوں کے ساتھ کرتے ہیں بچوں میں بیٹھے ہوں تو بزرگ نہیں ہوتے' بزرگوں میں بیٹھے ہوں تو پھر بھی بزرگ نہیں ہوتے۔

ہم عصر انہیں بڑا تخلیق کار مانتے ہیں حالانکہ ہمارے عام قاری ادیب کو اس کی بہترین تخلیق کے حوالے سے جانتا ہے اور ہم عصر ادیب کمزور ترین تخلیق کے حوالے سے۔ ہم عصروں میں ان کا کوئی "ہم عصر" نہیں۔ شاعروں میں مائنڈ دوسروں سے ڈبل ہوتا ہے اسی لیے ہمارے اکثر شاعر ڈبل مائنڈڈ ہوتے ہیں۔ ایسی حرکت کریں گے جس کا نتیجہ اگر برکت ہے تو یقیناً برکت بی بی ہو گا مگر قاسمی صاحب کی حرکات و سکنات ایسی ہیں کہ شاعر نہیں لگتے۔ بدصورتی میں بھی خوبصورتی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہ بھی اچھے شاعر سے زیادہ اچھے شوہر کی خوبی ہے۔ مگر وہ جو کچھ کہنا چاہیں منہ پر کہتے ہیں۔ یہی سچے شاعر کی نشانی ہے کہ جو بات آپ کہنا چاہیں مکمل طور پر نہ کہہ سکیں تو آپ شاعر نہیں شوہر ہیں۔

شعر کہنا ان کے نزدیک بہت مشکل کام ہے اور اس سے مشکل صرف ایک کام ہے اور

وہ ہے شعر نہ کہنا۔ انہوں نے لکھ کر گھر کا چولہا چلایا حالانکہ دوسرے ادیبوں کی تحریروں سے ان کے گھر والوں کو چولہا چلاتے تو نہیں البتہ چولہا جلاتے ضرور دیکھا ہے۔

ہمارے ادیب شاعر ناکامی کا صدمہ برداشت کر لیتے ہیں مگر ان سے کامیابی کا صدمہ برداشت نہیں ہوتا' اگر ہوتا ہے تو پھر بندہ احمد ندیم قاسمی ہوتا ہے۔ انہیں لوگوں نے گالیاں بھی دیں' عزت بھی دی' جو جو کچھ کسی کے پاس تھا' دیا۔ جس شخص کا دشمن کوئی گھٹیا نہیں وہ خود گھٹیا ہے۔ ویسے وہ جتنا خیال سگریٹ خریدتے وقت اس کی کوالٹی کا کرتے رہے' اتنا دوست بناتے وقت کر لیتے تو آج ان کا کوئی گھٹیا دشمن نہ ہوتا۔ کہتے ہیں ایک زمانے میں بہت سگریٹ پیتے تھے' حالانکہ وہ اتنے کم سگریٹ پیتے تھے کہ میں نے انہیں ہمیشہ ایک ہی سگرٹ پیتے دیکھا۔

صحت ایسی کہ جوانی میں کوئی شاعر ان کے ساتھ سیر کو نکلتا تو شاعر کے لواحقین اسے امام ضامن باندھ کر رخصت کرتے۔ ایک بار ایک شاعر کے ساتھ سیر کو نکلے' دو تین میل کے بعد جب شاعر موصوف گرنے لگے تو کہا "بس تھوڑی دور اور' کھلی جگہ آجائے تو سیر شروع کرتے ہیں۔"

ہوسٹل میں رہنا اپنے آپ میں رہنا ہے۔ ایک عرصہ ہوسٹل میں رہنے سے ایسے بن گئے ہیں کہ اب جہاں ایک عرصہ رہ جائیں ہوسٹل بن جاتا ہے۔ وہ تو جتنی دیر جیل میں رہے' جیل ہوسٹل رہا۔ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ ویسے بھی ہماری اکثر کتابیں ایسی ہیں کہ ان کا بچھونا ہی بنایا جا سکتا ہے۔ جس دن کام کا موڈ ہو بستر کے پاس کتابوں کا ڈھیر لگا لیں گے اور جس دن عیاشی کا موڈ ہو اس دن کتابوں کے ڈھیر کے پاس بستر لے جائیں گے۔

مرد کے پیٹ میں اچھی بات ہو تو اس کا دھیان مٹھائی کی طرف جائے گا اور عورت کے پیٹ میں اچھی بات ہو تو کھٹائی کی طرف۔ دفتر "فنون" میں احمد ندیم قاسمی کی امامت میں پنجگانہ با جماعت مٹھائی تقسیم ہوتی' پہلے اس خوشی میں کہ آج خالد احمد نہیں آیا اور پھر اس خوشی میں کہ آج خالد احمد آیا ہے۔

جس شخص نے کبھی دھوکہ نہیں کھایا وہ مخلص نہیں ہو سکتا اور آپ تھوڑی سی کوشش کرکے احمد ندیم قاسمی کو مخلص ثابت کر سکتے ہیں۔ شراب کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو ہمارے ہاں شرابیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ انگریزی پر اس قدر عبور ہے کہ ایک فقرہ بھی ادا کریں تو لگتا ہے عبور کیا ہے۔ سارا دن کام کرتے نہیں تھکتے لیکن اس دن تھک کے چور ہو جاتے ہیں جس دن انہیں کوئی کام نہ ہو۔ دوستوں کا کام جلد کر دیں گے کہ ان کا وقت بچے اور دشمنوں کا کام فوراً کر دیں گے کہ اپنا وقت بچے۔

اس قدر ست ہیں کہ صبح سات بجے اٹھیں تو کہیں آٹھ بجے جا کر اس حالت میں ہوں گے جس میں دفتر جاتے ہیں جبکہ خالد احمد اس قدر تیز ہیں کہ صبح آٹھ بجے اٹھیں تو سات بجے اس حالت میں ہوں گے کہ جس میں دفتر جاتے ہیں احمد ندیم قاسمی دیکھنے میں بڑے افسر لگتے ہیں اور اس وقت تک رہتے ہیں جب تک دوسرا خود کو افسر سمجھتا ہے۔ آپ دس غلطیاں کریں تو ایک بار ڈانٹیں گے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آپ باقی نو غلطیاں بعد میں کرتے ہیں۔ مخالفوں کے لیے وہ سیسہ پلائی دیوار ہیں یعنی ساکت۔ انہیں اپنے اوپر گرانے کے لیے کافی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ جس صحافی کو کوئی ناپسند نہ کرے اور جس شاعر کو کوئی پسند نہ کرے وہ بڑا بد قسمت ہوتا ہے۔ اور احمد ندیم قاسمی بڑے خوش قسمت ہیں۔

تنقید لکھنے سے بندہ بوڑھا لگنے لگتا ہے اور پڑھنے سے ہو بھی جاتا ہے۔ مگر ان کی تنقید بڑی جوان ہوتی ہے لیکن انہیں اپنے گھر میں کوئی نقاد نہیں مانتا۔ شاید یہی ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز ہے۔

ان کی وجہ سے بڑا ادب پیدا ہوا' اور بڑا ادب وہ ہوتا ہے جو کسی شخصیت سے مل کر آپ کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے ادیبوں کی بھلائی کے لیے بہت کچھ کیا حالانکہ میرے خیال میں ادیبوں کی بھلائی کے لیے یہی کافی ہے کہ پبلشر کے دفتر کے ساتھ ان کے لیے ایک ایمرجنسی وارڈ بنوا دیا جائے۔ ویسے آج کل رائٹرز اور پبلشرز میں بڑی ذہنی ہم آہنگی ہے' دونوں کی سوچیں ملتی ہیں۔ پبلشر سمجھتا ہے وہ رائٹر کو بیوقوف

بنا رہا ہے اور رائٹر بھی یہی سمجھتا ہے کہ پبلشر مجھے بیوقوف بنا رہا ہے۔
وہ ایسے قلمکار ہیں جن کے قلم میں روشنائی کی جگہ انا بھری ہوئی ہے۔ فن پیری کے علاوہ

ہر فن میں مکمل' ان سا نامکمل بڑھاپا گزارنے کے لیے مکمل جوانی چاہیے۔ ان کے نزدیک ہر چھوٹا آدمی جب کام کر رہا ہو' بڑا ہوتا ہے اور ہر بڑا آدمی جب کام نہ کر رہا ہو' چھوٹا ہوتا ہے۔

اگر پورا لاہور آپ کو اچھا کہہ رہا ہو اور ایک شخص اس بات پر یقین نہ کرے تو یقین کر لیں وہ آپ کا قریبی دوست ہو گا اور اگر دوست کسی قریبی دوست کی تعریف کر رہا ہے تو یقین کر لیں کہ وہ جس شخص کی بات کر رہا ہے وہ احمد ندیم قاسمی ہے۔

یہ وہ چراغ ہے جس تلے اندھیرا نہیں اور روشنی ایسی کہ قریب آ کر مکڑے جگنو بن جاتے ہیں۔ آج کے نقادوں کے لیے انہیں مکمل سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے سورج سے سگریٹ سلگانے کی کوشش کرنا اور انگارے سے یہ کام کروا کر کہنا کہ سورج میں گرمی انگارے سے کم ہے۔ وہ کسی بھی دور میں قیمتی ادیب نہیں رہے کہ کسی بھی دور میں ان کی قیمت نہیں لگی۔ انہیں کسی خاص دور سے منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ دور خود کو ایسے لوگوں کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

○○○

• بائیں کاندھے کا فرشتہ

ہمارے ہاں اکثر شاعر ادیب کہتے ہیں کہ انہوں نے پہلی جماعت ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی تحریریں پڑھ کر ایسا ہی لگتا ہے۔ لیکن ممتاز مفتی کو پڑھ کر لگتا ہے انہوں نے جوانی میں لکھنا شروع کیا اور نصف صدی قبل مفتی صاحب کی عمر جوانی پر آ کے رک گئی۔

ممتاز مفتی کا قد کاٹھ ایسا ہے کہ بندہ اسے ایک آنکھ بند کرکے بھی دیکھ سکتا ہے۔ اپنی شکل و صورت میں اس قدر نقص نکالتے ہیں کہ لگتا ہے کہ انہیں اللہ نے نہیں پی ڈبلیو ڈی نے بنایا ہے۔ کانوں سے نہیں آنکھوں سے سنتے ہیں۔ بولتے بھی آنکھوں ہی سے ہیں۔ کہتے ہیں "مجھے زبان پر قدرت نہیں" ٹھیک کہتے ہیں انہیں اپنی زبان پر قدرت نہیں البتہ اردو زبان پر ہے۔

عورتیں اسی مقصد کے لئے شادی کرتی ہیں جس کے حصول کی خاطر مرد شاعری کرتے ہیں لیکن اب دالان سے میدان تک لڑکیاں لڑکوں سے آگے ہیں۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں کہ میں نے کالج میں لڑکوں کو ہمیشہ لڑکیوں کے پیچھے ہی دیکھا ہے۔ مگر ممتاز مفتی عورت مرد دونوں کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ اگر عورت طرار اور مکار ہو تو مقصد بھی وہی جو ایک آنکھ بند کرکے دیکھنے کا ہوتا ہے۔ وہ بچوں کو اس قدر پسند کرتے ہیں کہ جب بھی عشق کیا بچوں والی عورت سے کیا۔ لڑکیاں تو اس کے لئے سپریم کورٹ ہیں یعنی نو اپیل۔ خوبصورت عورت کے منہ سے ہاں ایسا ہی لگتا ہے جیسے خوبصورت کے منہ سے ناں۔ لیکن وہ محبت بھی اس سے کریں گے جس سے زیادہ سے زیادہ ہمدردی ہی کی جا سکتی ہے اور وہ بھی یوں جیسے مفتی مفت کی مونث ہو۔

ہر وقت عورتوں پر جان اور پان چھڑکنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ انہیں مردوں کے چہرے یاد نہیں رہتے' انہیں تو اپنا چہرہ یاد نہیں رہتا اور یہی ان کے خوش رہنے کا راز ہے۔

قدرت اللہ شہاب کے ساتھ رہنے سے اس قدر مذہبی ہو گئے ہیں کہ دائیں بائیں عورتیں بیٹھی ہوں تو لگتا ہے بار بار سلام پھیر رہے ہیں۔

دنیا میں جو فقرے سب سے کم توجہ سے سنے جاتے ہیں وہ نصیحت کے ہوتے ہیں اور جو سب سے زیادہ انہماک سے سنے جاتے ہیں وہ وصیت کے۔ مفتی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کبھی نصیحت نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں دیکھ کر بندے کا دل بے اختیار نصیحت کرنے کو چاہنے لگتا ہے۔

ان کے ہاں توازن نہیں۔ کبھی وہ الہیٰ و اہلیہ کے سامنے عبادت گزار لگتے ہیں تو کبھی عدت گزار۔ خدا سے یوں محبت کرتے ہیں جیسے کسی عورت سے کر رہے ہوں اور عورت سے یوں جیسے خدا سے۔

ممتاز مفتی کے ہاں جس کی لاٹھی' اس کی لاٹھی ہی ہے۔ بھینس تو رانجھا ہی چارے گا۔ انہیں رانجھا اچھا لگتا ہے کیونکہ پنجاب میں جو کسی عورت کو شادی سے پہلے بھگا کر لے جائے اسے مرزا اور جو شادی کے بعد بھگائے اسے رانجھا کہتے ہیں۔

اس قدر سادہ ہیں کہ اگر کوئی ان سے رائے مانگے تو سچ مچ رائے دے دیتے ہیں تنہائی پسند ہیں یعنی جسے پسند کرنا ہو تنہائی میں کرتے ہیں۔ کبھی کسی کے محتاج نہیں رہے۔ انہیں پتہ تھا کہ ایک عمر آتی ہے جب مرد کو حکیم کا محتاج ہونا پڑتا ہے اور انہوں نے وقت آنے سے پہلے ہی حکمت سیکھ لی۔

اس قدر سچے آدمی ہیں کہ جھوٹ بھی بولیں تو لگتا ہے جھوٹ بول رہے ہیں۔ دوران گفتگو وہ نہیں سنتے جو آپ کہہ رہے ہیں' وہ سنتے ہیں جو آپ نہیں کہہ رہے۔اچھی بات نہیں کرنا چاہتے مگر یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بات اچھی لگے۔ ان کی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بندہ سوچتا ہے سمجھنے کا کوئی فائدہ نہیں اور کہانیاں ایسی کہ بندہ سمجھتا ہے سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

سننے میں بوڑھے ' کہنے میں جوان اور کرنے میں بچے۔ انہوں نے اپنی دنیا بنائی' دنیا کو اپنا نہیں بنایا۔ اپنی حماقتیں یوں بیان کرتے ہیں جیسے کارنامے بیان کر رہے ہوں اور

کارنامے یوں بتاتے ہیں جیسے حماقتیں گنوا رہے ہوں۔ جس لئے ہم جھوٹ بولتے ہیں اسی مقصد کے لئے وہ سچ بولتے ہیں۔

وہ مختلف حالات کے لئے پہلے خود کو ذہنی طور پر تیار کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے خود کو غم کے لئے تیار کیا ہو اور اچانک خوشی مل جائے تو انہیں بڑا غم ہو گا۔

ان کی اور ان کے کمرے کی بے ترتیبی دیکھ کر لگتا ہے کہ جتنی محنت سے یہ بے ترتیبی پھیلائی گئی ہے اس سے کم محنت اور وقت میں ترتیب لگائی جا سکتی ہے۔ سست اس قدر ہیں کہ پچاسی سال کی عمر میں وہ کام کرتے ہیں جو انہیں پچیس سال کی عمر میں کر لینے چاہئیں تھے۔

ان کی لمبی عمر اور صحت کا راز ڈاکٹروں کے مشوروں میں ہے یعنی ڈاکٹروں نے جو مشورہ دیا' انہوں نے بالکل الٹ کیا اور صحت مند رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی سے یہ سبق سیکھا کہ زندگی سے سبق نہیں سیکھنا چاہیے۔

لکھنے سے پہلے نہیں سوچتے' اسی لئے ان کا لکھا پڑھنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے۔ جتنا انہوں نے لکھا اتنا تو ہمارے ادیب پڑھتے نہیں۔ "مفتیانے" اور "علی پور کا ایلی" تو اس قدر وزنی ہیں کہ لگتا ہے آج نہیں تو کل کوئی نہ کوئی سلمنگ سنٹر انہیں اپنے نصاب میں ضرور شامل کر لے گا۔ کہتے ہیں ممتاز مفتی کی تحریریں پڑھ کر بچہ جوان ہو جاتا ہے۔ مجھے بوڑھے ایسے ہی لگتے ہیں جیسے بڑھاپا۔ لیکن جانتا ہوں جسے ہم پچاسی سالوں میں بوڑھا نہ کر سکیں اسے کبھی بوڑھا نہیں کر سکتے۔ اردو ادب میں لمبی لمبی عمر کے بچے تو ملیں گے' اتنا طویل عمر جوان نہ ملے گا جس کی وجہ سے ہم اردو افسانے کی تاریخ سنہ "ق۔م" یعنی قبل مفتی میں لکھ سکتے ہیں۔

○○○

- **سندھی گاندھی**

ہم سمجھتے ہیں' بھارت والے مہاتما گاندھی کی اس لیے پوجا کرتے ہیں کہ ان کے نام "گاندھی" میں ہندوؤں کی سب سے مقدس ہستی آتی ہے۔ وہ ہے "گاں" یعنی گائے اور ساتھ "دھی" بھی ہے۔ گائے دودھ کی فیکٹری ہے جس کی چار ٹانگیں اور ایک دم ہوتی ہے' جو دم نہیں لینے دیتی۔ بچپن میں ماسٹر جی ہم سے پوچھتے۔ "کن کن چیزوں میں دودھ ہوتا ہے؟" تو ہم کہتے۔ "چائے اور گائے" سو گاں دھی ہمارے لیے کھانے کی چیزیں ہیں۔ پھر پتہ نہیں جی ایم سید کو سندھی گاندھی کیوں کہا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی طرح ان کا لباس بھی ایسا نہیں ہوتا' جیسے ہو تو لوگ یہ نہ کہیں کہ اس نے جسم چھپا رکھا ہے۔ یہی کہیں کہ جسم نے لباس چھپا رکھا ہے۔ پھر بھی گاندھی جی کی لنگوٹی اتنے کام کی تھی کہ اب تک ان کے محاوروں اور ہمارے محاروں میں استعمال ہوتی ہے۔ ان سے قبل ہمارے پاس سرحدی گاندھی تھے۔ ان تینوں گاندھیوں میں ہمیں تو خرابی صحت کے علاوہ اور کچھ مشترک نظر نہیں آیا۔ مہاتما گاندھی اتنے سوم تھے کہ آپ انہیں مہاتما سوموار کہہ سکتے ہیں۔ مہاتما بدھ کو آپ پہلے ہی جانتے ہیں۔ سندھی گاندھی سید ہیں۔ یوں آپ انہیں مہاتما جمعرات کہہ سکتے ہیں۔

پہلی بار ایسے سید گھرانے میں آنکھ کھولی' جہاں بچے کو پیٹنے سے پہلے بھی بسم اللہ شریف پڑھی جاتی ہے۔ البتہ دوسری بار کراچی کے آنکھوں کے ہسپتال میں آنکھ کھولی۔ بچپن میں غلام مرتضٰی تھے' پھر جی ایم ہو گئے۔ نام کے ساتھ بعد میں سید یوں لکھتے جس طرہ ہم جیسے ایم بی بی ایس لکھتے ہیں۔ گزشتہ تیس چالیس سالوں سے جو اہم کام کر رہے ہیں' وہ بوڑھا ہونا ہے۔ بہرحال اب وہ واحد سیاست دان ہیں جن کو بندہ کہہ سکتا ہے کہ اب آپ بوڑھے نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ ان کی مزید پندرہ بیس سال ہونے کی خواہش ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بوڑھے بھی انہیں بزرگ سمجھتے ہیں۔ بڑھاپے میں

آدمی دوسری بار بچپن گزار رہا ہوتا ہے' مگر اسے سمجھانے کے لیے گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا۔ سندھی گاندھی بھی اپنا دوسرا بچپن گزار رہے ہیں' یقین نہ آئے تو ان کی باتیں سن لیں۔ ان کی سالگرہ پر ایک نوجوان سیاست دان نے کہا۔ "میری خواہش ہے کہ میں آپ کی سویں سالگرہ میں بھی شرکت کروں تو انہوں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا' بظاہر تو تمہیں دیکھ کر مجھے یہی امید ہے کہ تم میری سویں سالگرہ میں شرکت کے لیے موجود ہو گے۔"

اپنا شجرۂ نسب وہاں تک لے جاتے ہیں جہاں نسب ابھی شجر پر ہی ہوتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو خود کو ۴۵ سال سے پاکستانی' چودہ سو سال سے مسلمان اور پانچ ہزار سال سے سندھی کہتے ہیں۔ اپنے سندھ میں پیدا ہونے پر اس قدر فخر کرتے ہیں جیسے یہ سب ان کی ذاتی کوششوں سے ہوا ہو۔ سندھ میں جی ایم سید کا بڑا احترام ہے۔ سندھی تو جس کا احترام کرنا چاہیں' اسے شاہ کہنے لگتے ہیں۔ جیسے دریائے سندھ کو بھی وہ دریائے شاہ کہتے ہیں۔

تحریک خلافت سے سیاست کا آغاز کیا۔ تحریک ختم ہو گئی' مگر وہ خلیفہ ہو گئے۔ مسجد منزل گاہ تحریک کے قائد کے طور پر مسجد کو منزل گاہ بنایا۔ ۱۹۴۳ء میں علیحدہ مسلم ملک کے لیے قرار داد پیش کی۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی قائداعظم کی رفاقت سے ہاتھ دھو لیے' اسی دن سے ہاتھ دھوئے ہوئے ہیں۔ بڑے ڈرانے والے بیان دیتے ہیں' مگر ان کے بیان سن کر رنگ پیلا نہیں پڑتا ہے کہ ان کا بڑا قابل بیان بھی ناقابل بیان ہوتا ہے۔

کہتے ہیں' میں کئی سال آگے دیکھتا ہوں' حالانکہ ان کی نظر ایسی ہے کہ کئی قدم آگے نہیں دیکھ سکتے۔ نظر کی عینک آنکھ سے لگائے رکھتے ہیں' جس کا یہ فائدہ ہے کہ انہیں عینک نظر آتی رہتی ہے۔ جو بات کرنا ہو' لکھ کر کرتے ہیں۔ اب تو یہ حالت ہے کہ جو بات سننا ہو' وہ بھی لکھ کر سنتے ہیں۔ ان کی اتنی کتابیں ہیں کہ اگر ہم ہر سال ایک کتاب لکھیں تو پھر بھی ان جتنی کتابیں لکھنے کے لیے ہمیں دو تین کتابیں

پیدا ہونے سے پہلے لکھنا پڑیں گی۔ ان کی ہر کتاب میں ایک ہی بات ہوتی ہے۔ ایک بار وہ پبلشر کے پاس اپنی نئی کتاب کا مسودہ لے کر گئے۔ پبلشر نے مسودہ ایک نظر دیکھ کر اس میں لگی پن نکال کر رکھ لی اور مسودہ سندھی گاندھی کو واپس دیتے ہوئے کہا۔ "سید سائیں یہ رکھ لیں' اس میں جو نئی چیز تھی وہ میں نے نکال لی ہے۔" لگتا ہے انہوں نے آخری کتاب پہلے لکھ لی' پہلی کتاب آخر میں لکھ رہے ہیں۔ لوگ ان کی کتاب پڑھ کر یہی کہتے ہیں۔ "ہم نے آپ کی کتاب پڑھ لی ہے' اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

سندھی گاندھی اتنے گھر میں نہیں رہتے' جتنے خبروں میں رہتے ہیں۔ ان کی پگڑ اور پگ تلے تاریخ کے قدیم خطے ہیں۔ ان کی ذات ایک خزانہ ہے۔ ویسے سندھ کے جو حالات ہیں' اس میں تو خزانہ بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے زمین میں دبا دیا جائے۔ چہرے پر ایک معصومیت اور مصروفیت۔ ان کے چہرے پر جو چیز سب سے واضح ہے' وہ ان کی عینک ہے جس کے بغیر ان کے لیے کچھ واضح نہیں ہے۔ انہیں تو عینک کے بغیر خواب تک صاف دکھائی نہیں دیتے۔

کتاب چھپوانے سے پہلے ہی اس پر پابندی لگوانے کا انتظام کر لیں گے۔ اگر پابندی نہ لگنے کا پچاس فیصد بھی شک ہو تو نہیں چھپوائیں گے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں پابندی سے وہی کتاب پڑھی جاتی ہے جس پر پابندی لگی ہو۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اس قدر مستقل مزاج ہوتے ہیں کہ چاہیں تو اسپرین کو سر درد لگا دیں۔ وہ ان سیاست دانوں میں سے ہیں جن کا اگر کوئی ذہن تبدیلی کر سکتا ہے تو وہ نیورو سرجن ہی ہو سکتا ہے۔ تلفظ ایسا کہ بہاری کو بھاری کہتے ہیں۔ ان کے پاس سندھ کے ہر مرض کا علاج ہی نہیں' ہر علاج کے لیے ایک مرض بھی موجود ہے۔ تاریخ سے اس قدر لگاؤ ہے کہ جو بھی ملے' اس سے پوچھتے ہیں۔ "آج کیا تاریخ ہے؟" اتنی دیر گھر میں نہیں رہے' جتنی دیر جیل میں رہے۔ سو ان کے لواحقین جیل کو بھی اپنی منقولہ جائیداد سمجھتے ہیں۔

یادداشت ایسی کہ ان کے سامنے ایک بات کئی بار کی جائے تو انہیں یاد ہو گا کہ یہ کتنی بار کی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ پتہ نہ ہو گا کہ کیا بات کی گئی۔ قائل کرنے کی ان میں بڑی صلاحیت ہے۔ وہ آپ کو وقت ضائع ہونے پر لیکچر دے رہے ہوں تو آپ فوراً قائل ہو جائیں گے کہ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ جئے سندھ والے ان کی بات اس قدر مانتے ہیں کہ سندھی گاندھی چپ بھی ہوں تو وہ ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہوتے ہیں۔ ساری زندگی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ انہوں نے تو کبھی شرابی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد الیکشن میں کھڑے نہیں ہوئے۔ کہتے ہیں' میں اتنا بیمار ہوں کہ دو منٹ سے زیادہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کہو جئے سندھ' سندھ میں ہاری ہے تو کہیں گے' جئے سندھ میں سندھی ہاری ہے۔ وہ پہلے پاکستان کے علمبردار تھے' اب الم بردار ہیں۔ اپنی "فطرت" کے باعث اب سندھ اور چھڑی کے سہارے کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔

پاکستان کو اپنا "ٹوٹ انگ" کہتے ہیں۔ ان کے ماننے والے بڑے دنوں سے دن رات ایک کر رہے ہیں۔ اب تو وہاں دن رات ایک ہو بھی گئے ہیں کہ وہاں تو نوکری کے لیے ڈاکومنٹ سے مراد ڈاکو کا منٹ ہوتا ہے۔ شروع سے علیحدگی پسند تھے' جس کا مطلب یہ نہیں کہ جسے پسند کرنا ہوتا' اسے علیحدگی میں کرتے۔ وہ سیاست دان ہیں اور ہمارے ہاں سیاست دان ہوتے ہیں' سائنس دان نہیں ہوتے کہ سائنس دان پہلے اپنے سارے تجربے چوہوں اور خرگوشوں پر کرتا ہے اور سیاست دان براہ راست انسانوں پر۔ پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بنگلہ دیش بنانے والوں کو بنگلہ ملتا ہے نہ دیش۔



• تو تو میں میں

یوں تو ادیبوں' شاعروں کو اپنے بارے میں کچھ لکھنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی' جب ان کا دل چاہے کہ ان کے بارے میں کچھ کہا جائے وہ محفل سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور وہاں بیٹھے ادیب شاعر ان کی چاہت پوری کر دیتے ہیں۔ سو محمد یونس بٹ کے بارے میں کہہ کر میں آپ ہی کا کام کر رہا ہوں۔

دیکھنے میں ایسا کہ ادیب شاعر اسے محمد یونس بٹ کا بیٹا سمجھ کر شفقت سے پیش آتے ہیں۔ قد اتنا کہ اسے ہر دوسرا شخص خود سے بڑا نظر آتا ہے۔ کھڑا ہوا لگتا ہے بیٹھا ہوا ہے۔ چلتا یوں ہے جیسے کشمیر فتح کرنے جا رہا ہو۔

برتھ سرٹیفکیٹ کے حساب سے اپنی پیدائش کے ایک سال بعد پیدا ہوا اور اس سے کئی سال پہلے اس کا نام رکھا جا چکا تھا۔ بچپن میں صحت ایسی تھی کہ والدہ اسے سکول لے کر جاتی تو محلے والے سمجھتے ہسپتال لے کر جا رہی ہے۔ گوجرانوالہ کی روایت کے مطابق ورزش کے لیے اکھاڑے گیا تو استاد پہلوان نے دیکھ کر کہا تمہاری ورزش کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ روزانہ دو کشتیاں دیکھ لیا کرو۔

بچپن ہی اس سے ڈاکٹر بننے کی صلاحیتیں تھیں۔ یعنی ہینڈ رائٹنگ شروع ہی سے

خراب تھی۔ اردو پنجابی میں بہت کچھ لکھا جس سے ادب کو کوئی فائدہ نہ ہوا' اسے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی ہینڈ رائٹنگ بہتر ہو گئی ہے۔

پہلے کارٹون بناتا تھا جب سے ادب میں آیا ہے کارٹون بنانے چھوڑ دیے ہیں' اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ ادب میں کارٹونوں کا کوئی سکوپ نہیں کیونکہ یہ شاعروں' ادیبوں کی تصویروں سے پوری ہو جاتی ہے' تاہم اردو شاعری کے حوالے سے ادب اس کا احسان

ہمیشہ یاد رکھے گا کہ اس نے تمام مواقع ملنے کے باوجود شاعری نہ کی۔ شعروں کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جو لوگ شاعروں کے ساتھ کرتے ہیں۔

یوں تو بچے کا آنسو دنیا میں اس کا سب سے پہلا لفظ ہوتا ہے' لیکن بچپن میں وہ مصیبت میں ہوتا یا کسی کو مصیبت میں دیکھتا تو رونے کی بجائے لکھنے لگتا' یوں اس نے رونے کا کام لکھنے سے لیا۔ آج بھی اس کی تحریریں پڑھ کر یہی لگتا ہے۔ گھر والوں نے جب اسے کسی غلطی کی سخت سزا دینا ہوتی تو اسے کچھ نہ کہتے اور وہ ساری رات سو نہ سکتا۔

دوسروں سے تعلقات یوں ختم کرتا ہے کہ انہیں کئی سال بعد پتہ چلتا ہے اور جن سے نئے تعلقات بناتا ہے انہیں بھی اتنی ہی دیر بعد پتہ چلتا ہے۔ زیادہ لوگوں کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا تا کہ کم سے کم لوگوں کو اس سے مایوسی ہو۔ وہ ہر قسم کے لوگوں کے پاس بیٹھ سکتا ہے مگر اس کے پاس ہر قسم کا آدمی نہیں بیٹھ سکتا۔ کسی کو قائل کرکے دوستی اور محبت نہیں کرتا۔ کہتا ہے جسے میں قائل کر سکتا ہوں اسے کوئی بھی قائل کر سکتا ہے اور جو ہر کسی سے قائل ہو جائے وہ دوستی اور محبت کے قابل کہاں۔ دو قسم کے لوگوں سے ملتے ہوئے ڈرتا ہے۔ ایک وہ جن کے ساتھ رہنا مشکل ہو اور دوسرے وہ جن کے بغیر رہنا مشکل ہو۔ دوست صورت دیکھ کر اور دشمن سیرت دیکھ کر بناتا ہے۔ اس قدر بزدل کہ جسے ناپسند کرتا ہے اسے پتا نہیں چلنے دیتا اور جس سے محبت کرتا ہے اسے بھی پتا نہیں چلتا۔ حالانکہ خاموشی ناپسندیدگی کے اظہار کا بہترین طریقہ سہی مگر محبت کے اظہار کا بدترین طریقہ ہے جس کسی کو سزا دینا چاہے اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اس سے نفرت کرے۔ جس کو چاہے اس کا دشمن نہ بنے' اسے دوست نہیں بناتا۔

ہر چیز سے خوف کھاتا ہے۔ دشمن کی بجائے دوستوں سے باتیں کرتے وقت زیادہ ڈرا ہوتا ہے کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ کر دے جس سے وہ ناراض ہو جائیں۔ اسی لیے

جلد از جلد تنہا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ ہر کام کر سکتا ہے مگر انتظار نہیں کر سکتا۔ انتظار کرتے ہوئے اسے بخار ہو جاتا ہے۔ اور بخار کے درجے سے پتا چلتا ہے انتظار زنانہ یا مردانہ۔

جانتا ہے غلطی کرنا انسان کا کام ہے اور معاف کرنا خدا کا اور وہ وہی کام کرتا ہے جو انسان کے کرنے والا ہوتا ہے۔ جس دن وہ کوئی کام نہ کرے سمجھ لیں آج اسے بہت سے کام ہیں۔

لوگوں کے موڈ اور انداز سے ان کی بات کہنے سے پہلے سمجھ جاتا ہے۔ لیکن لوگ اس کی بات اس کے کہنے کے بعد بھی نہیں سمجھتے۔ دوران گفتگو آپ سمجھیں گے وہ آپ کی بات بڑی توجہ سے سن رہا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے بولنے کی باری کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔

اس کا دل دیہاتی' آنکھیں شہری اور دماغ کسباتی ہے۔ ڈاکٹری کو بیوی اور ادب کو محبوبہ کہتا ہے۔ کھیلوں سے دلچسپی نہیں' کہتا ہے مجھے ایسی جیت نہیں چاہیے جس کے ساتھ کسی کی ہار وابستہ ہو۔

ایک وقت میں ایک سے زیادہ غلط کام نہیں کرتا جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی کام کرتا ہے۔ اردو پنجابی دونوں بولتا ہے مگر کسی زبان میں "ناں" نہیں کہہ سکتا۔

بروں کی نسبت اچھوں سے زیادہ محتاط رہتا ہے کہ برے تو ظاہر ہوتے ہیں خود کو اچھا ظاہر کرنے والوں کا کیا پتا کب برا پیش آئیں۔

کہتا ہے میری کامیابی کا یہ راز ہے کہ سارے کام خود کرو۔ ٹھیک کہتا ہے اس نے یہی بات لوگوں سے کہہ کر کامیابی حاصل کی ہے۔ خوبیوں والے دوستوں کی تلاش کرتا ہے' لیکن اس طرح کہ پہلے دوست تلاش کر لیتا ہے پھر ان کی خوبیاں تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس کے بارے میں بری رائے قائم کرنے کے لیے ایک بار ملنا ہی کافی ہے' البتہ اچھی رائے قائم کرنے کے لیے کئی بار ملنا پڑتا ہے۔

جب وہ لاہور میں آیا تو اسے پورے شہر میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ اب تو بہت لوگ اس کی عزت اور اس سے پیار کرتے ہیں۔ جس سے لگتا ہے کہ اب بھی اسے کوئی نہیں جانتا۔ حکم یوں دیتا ہے جیسے گزارش کر رہا ہو اور گزارش یوں کرتا ہے جیسے حکم دے رہا ہو۔ خدا کے علاوہ کسی اور کی محبت میں شریک نہیں رکھتا۔ اپنی پریشانی کسی کو نہیں بتاتا کہ اس سے پریشانی کم نہیں ہوتی۔ جس موقع پر لوگ دوسروں سے ناراض ہوتے ہیں یہ اس موقع پر خود سے ہی ہوتا ہے۔ پسندیدہ جگہ جہاں سے آسمان نظر آئے' پسندیدہ سواری ٹانگیں۔ اسے وہ کھانا پسند ہے جسے کھانے والے پسند کے ہوں۔

وہ کام نہیں کرتا جو اس سے نہ ہو سکے اور وہ کام بھی نہیں کرتا جو ہر کسی سے ہو سکے۔ جس دن اسے کوئی مسئلہ نہ ہو' پریشان رہتا ہے۔ کہتا ہے مخلوط تعلیمی اداروں میں شریف لڑکی وہ ہوتی ہے جو روزانہ ایک ہی لڑکے سے چائے پیتی ہے اور شریف لڑکا وہ ہوتا ہے جس سے روزانہ مختلف لڑکیاں چائے پیتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ نہ خود کالج کے شریف لڑکوں میں شامل ہو سکا اور نہ اس سے کوئی لڑکی شریف ہوئی۔

جس ماحول میں ہو اسی کا حصہ بن جاتا ہے مگر اس ماحول کو اپنا حصہ نہیں بناتا۔ جن چیزوں کو خریدا جا سکے ان کی اسے خواہش نہیں اور جو بغیر کسی قیمت کے ملیں ان کو لیتا نہیں۔

اس کا پسندیدہ دوست محمد یونس بٹ ہے اور دشمن بھی یہی ہے۔

اس کی ایک عجیب و غریب عادت ہے جس سے ملنے کی نیت بنا کر جائے صرف اسے ہی مل سکتا ہے اگر اس جگہ پر اسے کسی اور سے ملنا ہو تو پھر کمرے میں آ کر اس سے ملنے کی نیت کرکے دوبارہ جائے گا۔

ہر وقت جلدی میں ہوتا ہے جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کی کامیابی کے لیے دن رات ایک کر دیتا ہے اور جونہی کامیابی کے آثار پیدا ہوتے ہیں' اسے چھوڑ کر کوئی اور کام پھر زیرو سے شروع کر دیتا ہے اور اکثر زیرو ہی رہتا ہے۔

• نسوار خانم

نسوار کو دیکھ کر ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ نشہ ہے جسے منہ میں ڈالنے کے لیے بھی بندے کو نشے میں ہونا چاہیے' جیسے لوگ اپنی نالیاں اور نیکیاں دریا میں ڈال دیتے ہیں' ایسے ہی ہم سمجھتے ہیں نسوار منہ میں وہ رکھتے ہیں جن کے پاس اسے رکھنے کے لئے کوئی بہتر جگہ نہیں ہوتی۔ سنا ہے پہلے اسے پریاں کھایا کرتیں۔

ہمارے سامنے تو کوئی پری بھی اسے کھائے تو ہم اسے پری کی بجائے پرے پرے! ہی کہیں گے وہ پری نہیں خانہ پری ہے' جس کے چہرے پر زیر لب مسکراہٹ کی بجائے زیر لب نسوار ہو۔ آج کل ہم نسوار کو پٹھانوں سے چھڑوانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ مختصر پشتو فلموں کی تفصیلی اداکارہ نے اخباری بیان دے دیا کہ میرا رقص دیکھ کر پٹھان نسوار منہ میں ڈالنا بھول جاتے ہیں اس اداکارہ کا رقص دیکھ کر تو لگتا ہے جیسے کوئی وزنی شاہین' مسرت کا اظہار کر رہا ہو۔ ایک ماہر مرگی کے مطابق رقص میں ایسا فٹ لباس پہنتی ہیں کہ دیکھنے والوں کو فٹ پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اگرچہ ہالی وڈ کی فلموں میں بھی کسی اداکارہ سے پوچھو کہ جس دن شوٹنگ کینسل ہو جائے گھر جا کر آپ کیا کرتی ہیں تو یہ کہے گی سب سے پہلے الماری سے پہننے کے لیے کپڑے نکالتی ہوں۔ ہماری پشتو میں تو ہیروئن پرپینٹ کو پینٹ کردیا جاتا ہے۔ اکثر فلمساز فلم بنانے کے لیے چھوٹی بچی کے کپڑے لیتے ہیں' اس میں سب سے بڑی ہیروئین ڈال کر سکرین پر انڈیل دیتے ہیں۔ جیسے اردو شاعری میں جو تراکیب استعمال ہوتی ہیں۔ ایسے ہی اس اداکارہ کا رقص دیکھ کر لگتاہے وہ اپنے قریب ہونے کی کوشش کررہی ہے۔ رقص اعضاء کی شاعری ہے مگر پشتو فلمی رقص' دیکھنے والے کے اعضاء شاعر ہوتا ہے۔ مشہور عالم امریکی ڈانسر اگنس ڈی ملی نے کہا ہے کہ اچھی تعلیم رقص کے لئے نقص ہے' کیونکہ رقص

کے لئے سر سے زیادہ پنڈلیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بقول یوسفی ایران میں نسوانی حسن کا معیار چالیس صفات ہیں۔ مشہور ہے کہ فرہاد کی فریاد شیریں میں انتالیس صفات موجود تھیں چالیسویں صفت کے بارے میں مورخ خاموش ہیں۔ لہٰذا گمان ہے اس کا تعلق چال چلن سے ہوگا۔ ایسے ہی پشتو فلمی رقص کی دس صفات ہیں جس میں پہلی نو کا تعلق یوسفی صاحب کی بیان کردہ انتالیس کا چالیسواں ہے' جبکہ دس نمبری رقاصہ کے لیے سب سے آخری شرط موٹا ہونا ہے کہ پشتو فلمی ہیروئین کسی گنتی میں آئیں نہ آئیں تول میں پوری ہوتی ہیں۔ وہاں تو محاورہ ہے پہلے تولو پھر بولو۔

ہمیں یہ تو پتہ نہیں سب سے پہلے نسوار کس نے دریافت کی' یہ پتہ ہے کہ آج کل پشاور میں ہر تیسرا شخص اسی کے بارے میں دریافت کررہا ہوتا ہے۔ وہاں تو لوگوں کے ہاں تھوکنے کے لئے اگال دان نہیں نسوار ہوتی ہے۔ کہتے ہیں نسوار لینے سے ڈبی پر ہمیشہ شیشہ لگا ہوتا ہے تاکہ بندہ دیکھ سکے کہ اس نے نسوار ہی منہ میں ڈالی ہے جیسے پولیس گن مین سے انسٹرکٹر نے پوچھا:

"گن لوڈ کرتے وقت سب سے پہلے کیا دیکھنا چاہیے؟"

تو اس نے کہا۔

"گن کا نمبر تاکہ پتہ چل سکے کہ اپنی ہی گن لوڈ کررہے ہیں۔"

سنا ہے نسوار کھانے سے مچھر نہیں لڑتے' واقعی نسوار کھانے کے بعد مچھر آپس میں نہیں لڑتے۔ سگریٹ پینے سے منہ اور ناک سے دھواں نکلتا ہے' جبکہ نسوار سے کانوں سے دھواں نکلتا ہے۔ یہ بھی تحقیق ہے کہ نسوار کھانے سے بندے کا سر مضبوط ہو جاتا ہے۔ ہم نے پوچھا اس کا فائدہ؟ جواب ملا' پھر نسوار کھاؤ تو چکر نہیں آتے۔ ویسے ہم خود چکر میں پڑگئے ہیں کیونکہ ثرید اور نسوار کے ذکر ہی سے پٹھانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ انہیں رنگ تک نسواری پسند ہے' ویسے پٹھان ہمیشہ دشمن کو منہ میں رکھنے والی قوم ہیں۔ شاید اس لئے نسوار کو منہ میں رکھتے ہیں تاکہ اسے موقع ملے اور وہ ان کا دماغ چرالے' لیکن غریب پٹھان ہمیشہ سے مفتی اور منشیات سے تنگ ہے۔ ہمارے کئی

جاننے والے نسوار چھوڑنے پر راضی ہیں اور کہہ رہے ہیں ہمیں اس اداکارہ کا رقص دکھایا جائے تا کہ ہم نسوار کو بھول سکیں' لیکن ہمیں خدشہ ہے کہ اگر آج انہیں دکھا بھی دیا تو وہ کل پھر آ سکیں گے کہ کچھ انتظام کرو ہم آج پھر نسوار چھوڑنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے وہ اس عادت بد سے نجات کے لئے مستقل موقع فراہم کرنے کو کہیں۔ سنا ہے اداکارہ کا حسب سابق خاوند ہر گھنٹے بعد نسوار کی چٹکی لیتا ہے' یوں ہنی مون چٹکیوں میں کٹ گیا۔ تاہم بعد میں اس نے کبھی نسوار کو منہ نہ لگایا' ناک میں رکھنے لگا۔ کسی نے کہا ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ کو جب موقع ملے نسوار لے لیتے ہیں تو وہ بولا موقع ملے تو نسوار نہیں لیتا ہاں موقع نہ ملے تو لے لیتا ہوں۔ مگر یہ بھی سنا ہے بعد میں اس نے بالکل نسوار چھوڑ دی تھی مگر اسے ہیروئین لگ گئی تھی اور کئی وکیلوں نے بمشکل اسے اس ہیروئین سے چھڑوایا تھا۔

○○○

• ڈیانا کمپلیکس

صاحب' ابھی ابھی ایک خط نے ہمیں وصول کیا ہے' اگرچہ سیانے کہتے ہیں جوانی میں خط سنبھال کر رکھو تو وہ بڑھاپے میں آپ کو سنبھال کر رکھتے ہیں' مگر پھر بھی ہم سمجھتے ہیں سب سے اچھے خط وہ ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کر پھاڑ دیا جائے' یوں ہمیں اچھے خط نہیں آتے۔ پہلی بات آج سے دس بارہ سال قبل خط آیا تھا اور ہم نے خط بنوانے کی بجائے شیو شروع کر دی۔ خود کسی کو خط اس لئے نہیں لکھا کہ ہم اتنے بد خط ہیں کہ بچپن ہی سے ہماری لکھائی دیکھ کر لوگوں کو شک تھا کہ ہم بڑے ہو کر ڈاکٹر بنیں گے۔ اگرچہ ہمیں ایک دوست نے بڑا قیمتی لیٹر اوپنر یہ کہہ کر دے رکھا ہے کہ "اب مجھے لیٹر اوپنر کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ میری تو شادی ہو گئی ہے' اب یہ تم لے لو" آج اس کے استعمال کا موقع بھی آیا تو تباہ کن خط سے ایک انتباہ نکلا جو یہ تھا کہ 1351ء کے ٹریزن ایکٹ کے تحت جب تک طلاق نہ ہو کوئی دوسرا مرد شہزادی ڈیانا سے شادی نہیں کر سکتا اگر کوئی خلاف ورزی کرے گا تو اس کی سزا موت ہے۔ الحمدللہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان موت سے نہیں ڈرتا' پھر بھی ہم اس خط کو ذاتی معاملات میں مداخلت سمجھتے ہیں جی ہاں چارلس اور ڈیانا کے ذاتی معاملات ہیں' جہاں تک ان کی علیحدگی کی بات ہے تو ساری دنیا میں علیحدگی پسندی کی تحریکیں اٹھ رہی ہیں۔ ہم حلفیہ کہتے ہیں ڈیانا اور چارلس کی طلاق کی وجہ وہ نہیں ہے جو خط لکھنے والے نے سمجھی ہے یوں ہم مکتوب الیہ بلکہ معتوب الیہ نہیں ہیں۔ ڈیانا اور چارلس کی طلاق ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ ان کی شادی ہوئی تھی' لوگ کہتے ہیں چارلس اتنا معمر ہو گیا تھا کہ اسے ڈیانا کا نام بھی یاد نہ رہتا' حالانکہ اگر خاوند کو اپنی بیوی کا نام بھولنے لگے تو اس سے خاوند سے زیادہ بیوی کے معمر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ بندے کو دوسروں کی بیوی کا نام بھولنے لگے تو سمجھ لیں وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ ڈیانا تو خود کشیدہ

کاری کی ماہر تھیں' یوں حالات کشیدہ اور کاری ہوتے گئے پھر اب وہ زمانہ نہیں جب کہانی کا اختتام یوں ہوتا ہے "پھر شہزادہ شہزادی علیحدہ ہو کر ہنسی خوشی رہنے لگے۔" مغرب کے رشتے تو بس اتنے پائیدار ہیں کہ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے۔

اک ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے

انگریز خواتین میں یہی خوبی ہے کہ وہ تو گالی دینے کے لئے بھی منہ نہیں نتھنے ہی کھولتی ہیں۔ لندن میں تو کتے بھی کسی اجنبی پر اس وقت تک نہیں بھونکتے جب تک اس کاان سے تعارف نہ کروایا جائے جبکہ ہمارے ہاں تو کوئی کہے کہ میں ایسی خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہوں جسے میں جو مرضی کہوں وہ آگے سے ایک بار بھی جواب نہ دے تو دوسرا سمجھتا ہے یہ ٹیلی فون آپریٹر سے شادی کرنا چاہتا ہے' ڈیانا کی خوبصورتی اس کی خاموشی میں ہے وہ بڑی سیدھی سادھی بلکہ سیدھی سیدھی ہے' اس کے نام پر وہاں ایک جہاز کا نام رکھا گیا تو سارا دن سوچتی رہی کہ اس میں اور مجھ میں کونسی مماثلت ہے۔ یاد رہے جہاز کے پشتے کمزور تھے اور وہ بال برداری کے کام آتا تھا۔ وہاں ایک کمپلکس کا نام فرگوسن کمپلکس بھی رکھا گیا کیونکہ اس میں صرف کروڑ پتی تاجر ہی قیام کرتے تھے۔ اگرچہ فرگوسن ٹریکٹر تو اب بھی مارکیٹ میں ہیں جن کی خوبی یہ ہے کہ غلط راستوں پر بھی صحیح چلتے ہیں۔ اب فرگوسن کمپلکس کو ڈیانا بنا دیا گیا' پوچھا یہ کیسے کیا؟ تو جواب ملا عمارت کی اوپر والی منزل خالی کر کے' اگرچہ ڈیانا نے کہا ہے یہ میرا نہیں لوگوں کا کمپلکس ہے۔ شہزادی کی طلاق کا سن کر صرف ایک بندہ

رنجیدہ ہوا اور وہ شہزادہ ولیم ہے' ماں باپ کو سمجھا بھی نہیں سکتا یہ اس لئے مشکل ہے کہ بچوں کو ماں باپ جب ملتے ہیں تب وہ اتنے بڑے ہوچکے ہوتے ہیں کہ بچوں سے ان کی تربیت نہیں ہوسکتی۔ اگرچہ اس کی ضرورت ہمیشہ سے رہی ہے۔ 301 قبل مسیح کا فلاسفر زینو تو اپنی درس گاہ میں کسی نوجوان کو گھسنے نہ دیتا تھا کہتا سمجھانے کی ضرورت صرف پکی عمر اور پختہ کار لوگوں کو ہوتی ہے۔

ڈیانا کی طلاق کی خبر پہنچتے ہی لوگوں نے اس کافر حسینہ کو چار کلمے پڑھانے کا سوچنا شروع کردیا تھا۔ اسی لیے مغربی پری نے ٹریزن ایکٹ والی وارننگ مسلم ممالک بالخصوص عرب ممالک میں فوراً شائع کروادی تاکہ کوئی بے خبر نہ مارا جائے' اگرچہ ہمارے ہاں کی شادی میں ان کے ہاں سے زیادہ شادی ہوتی ہے لیکن وہ ہماری کوالٹی کی بجائے کوانٹیٹی پر ہی نظر رکھتے ہیں' ہمارے ایک معروف سفر نامہ نگار سے ایک مغربی خاتون سے پوچھا آپ کی کتنی بیویاں ہیں؟ اس نے کہا "ساڑھے تین تو" وہ حیران ہو کر بولی "ساڑھے تین سو' اتنی کیوں؟" کہا "اس لئے کہ میں وہاں کا غریب بندہ ہوں اس سے زیادہ افورڈ نہیں کرسکتا" ہم ڈاکخانے کو خطوں کا قبرستان کہتے ہیں اگرچہ اردو ادب میں ڈاکیے کو نامہ بر کہا گیا ہے لیکن پنجابی زبان میں نامہ بر کے لیے ایک برا سا لفظ ہے ہمیں یہ اسی کی شرارت لگتی ہے' ویسے بھی ہم جب سے نئے کمرے میں شفٹ ہوئے ہیں ڈاکیا پہلے رہنے والے صاحب کے خط بھی اندر ڈال جاتا ہے۔ ایک دن ہم نے کہا یہ ڈاک تم غلط پتے پر کیوں پھینک جاتے ہو' تو کہنے لگا میں تو صحیح پتے پر ڈاک پھینکتا ہوں آپ غلط پتے پر رہ رہے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے یہ خط غلام مصطفیٰ کھر کا ہے جو غلطی سے ہمیں مل گیا ہے۔ بہرحال اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ہاں غلطیوں کا معیار بہتر ہو گیا ہے۔

• صدام سنڈروم

ہمارے ہاں غیر حاضر دماغ ہونا بڑی صفت ہے جو اکثر بڑے پڑھے لکھے لوگوں اور پروفیسر صاحبان میں ہوتی ہے۔ صاحب! ٹیچنگ اچھا پروفیشن ہے بس اس میں مسئلہ یہ ہے کہ کبھی کبھی کلاس بھی پڑھانا پڑتی ہے اور اصل پروفیسر وہی ہوتا ہے جسے یہ یاد نہ ہو کہ وہ کلاس پڑھانے جارہا ہے یا پڑھا کے آرہا ہے۔ ہمارے اپنے پروفیسر صاحب ایک دن کہنے لگے ہیں صبح چھتری لے جانا بھول گیاتھا۔ ہم نے پوچھا آپ کو کیسے پتہ چلا کہ آپ چھتری لے جانا بھول گئے۔ کہا: بارش کے بعد جب میں نے چھتری بند کرنے کے لیے ہاتھ اوپر کیا تو وہاں نہ تھی۔ ایک تازہ خبر کے مطابق یہ پروفیسرانہ صفت خلیج کی جنگ میں شرکت کرنے والے امریکی فوجیوں میں پائی جارہی ہے۔ امریکہ کے ذہنی امراض کے ماہر ڈاکٹر جو ذہنی امراض کا بیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں ان کی شکل دیکھ کر تو لگتا ہے ان امراض میں مبتلا ہونے کا بیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس صفت کو بیماری قرار دے کر اس کا نام "ڈیزرٹ سٹارم سنڈروم" رکھ دیا ہے۔ کہتے ہیں ڈاکٹر او بیماری کا تو دن رات کا ساتھ ہوتا ہے ویسے یہ ضروری بھی نہیں کچھ ڈاکٹر غیر شادی شدہ بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف جو مرض کو مرضی کا مونث سمجھتے ہیں ان کے مطابق ڈیزرٹ سٹارم سنڈروم میں مبتلا لوگوں کی یادداشت اتنی کمزور ہوجاتی ہے کہ انہیں اتنا بھی یاد نہیں ہوتا کہ پچھلے ہفتے وہ زندہ تھے بھی یا نہیں۔

امریکہ کے بارے میں ہماری وہی رائے ہے جو امریکہ کی ہمارے بارے میں ہے لگتا ہے انہوں نے حافظہ کمزور ہونے کو بیماری قرار دے کر دراصل ہمیں بیمار کہا کیونکہ ہمارے عوام میں یہی تو خوبی ہے کہ وہ بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ ہمارے ایک سیاستدان جن کا تعلق ملک کے بڑے بڑے شوہروں میں ہوتا ہے وہ اپنے حلقے سے دوبارہ جیتے تو ہم نے پوچھا "آپ اس لیے جیتے ہیں کہ آپ نے اپنے حلقے میں جو کام کئے وہ عوام

کو یاد تھے" کہا "یاد نہیں تھے اسی لیے تو جیتا" ہمیں خود یہ بات نہیں بھولتی کہ ہماری یادداشت بہت کمزور ہے۔ ہم نے یادداشت تیز کرنے والی دوائی لیکن افاقہ نہ ہوا کیونکہ دوائی کھانا یاد نہ رہتا۔ امریکی خواب نہیں دیکھتے جس کی وجہ تو یہی ہے کہ وہ ایک بیدار قوم ہے اور خواب سوئے ہوئے لوگوں کو آتے ہیں۔ امریکی بہت کم بیمار ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کسی کے پاس بیمار ہونے کیے لیے وقت ہی نہیں۔ امریکہ بزنس اوربزی نس کا نام ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈیزرٹ سٹارم سنڈروم کی علامات میں بتایا ہے کہ بندے کی یاد داشت ختم ہو جاتی ہے اور پھر زندگی ختم ہو جاتی ہے اس سے تو لگتا ہے کہ یہ فوجی جس مرض میں مبتلا ہیں وہ بڑھاپا ہے۔ بڑھاپے میں یادداشت کا یہ حال ہوتا ہے کہ گوجرانوالہ کے ایک خلیفہ پہلوان کہتے ہیں مجھے یاد ہی نہیں رہتا کہ میں کھانا کھا کے بیٹھا ہوں یا کھانا کھانے بیٹھا ہوں۔ وہ کھانا کھا رہے ہوں تو یہ نہیں کہتے کہ بس اب پیٹ بھر گیا ہے یہ کہتے ہیں بس اب میں تھک گیا ہوں۔ پھر امریکہ میں اپنی خامیوں کو بھول جانا یادداشت کی خرابی نہیں البتہ انہیں یاد رکھنا یادداشت کی خرابی ہے۔ جہاں تک مرنے کا تعلق ہے تو ہر کوئی مرتا ہے البتہ نہ مرنا حیرانی کی بات ہوسکتی ہے امریکی تو کولمبس کے بارے میں بھی حتمی طور پر اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ مرچکا ہے ہم سمجھتے ہیں امریکی فوجی جس بیماری میں مبتلا ہیں وہ صدام ہے۔ امریکی صدام اور جذام کا شرطیہ خاتمہ چاہتے ہیں۔ شرطیہ علاج ویسے ہمارے ہاں ہی ہوتا ہے۔ فیصل آباد کے ایک ڈاکٹر نے شرطیہ کہا کہ ہفتے کے علاج سے عینک چھڑا دوں گا۔ واقعی ایک ہفتے کے بعد علاج کروانے والے نے عینک لگانا چھوڑ دی کیونکہ اب اسے عینک کے ساتھ بھی نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ جہاں تک یادداشت کا تعلق ہے تو امریکی فوج خلیج کی جنگ میں شرکت سے پہلے بھی ایسے ہی تھے جب خلیج کی جنگ شروع ہوئی تو ایک امریکی فوجی نے کہا تھا میں لڑنے کے قابل نہیں ہوں کیونکہ میں بھول جاتا ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے اپنے گھر میں تھا تو بھی بھول گیا۔ پوچھا "کیا بھول گئے؟"

کہا "گھر میں ٹھہرنا بھول گیا" ویسے اگر بھول جانا مرض ہے پھر بھی کوئی اس میں مبتلا نہ ہو گا جو ہو گا وہ بھول جائے گا کہ وہ اس میں مبتلا ہے ویسے بھی اتنی احتیاطی تدابیر ایسے مریض کو نہیں کرنا چاہئیں ہوتیں جتنی ڈاکٹروں کو کرنا پڑتی ہیں۔ ماہر ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق مرض نیسان میں مبتلا شخص کا معائنہ کرتے وقت ڈاکٹر کو خصوصی احتیاط کرنا چاہیے اور وہ احتیاط یہ ہے کہ فیس ایڈوانس لے لینا چاہیے اور یہ احتیاط ہر امریکی سے برتنا چاہیے۔



• مملکت مجازی خداداد

کہتے ہیں دور کے ڈھول سہانے یہ ہے بھی سچ دور کے ڈھول سہانے لگتے ہیں بشرطیکہ وہ اتنی دور ضرور ہوں کہ ان کی آواز سنائی نہ دے۔ ایسے ہی ہم ماسٹرز اینڈ جانسن کی کتابیں پڑھ پڑھ کر سمجھتے تھے ان سے خوش میاں بیوی تو کوئی دنیا میں نہ ہو گا۔ وہ یورپ جہاں کوئی پوچھے کہ طلاق سے بچنے کے لے کیا احتیاط کریں تو اگلا کہے گا شادی سے احتیاط کریں۔ وہاں ایک سروے کے مطابق پندرہ سالوں میں طلاق کی شرح 30 فیصد کم ہوئی تو ماہرین نے اس کی جو وجوہ بتائیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ لوگ ماسٹرز اینڈ جانسن کی کتابیں پڑھتے ہیں اور دوسری وجہ یہ تھی کہ شادی کرنے کی شادی 30 فیصد کم ہو گئی ہے۔

جان ماسٹرز اور جانسن دونوں میاں بیوی ڈاکٹر ہیں ویسے ڈاکٹر سے شادی کرنے میں یہی قباحت ہے کہ بیوی طبیعت کی خرابی کا بہانہ نہیں کرسکتی۔ بہرحال ڈاکٹروں کی لکھی کتابیں اس قدر مفید ہوتی ہیں کہ ان کا پڑھنا ہی صحت کے لیے مفید نہیں نہ پڑھنا بھی صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ ہم تو ڈاکٹر فضل الرحمان لاہور کے کلام کا نسخہ دکھا کر میڈیکل سٹور سے سر درد کی دوا لے لیتے ہیں جناب جان ماسٹرز اور محترمہ جانسن صاحبہ کی یہ دوسری شادی تھی۔ دوسری شادی کرنے میں ہمیشہ یہی مشکل رہی ہے کہ اس کے لیے بندے کا پہلے شادی شدہ ہونا ضروری ہے۔ محترمہ جانسن صاحبہ تاریخی خاتون ہیں اگرچہ تاریخ میں ان کی تاریخ سے زیادہ ان کے جغرافیہ کی تفصیل زیادہ ہے۔ دونوں میاں بیوی آپس میں کبھی نہ لڑتے یہ سمجھ نہیں آتی کہ اگر دونوں میں لڑائی ہی نہیں ہوتی تھی تو پھر وہ اتنا لکھنے کے لیے وقت کیسے نکال لیتے تھے۔ بہرحال جان ماسٹرز اپنے تحقیقی کام میں اتنے کھوئے رہتے ہیں کہ اپنی بیوی جانسن کے ساتھ یوں پیش آتے جیسے کسی اجنبی خاتون کے ساتھ پیش آرہے ہوں۔ شاید یہی ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز

تھا۔ جانسن بھی ریسرچ میں اتنی مگن رہتیں کہ ماسٹرز کہتے کہ "دوران کار اکثر وہ میرے ساتھ اتنے اچھے طریقے سے پیش آتیں کہ مجھے یقین ہو جاتا کہ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔" یاد رہے کہ یہاں دوران کار سے مراد اس دوران نہیں جب وہ کار میں ہوتے دونوں میاں بیوی کی کتابوں میں اس بات پر زور ہوتا کہ یہاں بیوی میں طلاق کی وجہ ذہنی ہم آہنگی کا نہ ہونا ہے جبکہ ان کی اپنی طلاق کی وجہ یہی ذہنی ہم آہنگی اور ملتے جلتے خیالات تھے جیسے ماسٹرز چاہتے کہ وہ صبح اٹھیں تو شریک حیات ناشتہ تیار کرکے لائے اور جانسن بھی یہ چاہتی۔

دنیا میں کوئی دو مرد ایک جیسے نہیں اور دونوں اسی بات پر خوش ہیں پھر بھی ہر ڈاکٹر چاہتا ہے کہ وہ جان ماسٹرز جیسا ہو۔ وہ اتنے بڑے آدمی ہونے کے باوجود اتنے سادہ اور نرم دل تھے کہ جانسن سے کسی نے پوچھا "آپ بیمار ہوتی ہیں تو یہ آپ کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟ کہا "بہت اچھا سلوک کرتے ہیں۔ یہ تو یوں پیش آتے ہیں جیسے ہمسائے ہوں۔" وہ ان کا بڑا احترام کرتیں کہتیں بچپن ہی سے میرے گھر والوں نے مجھے یہ سکھایا کہ بڑوں کا احترام کرو۔ اگرچہ اپنے بارے میں لکھنے میں یہ خرابی رہی ہے کہ اپنی خامی لکھو تو برا لگتا ہے' خوبی لکھو تو دوسروں کو برا لگتا ہے۔ لیکن ماسٹرز اینڈ جانسن اپنے بارے میں لکھتے رہے۔ لکھتے ہیں کہ اکثر میاں بیوی میں اس بات پر جھگڑا ہوتا ہے کہ اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو میاں کہتا ہے یہ بیوی کا قصور ہے جبکہ بیوی میاں کا نام لگاتی ہے مگر ماسٹر اینڈ جانسن سے کوئی گڑبڑ ہوتی تو ان کا اس بات پر جھگڑا ہوتا میاں کہتا کہ یہ میرا قصور ہے جب کہ بیوی کہتی میرا ہے۔ ایک صحافی نے جان ماسٹرز سے پوچھا۔ سنا ہے ہر وقت آپ کا اپنے آپ پر کنٹرول ہوتا ہے۔ کہا نہیں ہر وقت اپنے آپ پر میرا کنٹرول نہیں ہوتا کبھی بیوی بھی میرے ساتھ ہوتی ہے۔ ماسٹرز اینڈ جانسن کی کتابیں مملکت مجازی خداداد میں وہی مقام رکھتی تھیں جو مملکت خداداد میں آئین اور قانون کی کتابیں۔ شادی سے نہ بچنے اور شادی بچانے کے لیے ڈاکٹرز ان کی ہی کتابیں استعمال کرتے ہیں۔ ویسے شادی بھی عجیب چیز ہے اس کے پہلے

ماہ بندہ سوچتا ہے میں نے شادی کرنے میں اتنی دیر کیوں کی اور پھر ہر ماہ یہی سوچتا ہے کہ شادی کرنے میں اتنی جلدی کیوں کی۔ ماسٹرز اینڈ جانسن کی طلاق سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے جو ویسٹ انڈیز کے کرکٹ کوچ نے نکالا تھا۔ ایک بار ٹیم کی ناقص بیٹنگ کرنے پر وہ غصے میں آکر میچ کے فوراً بعد ٹیم کو نیٹ پر لے آئے اور خود پیڈ باندھ کر بیٹنگ کرنے چلے گئے تاکہ کھلاڑیوں کو بیٹنگ کے بارے میں بتا سکیں۔ کافی دنوں سے آؤٹ آف پریکٹس تھے کئی مرتبہ آؤٹ ہوئے تو غصے سے باہر آئے اور پیڈ اتارتے ہوئے بولے یہ وہ طریقہ ہے جس طرح تم بیٹنگ کرتے ہو آئندہ اس طرح نہ کرنا۔ ہوسکتا ہے جان ماسٹرز بھی یہی کہیں کہ یہ وہ طریقہ ہے جو تم اپنی بیویوں کے ساتھ روا رکھتے ہو اوراس کا نتیجہ طلاق ہی نکلتا ہے۔

دونوں میاں بیوی کی کتابوں کا مفہوم اگر ایک فقرے میں دیا جائے تو وہ یہ ہو گا کہ میاں بیوی خوش گوار زندگی کیسے گزار سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں ہر طریقہ بڑے طریقے سے بتایا ہے ممکن ہے دونوں نے طلاق بھی لوگوں کو یہ بتانے کے لیے لی ہو کہ میاں بیوی کے لیے خوشگوار زندگی گزارنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔



• محترمہ گلوکاری صاحبہ

ہمیں اتنا تو پتہ تھا کہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی صاحب نے اتنی شادیاں نہیں کی جتنی طلاقیں دی ہیں کہ وہ تو طلاق بھی یوں دیتے ہیں جیسے دعا دے رہے ہوں۔ ایک بار ایک دوست ان کی نئی بیوی کے لیے بازار سے تحفہ لینے گیا دکان پر بڑا رش تھا' دیر ہو گئی تو اس نے آکر سب سے پہلے پوچھا' لالہ ابھی تک بھابھی وہی ہے ناں' لیکن ہمیں یہ خیال تک نہ تھا کہ وہ ایک دن محترمہ گلوکاری کو بھی طلاق دے دیں گے۔ پچھلے دنوں میڈم نور جہاں نے یہ انکشاف کیا کہ صرف دو آدمی ہیں انہیں گلوکاری سے عشق ہے ایک میں اور ایک عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی۔ ہمارے لیے یہ بڑا انکشاف تھا کیونکہ ہم اس سے پہلے میڈم کو آدمی نہیں عورت سمجھتے تھے' بہرحال گلوکاروں میں صرف عطاء کو میڈم نے آدمی مانا جو بڑی بات ہے۔ اگرچہ عطاء کا جو گانا سن کر نکلے وہ یہ کہتا ہے یہ اللہ کی عطا ہے۔ ہم نے ہمیشہ اسے اللہ کا عطا ہی کہا' بہرحال یہ آج پتہ چلا کہ گلوکاری ان کی محبوبہ نہیں زوجہ تھی۔ حالانکہ آج بھی کسی کی محبوبہ بھاگ جاتی ہے تو وہ تھانے میں رپٹ بعد میں درج کراتا ہے' عطاء کی کیسٹیں پہلے خریدتا ہے۔ اس کی کیسٹوں کے بکنے کی تعداد سے ملک میں ناکام عاشقوں کی مردم شماری بلکہ نامردم شماری کی جاسکتی ہے۔

عطاء کو پاکستان کا بچہ بچہ بلکہ بچی بچی جانتی ہے' وہ اس قدر سچا ہے کہ جس سے پانچ منٹ کے لیے بھی عشق کیا سچا کیا' حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس کا ہر جاننے والا اس کے عشق کی ایک نئی کہانی سنائے گا اور اس سے حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ کہانی سچ بھی ہو گی۔ نوجوانی میں اپنے محلے میں پورا ہفتہ جو کرتا محلے کا مولوی جمعہ کے خطبے میں وہ سب کچھ سب کو بتا دیتا۔ جس سے یہ پتہ چلتا نہ چلتا کہ عطا کیا کرتا ہے' یہ ضرور پتہ چل جاتا کہ مولوی پورا ہفتہ کیا کرتا ہے۔ اس قدر ست ہوتا کہ

محلے میں ایک سبزی بیچنے والی تھی۔ ایک دن اس سے سبزی لینے گیا اس وقت خاتون کا بیٹا دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ جب یہ سبزی لے کر واپس آیا تو وہ لڑکا چوتھی جماعت میں تھی۔ عطاء ایک سیلف میڈ آدمی ہے' جن دنوں وہ آرا مشین چلاتا تھا لوگوں کی آرا کے مطابق ان دنوں دو ہی مشہور چیزیں تھیں عطاء اللہ کا آرا اور شمیم آراء۔ فیصل آباد میں ڈرائیونگ بھی کی' ایسا ڈرائیور تھا جو تین پہیوں پر گاڑی چلا سکتا یعنی رکشا ڈرائیور تھا۔ بہت محتاط ڈرائیونگ کرتا ایک بار اس کا ساتھی ڈرائیور بہت تیز چلا رہا تھا تو اس نے کہا اپنی گاڑی میری دعاؤں سے تیز نہ چلاؤ' تو ساتھی بولا: لالہ میں خود بڑا محتاط ہوں کیونکہ میرے دس چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' تو عطا نے کہا پھر بھی کہتے ہو کہ تم محتاط ہو۔ عطا نے اتنے حادثے سڑک پر نہیں کیے جتنے گھر میں کیے ہیں اور ہر بار محترمہ گلوکاری نے ہی اسے بچایا۔ عطاء کو محترمہ گلوکاری سے اس قدر عشق ہے کہ وہ تو عورتوں سے بھری محفل میں آنکھیں بند کرکے گاتا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی کوشش کی' چند ایک ایسی محفلوں میں ایک آنکھ بند کرنے تک آ گئے ہیں' دیکھتے ہیں ان کی دونوں آنکھیں کب بند ہوتی ہیں۔ بہرحال عطاء کی ریٹائرمنٹ کے بعد گلوکاری میں جو خلا پیدا ہو رہا ہے سنا ہے اسے پر کرنے کے لیے استاد روشنی خان نے ابھی سے کوششیں شروع کردی ہیں۔ یقین نہ آئے تو ہر صبح ان کے ہمسایوں کی سوجھی آنکھیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن لوگوں کی رائے ہے کہ ان سے تو سمال سائز کا عوامی سوٹ پر نہیں ہوتا۔ یہ خلا کیسے پر ہو سکتا ہے۔ سو ہم خدا کا شکر کرتے ہیں کہ کہیں نصرت فتح علی خان اور عابدہ پروین صاحبہ نے ریٹائر کا اعلان نہیں کیا' ورنہ ان کے جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوتا وہ کیسے پر ہوتا کیونکہ عابدہ پروین اور نصرت فتح علی خان ایسے گلوکار ہیں جو بڑی دیر کے بعد پیدا ہوتے ہیں' بندہ انہیں دیکھ لے تو اس دیر کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔

عطاء میانوالی کی آواز ہے اور اس کی آواز میں میاں والی بلکہ کئی میاں والیاں ہیں۔ وہ

تو فیض احمد فیض کی غزل گا رہا ہو تو بندے کو یقین ہو جاتا ہے فیض سرائیکی شاعر ہیں۔

عطاء میانوالی کی آواز ہے اور اس کی آواز میں میاں والی بلکہ کئی میاں والیاں ہیں۔

وہ تو فیض احمد فیض کی غزل گارہا ہو تو بندے کو یقین ہو جاتا ہے فیض احمد فیض سرائیکی شاعر ہیں۔ وہ دل لگا کر گاتا ہے یعنی پہلے دل لگاتا ہے پھر گاتا ہے' سانس بھی سر میں لیتا ہے۔ ساری رات وہ اور سر ایک دوسرے کو جگاتے رہتے ہیں۔ عطاء رات بغیر سوئے تو گزار سکتا ہے مگر بغیر جاگے نہیں' جتنی راتیں وہ جاگا ہے اتنے تو ہم دن نہیں جاگے وہ اپنے سننے کے لیے گاتا ہے یوں اس کے گلوکاری سے ریٹائر ہونے کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ فرنیک کو نکلن نے کہا' زندگی ختم کرنے کے جتنے بھی طریقے ہیں ان میں سے سب سے آسان ریٹائرمنٹ ہے۔ منور علی ملک نے عطاء پر ایک کتاب لکھی اور کہا یہ تین طرح سے پہلی کتاب ہے عطاء پر پہلی کتاب' میری پہلی کتاب اور برصغیر میں کسی گلوکار پر پہلی کتاب' واقعی پڑھنے کے بعد یہ پہلی کتاب ہی لگتی ہے۔ اس میں انہوں نے عطاء کو درد کا سفیر کہا ہے۔ سو ہو سکتا ہے عطاء نے اس سفارت سے ریٹائرمنٹ لی ہو لیکن انہوں نے یہ اعلان "پرائڈ آف پرفارمنس" ملنے کی تقریب پذیرائی میں کیا' جس سے لگتا ہے انہوں نے یہ ایوارڈ ملنے پر دلبرداشتہ ہو کر یہ قدم اٹھایا ہے' کیونکہ جب سے امجد حسین کو "پرائڈ آف پرفارمنس" ملا ہے کئی گلوکاروں نے گانا چھوڑ دیا ہے۔ ایک سے ہم نے پوچھا "کیا آپ نے اس لیے گانا چھوڑا کہ آپ کو "پرائڈ آف پرفارمنس" نہیں ملا؟" تو اس نے کہا "نہیں اس لیے گانا چھوڑ دیا ہے کہیں حکومت مجھے بھی پرائڈ آف پرفارمنس" نہ دے دے۔"